جموّں و کشمیر

میں

اُردو اَدب

(سقوط ہند سے قبل اور اُس کے بعد)

ڈاکٹر: اے۔ آر۔ بیگ

جموّں و کشمیر

میں
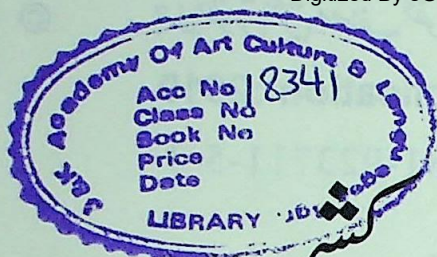
اُردو اَدب

(سقوط ہند سے قبل اور اُس کے بعد)

(تنقید و تحقیق)

ڈاکٹر: اے۔آر۔بیگ

میزان پبلشرز، سرینگر (رجسٹرڈ)

Year of Publication :2019

ISBN-978-81-923711-5-3

کتاب کا نام : جموں و کشمیر میں اُردو ادب
(سقوط ہند سے قبل اور اُس کے بعد)

مصنف : ڈاکٹر اے۔ آر۔ بیگ

سکونت : اے، 45، ''شہجار''، بڈشاہ نگر نٹی پورہ سرینگر، کشمیر

سالِ اشاعت : 2019 عیسوی

کمپیوٹر کمپوزنگ : سید ضمیر اندرابی

قیمت : -/Rs.550 لائبریری ایڈیشن -/Rs.650

ناشر : میزان پبلشرز (رجسٹرڈ)

رابطہ : 9596229671

ای۔میل : arbeigh48@gmail.com

JAMMU-O-KASHMIR

MEAN

URDU ADAB

(During Pre & Post Independance Period)

BY: DR. A. R. BEIGH

Publishers: Meezan Publishers
Opposite Fire & Emergency Services
Batmallo, Srinagar - 190009 Kashmir
Ph: 0194-2457215, Cell: 8494002212, 9419002212
Email: meezanpublishers@rediffmail.com/rediffmail.com

انتساب

میں اپنی اِس حقیر کوشش کو اہلِ کشمیر
کے نام ممنون کرتا ہوں

(ڈاکٹر اے۔آر۔ بیگ)

(سابقہ صدر شعبہ اُردو اسلامیہ کالج آف
سائینس اینڈ کامرس سرینگر کشمیر)
(گریڈ اے)

اس کتاب میں

ابتدائیہ

یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اردو زبان انسان نوازی، قومی یکجہتی اور باہمی محبت واخوت کی زبان ہے۔ سوا سو کروڑ آبادی والے ملک میں اردو زبان ہی واحد ہندو مسلم اتحاد مشترکہ تہذیب وتمدن اور صحت مند ثقافت کی ترجمان کہلانے کا استحقاق رکھتی ہے۔ اس زبان کی تعمیر وتشکیل میں کسی ایک فرد، قوم، صوبے یا ایک مخصوص گروپ کا ہاتھ نہیں۔ یہ برِ صغیر کی مشترکہ کوششوں سے صورت پزیر ہوئی ہے۔ یہ زبان عوام کی زبان ہے۔ عوام نے اِسے سینے سے لگایا اور اپنی تمناؤں اور خوابوں کا اظہار وسیلہ بنایا۔ عوام جہاں کے بھی ہوں خواہ وہ یوپی کے ہوں، دِلی کے ہوں، حیدرآباد کے ہوں یا لاہور کے ہوں یا بہار اور کشمیر کے ہوں۔ اس پر اپنا حق رکھتے ہیں۔ اہلِ کشمیر کی مادری زبان کشمیری ہے اور جموں میں ڈوگری اور لداخ میں لداخی زبان بولی جاتی ہے۔ لیکن اردو ریاست کے لوگوں کے لئے کوئی غیر یا اجنبی زبان نہیں۔ یہاں کے لوگوں نے ایک صدی سے زیادہ عرصہ سے اردو زبان کو اپنی زبان سمجھ کر برتا ہے اور اِس کی تعمیر وترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

عہدِ ماضی سے لے کر جدید دور تک سنسکرت، فارسی، کشمیری، ہندی اور اردو زبانوں میں یہاں کے تخلیقی ذہن کا اظہار ملتا ہے۔ اُردو زبان کی ملک گیر مقبولیت

کے نتیجے میں اُنیسویں صدی کے آواخر میں اِسے ریاست میں دفتری زبان کا درجہ دیا گیا۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ جدید دور میں کئی لکھنے والوں کے دِل میں کشمیر کی قدیم تہذیب وتمدن معاشرت اور ادب کے بارے میں تلاش وتحقیق کا جذبہ موجزن ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے کشمیر کے ماضی کی بازیافت کا عمل ایک باسعادت عمل ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ریاست کی خدمات کا ذکر کئے بغیر اُردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی ہے۔ ریاست جموں وکشمیر نے اردو ادب کو کئی عظیم المرتبت شاعر اور ادیب دیئے ہیں جنہوں نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے اسے توانائی، اور وسعت عطا کی ہے۔ دیا شنکر نسیمؔ، تربھون ناتھ ہجرؔ، رتن ناتھ سرشارؔ، سعادت حسن منٹوؔ، آغا حشر کاشمیریؔ، چراغ حسن حسرتؔ، علامہ اقبالؔ، چکبست، علامہ کیفیؔ کے نام اس دعویٰ کی مستند تصدیق ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ریاست جموں وکشمیر کے جدید نسل کے شعرا اور ادیب ہندوستان کے مشہور اور مستند لکھنے والوں کے دوش بدوش زباں و ادب میں منہمک ہیں اور وہ دھیرے دھیرے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہے ہیں۔ اردو کے لئے ریاست میں ایک سازگار ماحول ہے۔ نئی نسل کے لکھنے والے پورے اعتماد اور قوت کے ساتھ اردو میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کر رہے ہیں اور ملک میں تمام لکھنے والوں سے مقابلہ کرسکتے ہیں۔

یہاں اِس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ میرے اساتذہ کی ذات گرامی میرے لئے قابلِ احترام ہی نہیں بلکہ قابلِ فخر انبساط بھی ہے۔ ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کے حوالے سے میرے اُستاد جناب پروفیسر عبدالقادر سروریؔ

نے ''کشمیر میں اردو'' (تین حصے) اور عزت مآب جناب پروفیسر حامدی کاشمیری نے ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب'' لکھ کر ریاست جموں وکشمیر کے ادب، آرٹ، ثقافت اور یہاں کی تاریخ کے بعض مستور زاویوں کو کھنگالنے کی زبردست کوشش کی۔ میرے عزیز دوست مرحوم برج پریمی نے ''کشمیر کے مضامین'' اور ''جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشوونما'' جیسی کتابیں لکھ کر کشمیر کے عرفان، اس کی روشنی، اس کی حُسن، اس کی صدیوں سے تشکیل ہوتی ہوئی تہذیبی، فکری اور سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور نثر کے وسیلے سے ادبی دنیا کے وسیع حلقے تک پہنچادیا۔ حبیب کیفی نے ''کشمیر میں اردو'' لکھ کر دردمندی، خلوص اور عرق ریزی سے کشمیر کے حقیقی خدوخال کو اُبھارنے کی حتیٰ المقدور کوشش کی ہے۔

یہ کتاب ''ریاستِ جموں وکشمیر میں اُردو ادب'' (سقوط ہند سے قبل اور اس کے بعد) میرے ایک پرانے خواب کی تعبیر ہے۔ جس میں 1867 عیسوی سے دورِ حاضر تک جموں وکشمیر کے ادب، آرٹ، ثقافت اور یہاں کی تاریخ کے بہت سے نئے انکشافات، فنّی معلومات مقدور بھر محنت سے کسی مکمل نتیجے پر پہنچنے کی ایماندارانہ کوشش کی ہے۔ اس کتاب کو لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارا یہ اُردو دبستان ریاست سے باہر بھی متعارف ہو، تاکہ ریاست جموں وکشمیر کے اُردو ادیبوں کو اردو دنیا میں پزیرآئی مل سکے۔ آج کل ریاست میں اُردو والوں کی ایک بڑی جماعت پوری اردو دنیا میں اپنی اہمیت منوا چکی ہے اور اُن کے ساتھ ہی ایک اور نسل رواں دواں نظر آتی ہے۔ راقم الحروف نے تلاش وجستجو سے اِن کے ادبی کارناموں کا اظہارِ خیال مقدور

بھر محنت سے اچھی طرح چھان پھٹک کر نئے انکشافات، فنی معلومات سپردِ قارین کئے ہیں۔ حقائق معلومات کا غیر جانبدارانہ تجزیہ اور تنقیدی روّیہ کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس امر کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے کہ تنقید وتبصرہ توازن متواتر، ترتیب اعتدال بھی برقرار رہے۔ مجھے اُمید ہے یہ کتاب اسکالروں، قلم کاروں کے ساتھ ساتھ ایم، اے طلباء کے لئے تحقیق وتنقید کے حوالے سے کارآمد ثابت ہو۔

مجھے اُمید ہے آپ زیرنظر کتاب کو اپنے اپنے مزاج کے مطابق ضرور پسند فرمائیں گے اور اپنے مفید مشوروں سے خاکسار کو نوازتے رہیں گے۔ یاد رہے میں اپنے آپ کو نقاد کے بجائے ادب کا معمولی طالب علم شُمار کرتا ہوں۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اس کتاب میں خود کو اپنے اعتماد قایم رکھنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے اور مناسب وقفوں سے اس میں ترمیم واضافہ کرنے اور نئے پانیوں تک رسائی حاصل کرنے کا آروزمند بھی ہوں۔

راقمِ السطور نے حتیٰ المقدور تمام بنیادی ماخذ سے بذاتِ خود استفادہ کیا ہے اور اُن کی معنویت اور استفادہ کو ادبی تحقیق کے جدید ترین اصولوں، نظریوں اور زاویوں کو کسوٹی پر اچھی طرح چھان پھٹک کر کسی مکمل نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی ہے۔

میری تمنا ہے کہ میں اپنی حقیر تلاش وجستجو کی کیفیات کو اپنے ردِعمل کے ساتھ پیش کرتا رہوں اور کشمیر کے عرفان، اس کی روشنی، اس کے حُسن، اِس کی صدیوں سے تشکیل پائی ہوئی تہذیبی، فکری اور سماجی زندگی کے مختلف پہلو اردو نثر کے وسیلے سے دنیا کے وسیع تر حلقے تک پہنچادوں۔ میرے اردو ریسرچ پروجیکٹس زیرِ اہتمام

یونیورسٹی گرانٹس کمشن (UGC) نئی دہلی اور (ICSSR) نئی دہلی، عنقریب سارا کام منظرِ عام پر آئے گا۔

آخر میں اپنے احباب جناب پروفیسر ظہور الدین، جناب پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر خالد حسن میرٹھ یونیورسٹی میرٹھ، پروفیسر محمد زماں آزردہ، پروفیسر شہاب عنایت ملک اور پروفیسر نذیر ملک صاحب کا شکر گذار ہوں کہ میں نے کئی موقعوں پر اس موضوع کے بعض پہلوؤں پر اُن سے تفصیلی گفتگو کی اور اُن کے خیالات سے استفادہ کیا۔

〈ڈاکٹر اے، آر، بیگ〉

جموں و کشمیر کی جغرافیائی و تاریخی اہمیت

وادیٔ کشمیر اپنے مرغزاروں کی تازگی، دریاؤں اور چشموں کی روانی، گُل یاسمین کی بہاروں اور نسیم پرور گلشن سے دنیا بھر میں جنت مانی جاتی ہے۔ اس کے حسن و جمال کے جلوہ صدرنگ کی حشر سامانی تہذیب اور شعور کی صبح سے مشک عنبریں کی طرح مہک رہی ہے۔ اس حسن کی خوشبو نے زمانہ قدیم سے سیلانیوں کو برمایا ہے اور رسل و رسائل کے محدود وسائل کے باوجود یہاں آ کر گھومے اور یہاں کے فطری مناظر سے لطف اندوز ہونے میں کرۂ ارض کے سیاحوں کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ یہاں شاعر بھی آئے، افسانہ نگار بھی آئے اور مورخ بھی۔ یہ لوگ یہاں کی شادابیوں سے مسحور ہوئے اور دلوں کے چراغ جلا کر واپس چلے گئے۔

شاہان مغلیہ نے بہت سے محلات، عظیم الشان باغات رشک افزائے روضہ رضوان بنا کر آراستہ و پیراستہ کئے اور خود محو تماشا ہوئے۔ سیاحان انگریز جو تمام مغربی ممالک سے اس کی تعریف و توصیف سن کر سیر و سیاحت سے محفوظ و مسرور ہو کر اس کو جنت کشمیر کا نام بتاتے ہیں۔ کشمیر ایک سدا بہار باغ ہے۔ بادشاہوں کے لئے

عشرت افزا گلشن ہے، درویشوں کے لئے دِل کشا خلوت کدہ ہے۔ اس کے خوشنما باغ اور دِل آویز آبشار شرح و بیان سے زیادہ ہیں۔ جہاں تک نظر کام کرتی ہے سبزہ ہی سبزہ نظر آتی ہے۔

اُردو کی پہلی نثری تصنیف، ''گلدستہ کشمیر'' میں سطح کشمیر کا حال:

اردو نثر کا پہلا مربوط اور معتبر کارنامہ پنڈت ہر گوپال خستہؔ کی تصنیف تواریخ کشمیر ''گلدستہ کشمیر'' ہے۔

ہر گوپال خستہؔ نے یہ کتاب 1877 عیسوی میں مکمل کی تھی لیکن اس کی اشاعت لاہور میں 1983 عیسوی میں عمل آئی۔ ہر گوپال خستہؔ کشمیر الاصل تھے۔ ملازمت کے حوالے سے خود خستہؔ کو لاہور، بٹالہ اور شملہ میں رہنے کا موقعہ مِلا۔ جن دنوں خستہؔ لاہور میں تھے اُن کا رابطہ پنجاب کے ڈائریکٹر تعلیمات کرنل ہالرائڈ سے ہوا۔ ''گلدستہ کشمیر'' کی اشاعت میں کرنل ہالرائڈ کے تعاون کا اعتراف خستہؔ نے مذکورہ تصنیف کے اخیر میں ''خاتمہ الکتاب'' کے عنوان سے مختلف افراد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اِن الفاظ میں کہا۔

''گلدستہ کشمیر، بہ نظر فیض اثر، قدر دان اہل علم و ہنر، قدر دان، فیض رسان، سخن پرور، فاضل اجل عالم اکمل، امیر دربار، دِل جناب فضیلت مآب، لیفٹینٹ کرنل ڈبلیو ایم ہالرائڈ، ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب...... زیور طبع سے آراستہ و پیراستہ ہوئی''۔

اپنی نثری تصنیفات کے بارے میں پنڈت ہرگوپال خستہ نے ''گلدستہ کشمیر'' کے دیپاچے میں خود لکھا ہے۔

''1931 بکرمی (مطابق 1874 عیسوی میں اِس ناچیز نے ایک مختصر جغرافیہ کشمیر لکھا تھا جو کہ مطبع بہار کشمیر لکھنو میں چھپا تھا۔ اس کے نامتکفی ہونے کے باعث دِل کو یہ شوق پیدا ہوا کہ ''تواریخ کشمیر'' زبان اردو میں جو کہ فی زمانہ مروج اور زود فہیم ہے۔ بشمول جغرافیہ کشمیر جواب تک ہندوستانی زبانوں یا فارسی میں کسی نے نہیں لکھا۔ ایسا تیار کروں جس کے پڑھنے سے ناظرین کو سطح کشمیر کا حال اس طرح معلوم ہو سکے گو یا وہ کشمیر میں پھیر کر سیر کر رہے ہیں''۔

''گلدستہ کشمیر''، محض تاریخ ہی نہیں بلکہ کشمیر کی جغرافیائی تاریخ ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک منفرد تصنیف ہے۔ ہرگوپال خستہ نے ''گلدستہ کشمیر'' لکھتے ہوئے اس وقت تک دستیاب کشمیر کے تمام اہم تاریخی کتابوں، سفرناموں اور رپورٹوں سے استفادہ کیا۔ اگرچہ خستہ نے اپنے دیباچے میں اعتراف نہیں کیا ہے۔ لیکن گلدستہ کشمیر میں فریڈرک ڈریو (Fredric Dreu) کی کتاب (The Jammu & Kashmir Terretorial) مطبوعہ 1857 عیسوی میں جموں وکشمیر کی جغرافیہ، آب و ہوا، کوہ و بیابان، جھیلوں اور چشموں سے لے کر ریاست کی مختلف قوموں اور ان کے رسم ورواج، تہواروں اور اہلِ کشمیر کے مزاج، فطرت اور خدوخال

کے بارے میں جو تفصیلات بیان کی ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ خستہ نے ان سے خوب استفادہ کیا ہے۔

آب وہوا اِس وادیٔ کشمیر کی از بس تروتازہ، صحت بخش اور راحت افزاء ہے۔ خستہ نے اپنی اس کتاب ''تواریخ کشمیر'' میں اس کا ذکر اس طرح پیش کیا ہے۔ چنانچہ ''جو جو سیاحان نامی و محققان گرامی یہاں آئے۔ سب نے شفق اللفظ اس کی آب وہوا اور موسم و چشمہ ہائے پُر بہار وانہار و مرغزار بے خار، باغات و میوہ جات، گونا گوں و سبز ہائے نادرو بوقلموں کی تعریف کی ہے''۔ [۱]

اب تک کی تحقیق کے مطابق نثر نگاری کا باضابطہ اور باوقار آغاز ہرگوپال خستہ کی نثری تصنیفات سے ہوتا ہے۔ خستہ کی تصنیف ریاست جموں و کشمیر میں اردو کے آغاز وارتقا کی اہم کڑی ہے جسے کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

مضافات کشمیر :

مضافات کشمیر سے مُراد اُن مقامات کی ہے جو متعلق کشمیر ہے۔ کشتواڑ، بھدوارہ، پونچھ، لداخ، گلگت، اسکردو، دراس، کرگل، حصورہ اور چلاس۔

''1947 عیسوی سے پہلے ریاست صوبہ کشمیر، صوبہ جموں، جاگیر پونچھ گلگت (بشمول ہنزا اور نگر) اور بلتستان، لداخ کے پہاڑی علاقوں پر مشتمل تھی''۔ [۲]

---

[۱] تواریخ کشمیر: پنڈت ہرگوپال خستہ صفحہ ۲۳، شیخ غلام احمد بک سیلرز مائسمہ بازار سرینگر ۱۹۸۶۔

[۲]: "Two Nations & Kashmir" Lord Bird Wood London , Robert Hall Ltd. page 21 "-

وادئ گلپوش کے باشندے:

جی، ایم ڈی صوفی اپنی کتاب Kashmir میں لکھتے ہیں۔

''کشمیری زبان میں کشمیر کو ''کشیر'' اور اِس کے باشندوں کو ''کاشُر'' کہا جاتا ہے، نیز کشمیری زبان ''کاشُر'' ہی کہلائی جاتی ہے''۔ [1]

وادئ کشمیر کے باشندے اپنی شکل وشبہات، ساخت اور رنگ وروپ کے اعتبار سے ریاست جموں وکشمیر بلکہ ہندوستان میں ممیّز ہیں۔ ان کا لباس، رسم ورواج اور عادات دیگر مقامات سے مختلف ہیں۔ کشمیر کی آبادی کا بہت بڑا حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ کشمیری برہمن جو پنڈت کہلاتے ہیں، کشمیر کے سماجی اور سیاسی زندگی میں ایک اہم حصہ رکھتے ہیں۔ یہ ایک ترقی پسند گروہ ہے جس میں نئے اور مفید تصورات کا خیر مقدم کرنے کا رجحان ہے۔ قدیم زمانے میں اُنہوں نے سنسکرت زبان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

پنڈت جواہر لعل نہرو کی نظر میں وادی کشمیر:

وادئ کشمیر کے دریاؤں، وادیوں اور جھیلوں کا حُسن رنگینی اُس حسینہ کے جمال کی طرح ہے جو انسانی خواہشات معّرا سرتاپا محصوم ہو۔

پنڈت جواہر لعل نہرو اپنے تاثرات کا اظہار یوں پیش کرتے ہیں۔

''اِس حسین وادی کے بادلوں کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ

1: Kashmir page no. 1 جی۔ایم۔ڈی۔صوفی۔ Light and Life Publishers New Delhi 1974

کسی پہاڑ کی چوٹی کو آغوش میں لینے کے لئے بے تاب ہیں۔ یا
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بادل کے ٹکڑے چوری چھپے بچوں کی طرح
کھیلنے کے لئے نیچے آرہے ہیں۔ میں نے ان لمحہ لمحہ بدلتے ہوئے
نظاروں کو دیکھا اور بعض اوقات تو ایسا محسوس کیا کہ ان کے حسن
کی شدت نے میرے ہوش وحواس پر قبضہ کرلیا۔ جب میں نے
ان نظاروں کو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا گویا میں ایک خواب دیکھ
رہا ہوں۔ کشمیر کا حسن، حُسن محبوب کی طرح ہے، جو صرف خواب
کے دھندلکے میں نظر آتا ہے اور بیداری میں گم ہو جاتا ہے"۔ [1]

فرانسیس ینگ ہسبنڈ کے تاثرات:

فرانسیس ینگ ہسبنڈ وادیٔ گلپوش میں ریذیڈنٹ کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ اکیس برس وادیٔ کشمیر میں رہے۔ انہوں نے اپنے تاثرات اپنی کتاب کشمیر (Kashmir) میں قلمبند کئے ہیں۔ یہاں کی زندگی، یہاں کی آب ہوا، جھیلوں اور حسن وفطرت کے جلوؤں کو بیان کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ سوئزلینڈ میں کشمیر کی طرح برف سے
لدے ہوئے پہاڑوں کا سلسلہ کہاں ہے، یہاں کے برفیلے پہاڑ
دنیا کے کسی اور خطے میں موجود نہیں ہیں۔ [2]

---

[1] ماخذاز: آج کل (کشمیر نمبر) نومبر ۱۹۷۵ء (کشمیر کی جھلکیاں)۔

[2] described by Sir Young Husband, First Edition, Sept. reprinted in Great Britain R&R "Kashmir"ClarkLtd., Eden Burgh

بیرن چارلس ہیوگل کا نظریہ:

دوسرے سیاحوں کی طرح بیرن چارلس ہیوگل کا دِل بھی وادیٔ گلپوش کے دلفریب مناظر دیکھ کر مچل اُٹھتا ہے اور اپنے تمام جغرافیائی اور تواریخی باریک بینی کے ساتھ ان مقامات کی تفصیل پیش کرتا ہے جہاں جہاں وہ گھوما ہے۔

وہ اس خطّہ ارضی پر اس قدر فریفتہ ہو جاتا ہے کہ پروردگار کی بارگاہ عالیہ میں اپنا شکرانہ ادا کرتا ہے۔ جس نے اسے اس جگہ پہنچنے کی سعادت بخشی ہے؟ یہاں اس سرزمین پر جو بعض لوگوں کے نزدیک دنیا کا خوبصورت ترین مقام تصور کیا جاتا ہے۔ ہیوگل اپنے قیام کے دوران جہاں وہ کشمیر کے حسن و جمال پر اپنی خوشی اور مسرت کا اظہار کرتا ہے وہاں وہ کشمیریوں کی زبوں حالی کا تذکرہ کئے بغیر نہیں رہ پاتا۔ وہ لکھتا ہے کہ ملک اتنا محکوم ہے کہ شالوں کا کاروبار کرنے والے چند افراد کو چھوڑ کر عام لوگوں کا حال بھکاریوں سے بہتر نہیں تھا۔ [1]

برنیر کا سفرنامہ:

اورنگ زیب کشمیر کی سیاحت کے لئے دہلی سے 6 دسمبر 1664 عیسوی کو روانہ ہوا۔ برنیر اُس شاہی قافلے کے ہمراہ تھا۔ یہ قافلہ 25 فروری 1665 عیسوی

---

[1]: Kashmir & the Punjab Page no. 106-107 Baron Charles Hugel 1972, Light and Life publishers

کو لاہور پہنچا اور یہاں کچھ عرصہ قیام کیا۔ اس کا قیام اس قافلے کے ساتھ چند ماہ رہا۔ وہ 1668 عیسوی کو فرانس واپس لوٹا جہاں اپنی کتاب 1669 عیسوی میں مکمل کرلی۔ برنیؔر کا یہ سفر نامہ اس لئے بھی اہم ہے کہ یہ کسی شاہی حکم کے ماتحت نہیں لکھا گیا۔ اس سفرنامے کا مقصد نہ ذاتی شہرت حاصل کرنا تھا نہ مغل شہنشاہ کی خوشنودی حاصل کرنا۔ یہ برنیؔر کے اپنے اندر کے سچے سیاح کی لگن تھی جو وہ مختلف مقامات کی سیر کے بعد اِن کے تاثرات قلمبند کرتا تھا۔ ان بیانات کے خلوص میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ یہ سفر نامہ ایک غیر ملکی نے لکھا ہے۔ اس کے سوچنے کا ڈھنگ مغربی ہے۔ وہ مغرب کے معیار سے یہاں کی روایات اور یہاں کی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ کشمیر آنے کے راستوں اور گزرگاہوں کا ذکر کرتا ہے اور اس عہد کے کشمیر کی اقتصادی اور سماجی زندگی پر تبصرہ کرتا ہے۔ وہ یہاں کے حسن لازوال کی حشر سامانیوں کا ذکر کرتے ہوئے شاعر بنتا ہے اور یہاں کی صناعی ہنرمندی اور فنکارانہ باریکی کو خلوص کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

کشمیر میں برنیؔر کا قیام تقریباً تین ماہ سے زیادہ رہا۔ یہاں پہنچ کر وہ صرف معالج کی حیثیت سے شاہی مریضوں کا علاج و معالجہ نہیں کرتا بلکہ وہ کھلی آنکھ سے قدرت کے جلوؤں کو دیکھتا ہے اور شاعر بنتا ہے۔ وہ کشمیریوں کے رہن سہن، ان کے اخلاق، ان کے آداب زندگی کی تصویر کھینچتا ہے۔ اپنے مختصر سے قیام کے دوران اس نے نہ صرف لوگوں کے بارے میں اپنی رائے مرتب کی بلکہ یہاں کی تواریخ اور یہاں کے جغرافیہ کے بارے میں بھی معلومات حاصل کیں اور اپنے مکاتب میں اس
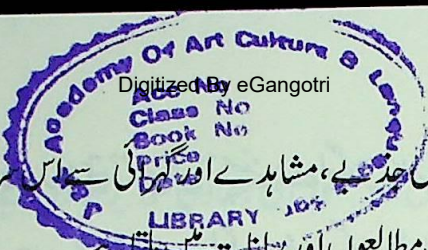
کا اظہار کیا۔ برنیر نے جس جذبے، مشاہدے اور گہرائی سے اس سرزمین کو دیکھا تھا اس کا ثبوت اس کے مختلف مطالعوں اور بیانات میں ملتا ہے۔

بہر حال برنیر کا یہ سفر نامہ خاصا دلچسپ ہے اور کشمیر کی تاریخ، یہاں کا جغرافیہ یہاں کے باشندوں، ان کے رہن سہن، ان کے آداب زندگی، یہاں کی صناعی اور کاریگری کے کئی دلچسپ رُخ بے نقاب کرتا ہے۔

جموں و کشمیر کو اپنے قدرتی حسن کی وجہ سے دنیا بھر میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ اس کا اصل نقشہ جموں (پنجاب کی سرحدوں سے ملتا ہے)۔ کشمیر کا (ایک حصہ پاکستان کے قبضے میں ہے اور اس کے ساتھ گلگت کا بھی ایک وسیع علاقہ آتا ہے)۔ اور لداخ پر محیط ہے۔ اکتوبر 1947 عیسوی میں موجودہ جموں و کشمیر الحاق کافی سیاسی اتھل پتھل کے بعد ہندوستان کے ساتھ ہوا اور اس کا کچھ حصہ پاکستان کے قبضے میں چلا گیا۔ اس طرح اس کا رقبہ سمٹ کر صرف 135154 مربع کلو میٹر ہی رہا۔ ایک ہی ریاست ہوتے ہوئے بھی جموں و کشمیر کے تینوں خطوں کا جغرافیہ اور کلچر ایک دوسرے سے الگ الگ ہے۔ عام طور پر جموں کو مندروں کا شہر، کشمیر کو اولیاؤں کی سرزمین اور لداخ کو لاماؤں کا دیش کہا جاتا ہے۔ کشمیر کا کچھ حصہ جو پہاڑی ہے اور کچھ ہموار، یہاں کے جنگل، برف پوش چوٹیاں، سرسبز ہرے بھرے میدان، پانی سے بھرے جھیل، ندی نالے اور دیگر مناظر دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ زیادہ تر آبادی مسلمانوں کی ہے۔ عام زبان کشمیری ہے۔ گرمی زیادہ سے زیادہ 34 ڈگری تک ہو جاتی ہے اور کم سے کم درجہ حرارت 15 ڈگری منفی

تک پہنچ جاتا ہے۔ روایتی ''پیرہن'' پہننے سے لوگوں کا لباس کچھ الگ تھلگ سا لگتا
ہے۔ شکل وصورت کے اعتبار سے لوگ سفید، گورے اور گلابی رنگت کے ہوتے
ہیں۔ پاکستانی کشمیر بھی ایک پہاڑی خطہ ہے جس کی ٹوپوگرافی برابر ہندوستانی کشمیر
سے ملتی جلتی ہے۔ وہاں بھی زیادہ تر کشمیری زبان بولی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ
گوجری، پہاڑی، زبانیں بھی وہاں رائج ہیں۔ مظفرآباد اس کی راجدھانی ہے۔

ہانجی طبقہ:

ہانجی کشمیر کا مشہور فرقہ ہے۔ محنتی اور سلیقے والے لوگ ہیں، جو اپنے سجے
سجائے ہوئے شکاروں میں سیاحوں اور دیگر مسافروں کو دریا کے پار پہنچانے کے فن
کی مہارت رکھتے ہیں اور اپنے ہاؤس بوٹوں میں مہمانوں کی خاطر تواضع کے لئے
مشہور ہیں۔ ان کے ہاؤس بوٹ جو جہلم اور جھیل ڈل میں ایک سرے سے دوسرے
سرے میں پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کشمیر کی خصوصیات ہیں۔ ان میں سیاح اور
مسافر قیام کرتے ہیں۔ ان کے کھانے پینے کا بھی ہانجی بڑے سلیقے سے اہتمام کرتے
ہیں۔ ان کے ڈونگے خود ان کے رہنے کے لئے ہوتے ہیں اور ناؤ سامان پہنچانے
کے کام آتے ہیں۔

خطہ جموں:

جموں کا بیشتر حصہ پہاڑی ہے۔ مگر زمین بہت ہی زرخیز ہے۔ پونچھ اور
راجوری علاقوں کی آب و ہوا کشمیر سے ملتی جلتی ہے۔ باقی جگہوں مثلاً جموں اور
ادھمپور میں ملک کے دیگر علاقوں کی جیسی گرمی رہتی ہے۔ عام زبان پنجابی اور ڈوگری

ہے۔ یہاں ہندو، مسلمانوں اور سکھوں کی مساوی طور پر آبادی ہے۔ ڈوگری لوگ اپنے تنگ پاجامے کُرتے اور پگڑی سے اپنی الگ پہچان بنا لیتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ لوگ کلچر اور شکل صورت سے پنجابیوں سے ملتے جلتے ہیں۔

راجوری اور پونچھ کی جغرافیائی اہمیت:

پیر پنجال خطہ قدیم زمانے سے جغرافیائی حالات کے پیش نظر کشمیر کا قدرتی محافظ اور نگہبان مانا جاتا ہے اور اس کی ڈھلوان اور وادیوں پر محیط علاقہ راجوری پونچھ قدرتی حسن، دلکش مناظر کے لئے بھی مشہور ہے۔ برف کی دستاریں سجائے ہوئے بلند و بالا پہاڑی سلسلے، جہاں ذوقِ نظر کی تسکین کا باعث ہیں وہیں پہاڑوں کی کوکھ سے جنم لینے والے ندی نالے، جھرنے، جھیلیں اور آبشاریں اس علاقے کو زیبائش عطا کرتی ہیں۔ اُدھر پہاڑوں کی آغوش میں سجی سنوری وادیاں آزاد طبیعت، بے ساختہ، بانکے اور بہادر عوام کی بستیاں ان کے رنگ رنگیلے اور موج میلے منفرد تہذیبی اور ثقافتی ورثہ اس خطہ کی عظمت کو دوبالا کرتا ہے اور اس کی پہچان اور شناخت کی علامت ہے۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں علاقہ پونچھ بھی انگریز سیاحوں کی آمد و رفت کا مرکز رہا تھا کیونکہ جب سرینگر کو ابھی سڑک کے ذریعے بیرونِ ملک سے نہیں جوڑا گیا تھا۔ اس زمانے میں انگریز سیاح مغل روڑ کے راستے پیدل پنجاب سے کشمیر جایا کرتے تھے۔ مغل روڑ کا ایک بڑا حصہ علاقہ پونچھ سے بھی گزرتا ہے۔ اس لئے انگریز سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں پونچھ کا ذکر اکثر کیا ہے جس سے اس وقت

کے حالات اور طرزِ زندگی کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔

1947 عیسوی کے واقعات کے بعد خطہ پیر پنجال کے دامن میں واقع علاقہ پونچھ اور راجوری تقریباً دو حصوں میں بٹ گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ زمین کے ساتھ ساتھ گھر، کنبے اور رشتے بھی بٹ گئے۔ ماں اس طرف ہے تو بیٹا اس پار، زمین اس طرف ہے تو مکان اس طرف، پانی اس طرف ہے تو پیاس اس طرف حد متارکہ کے باعث یہاں کے عوام نہایت متاثر ہوئے اور ایسے مسائل اور مصائب پیدا ہوئے کہ وہ پسماندگی اور ناخواندگی کی دلدل میں دھنستے چلے گئے جس کی وجوہات علاقے کا اہم مرکزوں سے کٹ جانا، مخصوص جغرافیائی حالات،، سڑکوں اور پلوں، بجلی اور پانی جیسی بنیادی سہولتوں کی کمی اور سرحد پر نت نئی فائرنگ اور گولہ باری تو کبھی کبھار ہوتی رہتی ہے۔ اگر ایک طرف مغل روڑ اور دوسری طرف راوٗلاکوٹ سڑک آمد ورفت کے لئے کھل جائیں تو اُمید کی جاسکتی ہے کہ علاقہ پونچھ اور راجوری ایک بار پھر اپنا کھویا ہوا تشخص واپس حاصل کرے گا اور اپنی شناخت اور پہچان بنائے گا جن کا ذکر تاریخوں میں آیا ہے اور انگریز سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں کیا ہے۔

ریاست کا تیسرا اہم جغرافیائی خطہ "لداخ"

اس ریاست کا تیسرا خطہ لداخ جغرافیہ کلچر کے اعتبار سے بالکل منفرد ہے۔ رقبے کے لحاظ سے 45 ہزار مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ صرف دو ضلعوں کرگل اور لیہہ پر مشتمل ہے۔ پورا علاقہ ننگے ریتیلے پہاڑوں سے گھیرا ہوا ہے۔ جہاں کہیں کہیں سال بھر برف جم کر رہنے سے گلیشیر بھی بن جاتے ہیں۔ سائیبریا کے بعد وجہ حرارت

لداخ کے ''دراس'' علاقے میں منفی 20 ڈگری تک ہو جاتا ہے۔ شکل وصورت اور کلچر سے وہ تبّتی اور چینی لوگ لگتے ہیں۔ ان کا روایتی لباس ''گونچہ'' کہلاتا ہے۔ عام لوگ بودھ دھرم کے ماننے والے ہیں اور کچھ آبادی مسلمانوں کی بھی ہے۔ سطح سمندر سے 5322 کلومیٹر کی اونچائی پر واقع ہونے کی وجہ سے 30 فیصد آکسیجن کی کمی یہاں رہتی ہے۔ عام لوگ لداخی زبان بولتے ہیں۔ اس کے علاوہ کرگل والوں کی زبان بلتی ہے جو نوبرا (لداخ) اور اسکردو (پاکستان) میں بھی بولی جاتی ہے۔

لداخ کرۂ ارض کا ایک پرسکون مقام ہے۔ لاماؤں اور گھمپاؤں کی سرزمین کو ہم دوسرے الفاظ میں دلفریب پہاڑوں کی ایک جنت کہہ کر پکارتے ہیں۔ ہردیو سنگھ لداخ یعنی گھمپاؤں کے دیش کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''یہاں تقریباً ہر گاؤں میں گھمپا ہے۔ گھمپا کا مطلب ہے تنہائی کی جگہ، جہاں بیٹھ کر عبادت کی جاتی ہے۔ لداخ میں 16 بڑی گھمپائیں ہیں جن میں آرٹ کا بیش قیمت خزانہ محفوظ رکھا گیا ہے۔ ان کی دیواروں پر مصوری کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ ان تمام گھمپاؤں میں سالانہ میلے لگتے ہیں اور ان میلوں میں شرکت کرنے سے لداخ کے پورے کلچر کو دیکھا جا سکتا ہے''۔[1]

مجموعی طور پر ریاست جموں وکشمیر کے یہ تینوں خطے الگ الگ جغرافیہ اور کلچر ہونے کے اعتبار سے اپنی اپنی انفرادیت اور اہمیت رکھتے ہیں۔ جہاں ہندو، مسلم،

---

[1]: ماہنامہ ''تعمیر'' جلد نمبر ۲۱ ص ۱۰۰، شعبہ مطبوعات، محکمہ اطلاعات، جموں وکشمیر مارچ ۱۹۸۵۔

سِکھ ،عیسائی اور بودھ غرض کہ مختلف ذاتوں ،نسلوں اور مذہبوں کے لوگ بستے ہیں۔
تینوں خطے مختلف قدرتی نعمتوں سے مالا مال ہیں۔اس ریاست کی راجدھانی مئی
سے اکتوبر تک سرینگر ہوتی ہے اور نومبر سے اپریل تک جموں ہماری راجدھانی ہوتی
ہے۔اس ریاست سے باہر عام طور پر تینوں خطوں کو ''کشمیر'' کے ہی نام سے جانا جاتا
ہے۔حالانکہ بہت پہلے کشمیر اصل میں ایک وسیع ملک کا نام تھا اور بڑی بڑی یورپی
کتابوں میں اِس کا ذکر Casmir لفظ سے کیا گیا ہے۔ مگر ہم
اب Kashmir لکھتے ہیں۔عالمی سطح کے بڑے بڑے شاعروں نے مختلف زبانوں
میں کشمیر کے متعلق گیت گائے ہیں۔کشمیر عہد ماضی سے علوم وفنون کا مرکز رہا ہے۔
برسوں پہلے یہ بودھ دھرم اور شیوازم کا مرکز بھی رہا ہے۔ مقامی لٹریچر اردو اور
انگریزی ، عربی ، فارسی و ہندی کے علاوہ ہمارے پاس سنسکرت کی بھی ایک عظیم
روایت موجود ہے اور کھمندر ، کلہن ، کالیداس (شکنتلا) کے خالق کا اصل وطن لار
گاندربل بتایا جاتا ہے۔ (اور کلہن ترنگنی کا خالق پری ہاس پور کشمیر) جیسے سنسکرت
عالموں کو اس زرخیز مٹی نے جنم دیدیا۔ اِسی طرح لل دیداور شیخ نورالدین نورانیؒ جیسے
کشمیری صوفی بزرگ یہاں پیدا ہوئے۔ بیرنؔ چارلس ہیوگل، ینگ ہسبنڈ،
والٹرلارنسؔ ، ٹنڈول بسکو، تھامس مورؔ جیسے عظیم دانشوروں نے کشمیر کے متعلق اپنی
شاہکار کتابیں لکھی ہیں۔

ابوالفضل نے کشمیر کی دلفریبی کا ذکر بہت ہی انشا پردازانہ انداز میں کی ہے
اور لکھتا ہے کہ یہ ایک دلکش ملک ہے۔اس کو ایک باغ ہمیشہ بہار لکھنا مناسب ہے۔

اس کو نازک مزاجوں کی عشرت گاہ اور گوشہ نشینوں کا خلوت کدہ کہنا بھی صحیح ہے۔ اس کے چشمے بہت ہی خوشگوار اور ہوا بہت ہی فرحت بخش ہے۔ بارش اور برف باری میں یہ ایران وتوران اور موسم برسات میں ہندوستان سے مشابہ ہے۔ یہاں کے پھولوں کا شمار کرنا اندازہ سے باہر ہے۔ یہاں کے بہار وخزاں دونوں موسم بے حد دلفریب ہیں۔

عرفیؔ نے دِل کھول کر کشمیر کی تعریف کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کشمیر آکر ایک سوختہ جان شخص بھی تروتازہ ہوجاتا ہے۔ اس کی ہوا میں کچھ ایسی لطافت ہے کہ نسیم سحری معلوم ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت کشمیر کے دروازہ پر آگئی ہے۔ یہاں کے سبزے، چشمے، لالہ گل کی شرح کرنا آسان نہیں۔ یہاں لالہ کی پیداوار ہے کہ پتھر اور تیشے کے منہ سے بھی لالے ہی نکلتے ہیں۔ کشمیر کا جمال دلہن کی طرح ہے۔

ہر سوختہ کہ بہ کشمیر درآید
گر مرغ کباب است کہ بابال وپر آمد

وادیٔ کشمیر کی یہ سرزمین شاعر کا تخیل اور مغنّی کا ساز ہے۔ یہ حسن پرستوں کی عبادت گاہ ہے۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ اس جنت پر کشش کے بارے میں لکھتے ہیں۔

تنم گلے زخیابان جنت کشمیر
دل از حریم حجاز و نواز شیراز است

''میرا جسم جنت کشمیر کے باغوں سے ایک پھول ہے

میرا دِل حجاز کے کعبے سے اور میرے گیت شیراز کے ہیں''

اس سرزمین کی صبحوں اور شاموں پر بنارس کی صبحیں اور اودھ کی شامیں قربان ہیں۔ یہ وادیٔ کشپ رشیؔ کی تپسیا ہے۔ یہ للؔ دید اور شیخ العالمؒ کا عرفان ہے۔ یہاں حبہ خاتونؔ، رسول میرؔ، پرمانندؔ اور مہجورؔ کے نغمے گونجتے ہیں جن میں چنار کے شیتل سایوں کی سانسیں مہکتی ہیں۔ یہاں عطر بیز ہواؤں کا مسکن ہے جو وُلر، مانسبل اور کونسر ناگ کے پانیوں سے سرسراتی ہوئی اٹھتی ہیں۔ یہاں کی فضاؤں میں امرناتھ کا تقدس اور حضرت بل کا نور ہے۔ یہ تخت سلیمان، ہاری پربت اور کوہ ماران، خانقاہ شاہ ہمدان اور کالی شری کا مسکن ہے۔ یہ برنیر ینگ ہسبنڈ، سٹاین، بسکو اور ایسے ہی کتنے عاشقوں کا محبوب ہے۔ یہ جواہر لال، اقبال، چکبست اور سعادت حسن منٹو کا عشق ہے۔ یہ فنکاروں، شاعروں، عابدوں، پرہیز گاروں اور حسن دِل و دماغ رکھنے والوں کا وطن ہے۔ یہ جموں اور لداخ کا دِل ہے۔

غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں لداخ:

یورپ کے سیاحوں نے لداخ میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔ انہوں نے لداخ کا چپہ چپہ چھانا۔ برفانی چوٹیاں سرکیں۔ گہری جھیلوں کی تہہ معلوم کی۔ گلیشیئروں پر راتیں گزاریں۔ تمدن، ثقافت اور تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا۔ کئی سیاحوں نے سفر کے دوران اپنی جانیں گنوائیں۔ برطانوی سیاح گنپت

(Magic Ladakh) میں اپنے تاثرات ان الفاظ میں اظہار کئے ہیں۔

''عموماً برفانی چوٹیاں خصوصاً لداخ میرے لئے بے پناہ کشش رکھتا ہے''۔

سی۔ای ٹنڈل بسکو نے اپنی کتاب Kashmir in sunlight and shadow میں لکھتا ہے۔

''خانقاہوں اور لاموں کے اس عجیب و غریب ملک سے متعلق تاثرات بیان کرنا مشکل ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان تصّورات اور خیالات سے ماورا ایک نئی دنیا میں آیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اپنے بدن کی چٹکی لے کر دیکھوں کہ آیا جاگا ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں''۔

پنڈت جواہر لعل نہرو کے تاثرات:

پنڈت جی نے 1916 عیسوی میں کشمیر کے پہاڑوں میں چند ہفتے گذارے تھے۔ زوجیلا کی چوٹی سے لداخ کے ننگے پہاڑوں کو دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ اپنی سوانح حیات میں وہ لکھتے ہیں:

''ہاں فقط ننگی چٹانیں، برف اور یخ تھا۔ کہیں کہیں دِل آویز پھول کھلے تھے۔ تاہم مجھے قدرت کے ان ویران اور ننگے گھاروں میں ایک عجیب اطمینان ملا اور میں نے ایک بھرپور طاقت اور طمانیت محسوس کی''۔

ریورنڈ ہیبر (Rev. Heber) لیہہ کی عیسائی مشنری سے وابستہ تھے۔ وہ

لداخ میں بارہ سال رہے۔ لداخ کے رسم و رواج ان کے لئے ایک معمہ تھے۔
موصوف اپنی کتاب (Himalayan Tibet) میں لکھتے ہیں۔

''ہم یقیناً ایک عجیب و غریب سرزمین پر آئے ہیں۔ جہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ جہاں اُلٹی گنگا بہتی ہے۔ ہمارے نظریے میں جو اصول درست ہیں وہاں اُن کا اُلٹ ہیں''۔

اے۔وی۔وارڈ اپنی کتاب (The Tourists and sports man's guide to Kashmir & Ladakh) میں رقم طراز ہیں۔

''لداخ کے ننگے پہاڑوں اور میدانوں میں آخر کونسی کشش ہے کہ ہم کشمیر کے ہریالے مرغزاروں سے ان بنجر، بانجھ اور اوسر علاقوں میں گھومنے جاتے ہیں؟ لیکن پھر بھی جاتے ہیں اور بار بار جاتے ہیں''۔

تاریخی حالات:

وادیٔ کشمیر جغرافیائی اور تمدنی لحاظ سے ایشاء کا دِل ہے۔ وادیٔ کشمیر [illegible]
ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ ایک بلند مقام حاصل رہا ہے۔ ابھی ہندوستانی تمدّ[illegible]
نے اپنی آنکھیں کھولی ہی تھیں کہ کشمیر علم اور تہذیب کا سرچشمہ بن چکا تھا۔ بعض
مورخین کے مطابق پانچ ہزار سال قبل مسیح سے کشمیر کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ پنڈت
کلہن کی تاریخ ''راج ترنگنی'' جو 1149 عیسوی میں لکھی گئی، ہندوستان کے تار[illegible]
ادب میں سب سے پہلے تصنیف ہے۔ ہندوستان کے قدیم ادب میں یہ واحد کارنا[illegible]

ہے جس میں کشمیر کی تواریخ کے مختلف ادوار کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

والٹر لارنس اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''اس کتاب کو ساتویں صدی عیسوی کے مابعد ایک معتبر یاداشت تسلیم کیا جاسکتا ہے''۔ [1]

وادی کشمیر قدیم روایتوں کی روشنی میں:

روایت کے مطابق کشمیر ماقبل تاریخ عہد میں ایک جھیل تھی، جس کا نام ''ستی سر'' تھا۔ ساتویں منو کے زمانے میں یہاں جل دیو نے بڑی تباہی مچادی۔ کشپ جو سارے گاؤں کا سردار تھا، اس نے یہ بات اپنے بیٹے نیل ناگ سے سنی کشپ اُس وقت شمالی ہندوستان میں تھا۔ اس نے بدکار کو سزا دینے کی ٹھان لی۔ وہ برہما کے پاس جاکر طالب اعانت ہوا۔ اس کی التجا قبول ہوگئی۔ برہما کے حکم سے سارے دیوتا آگئے اور کونسرناگ کی اونچی چوٹیوں پر مورچے باندھے کھڑے رہے۔ جل دیو جھیل سے نکلنے پر راضی ہوا۔ ویشنو نے اپنے بھائی بھلدر کو جھیل خشک کرنے کے لئے کہا۔ اس نے پہاڑوں میں سوراخ بنایا۔ پانی خارج ہوگیا تو دیو بھی مارا گیا۔ کشپ نے اس کے بعد کشمیر میں رہنا شروع کیا۔ اس کی بہت سی بیویاں تھیں جن میں بعض ناگاؤں قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں اور بعض پشاچوں قبیلے سے۔ ناگاؤں کے ساتھ دیوتا بھی یہاں بس گئے اور بہت سی دیویاں یہاں ندی نالوں کی شکل میں آباد ہوگئیں۔ جب پانی نکل گیا تو راکشس دیو نے دھواں پیدا کر کے اپنے آپ کو

---

[1] Walter Lawrence , 1967 page no. 180 ، کیسر پبلشرز ریگی ڈنسی روڈ سرینگر

اس سرزمین میں چھپانا چاہا۔ تب دیوی شاریکا مینا کے روپ میں جسے کشمیری زبان میں ''ہٰأر'' کہتے ہیں اپنی چونچ سے پہاڑ اُٹھا کر لائی اور راکشس پر ڈال دیا۔ راکشس اس کے نیچے دب کر رہ گیا۔ یہ پہاڑی ''ہاری پربت'' کہلاتا ہے۔

راج ترنگنی میں درج ہے کہ اس جھیل نما وادی میں ایک بہت بڑا راکشس (دیو) رہتا تھا، جسے پرجاپتی کشپ نے برہما وشنو اور شیو دیوتاؤں کی مدد سے مرواڈالا اور جھیل کا پانی خارج کر کے اس وادیٔ کشمیر کے نام سے آباد کیا۔ [1]

ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی کا نظریہ:

ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے کشپ کے قصے کچھ مفصل انداز سے بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر صوفی کے مطابق برہما کا پوتا کشپ رشی جنوبی ہند سے جالندھر (پنجاب) آیا تو اُسے معلوم ہوا کہ جل دیو اور اس کے ساتھ جنوں، بھوتوں نے کشمیر اور مغربی پنجاب کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ علاقے کو جل دیو اور اس کے ساتھیوں کی شرارتوں اور تخریب کاریوں سے پاک کرنے کے لئے کشپ عبادت اور دعا میں مصروف ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں ہندو تثلیت (برہما، وشنو اور شیو) اس کی مدد کے لئے حاضر ہو جاتے ہیں۔ انہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ اس سے پہلے بھی جل دیو کو ہلاک کرنے کیلئے رق رعد کے دیوتا (اندرا) اور اس کے ساتھیوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں مگر وہ بھی اِسے ہلاک کرنے میں ناکام رہے، کیونکہ جل دیو پانی میں چھپ کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

---

[1] ''راج ترنگنی''، پنڈت کلہن، لائٹ اینڈ لائف پبلشرز، مترجم ٹھاکر اچھر چند شاہپور، 1969

’’چنانچہ ویشنوسور کا روپ دھار کر اپنی دم سے بارہ مولہ کے مقام
پر پہاڑ کاٹ دیتا ہے اور وادی (جھیل ستی سر) کا تمام پانی نکلتا
ہے۔ چنانچہ پانی کے اخراج کے بعد دیو اور دیویاں جل دیو کو
ہلاک کر دیتی ہیں اور اس کے بعد یہاں انسانی زندگی کا آغاز
ہو جاتا ہے۔ [1]

شیو دھرم اور قدیم راجاؤں کا دور:

کشمیر کی قدیم کتاب ’’نیل مت پران‘‘ میں یہ بات درج ہے کہ یہاں کے ہندوؤں نے بھی مہاتما بدھ کو ویشنو کا اوتار مان کر اس کی پرستش شروع کر دی۔ کنشک کی وفات کے بعد ہندوستان سیاسی افراتفری اور بدامنی کا شکار ہو گیا اور سلطنت ٹکڑوں ٹکڑوں میں بٹ کر رہ گئی۔ کشمیر میں مقامی راجاؤں نے اپنی خودمختاری کا اعلان کیا۔ نویں صدی سے بارہویں صدی تک کشمیر میں ہندو مذہب اور تہذیب پورے عروج پر رہی۔ اس دور کے تمدنی ورثے میں کشمیر شیو فلسفہ، سنسکرت، شعر و ادب اور فن تعمیر کو نمایاں حیثیت حاصل رہی۔ کشمیر کا شیو فلسفہ باقی ہندوستان سے قدرے مختلف ہے۔ اسے شیو درشن یاترا کا نام دیا گیا ہے۔ اس سے ہندوستان کا ساتواں مشہور فلسفہ بھی مانا جاتا ہے۔ شیومت کے پرستار شیو جی کو بھگوان مانتے ہیں۔

طلوع اسلام اور خودمختار سلطانوں کا زمانہ:

کشمیر کے حسن فطرت اور آب و ہوا نے ہمیشہ ملکی اور بیرونی شاعروں،

---

[1] Kashmir ، جی، ایم ڈی، صوفی، لائٹ اینڈ لائف پبلشرز نئی دہلی، جلد:ا 1974ء

سیاحوں اور بادشاہوں کو اپنا گرویدہ بنایا ہے۔ کشمیر میں اسلامی عہد کا آغاز 6/اکتوبر 1330 عیسوی سے ہوتا ہے۔

"جب نو مسلم رنچن نے اپنے حریف رام چند کو شکست دے کر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ویسے تو کشمیر میں مسلم اقتدار کا دور پانچ سو سال یعنی 1320 عیسوی سے 1819 عیسوی تک محیط ہے۔ لیکن کشمیر کی تعمیر و ترقی، علوم و فنون کی اشاعت اور کشمیری صنائع کے فروغ کا یہی زمانہ ہے۔ یہ سلاطین سچے محبّ وطن تھے۔ اُنہوں نے خاصی دلچسپی اور لگن کے ساتھ کشمیر کو حسین تر بنایا"۔[1]

1417 عیسوی سے 1469 عیسوی تک یہاں زین العابدین بڈشاہ نے بڑی شاندار حکومت کی۔ اُنہوں نے کشمیر سے بھاگے ہوئے ایک فرقے کو اپنے وطن واپس بھی بلا لیا۔ کشمیری خاندان کے ختم ہونے سے یہاں کی سرکاری، ادبی اور درسی زبان یعنی فارسی بھی دم توڑنے لگی۔ 1586 عیسوی میں اکبر بادشاہ نے یہاں یوسف شاہ چک کا تختہ چھین لیا۔

مغلوں کا راج یہاں 1752 عیسوی میں ختم ہوا اور پھر احمد شاہ ابدالی یعنی 1755 عیسوی سے 1819 عیسوی تک افغانیوں کے ہاتھوں میں کشمیر آ گیا۔ ان کی حکومت یہاں 64 برسوں تک رہی۔ اور پھر حکومت پٹھانوں کے ہاتھوں میں آ گئی۔ چک دور اور مغلیہ دور میں یہاں علم و ادب کو کافی فروغ مِلا۔

---

[1] عکسِ کشمیر، صابر آفاقی، صفحہ نمبر 21، مظفر آباد پاکستان 1919۔

چک خاندان:

1554 عیسوی تا 1586 عیسوی تک چک مسلمانوں کی حکومت رہی۔ چک دور میں کشمیر میں افراتفری کا عالم رہا مگر تمدنی لحاظ سے یہ دور کشمیر کی تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ سلطان یوسف شاہ چک فارسی اور کشمیری کا بھی شاعر تھا۔ وہ عیش وعشرت اور راگ کا دلدادہ تھا۔ اس کی سرپرستی میں کشمیر موسیقی نے کافی ترقی کی۔ یوسف شاہ چک کی ملکہ حبہ خاتون کے نام سے مشہور ہے۔ وہ کشمیری زبان میں شعر کہتی تھی اور اس کی شاعری آج تک کشمیر میں مقبول ہے۔

ریاست جموں و کشمیر کے سیاسی وسماجی حالات

سیاسی حالات:

13 جولائی 1931 عیسوی کے بعد ہی کشمیر میں پریس کو آزادی ملی۔ اخبارات اور کشمیری ادب نے بدلتی ہوئی زندگی اور نئے نظریات کی عکاسی کی۔ مہجور اور عبدالاحد آزاد نے اہلِ کشمیر کی صدیوں کی پسماندگی کا احساس تیز کردیا اور آزادی کے حصول کے لئے لوگوں کے دِلوں میں عزم و یقین کی آگ بھڑکائی۔ 13 جولائی 1931 عیسوی کا دِن ہماری قومی تاریخ میں ایک اہم تاریخی دِن ہے۔ اس دن پہلی بار اہلِ کشمیر سنٹرل جیل کی آہنی دیواروں سے ٹکرائے۔ ان کے سینوں کو گولیوں سے چھلنی کردیا گیا۔ اس خونچکان واقعہ نے لوگوں کے دِلوں میں آزادی کے لئے بجلیاں بھردیں۔

تنم گلے زخیابان جنت کشمیر:

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ نے پیام مشرق میں ''ساقی نامہ'' کے عنوان سے ایک نظم تحریر کی ہے اور چونکہ یہ نظم جیسا کہ علامہ نے خود تسلیم کیا ہے کہ کشمیر کے نشاط

باغ میں لکھی ہے۔ کشمیر کی غلامی اور لوگوں کی بے مقصد، غریب اور مفلوک الحال زندگی پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اس نظم میں کشمیر کے حسین وجمیل خوبصورتی کو زرین اشعار میں پیش کرنے کے بعد علامہ اقبالؔ یوں رقمطراز ہیں۔ ؎

کشمیری کہ با بندگی خو گرفتہ
بُتے می تراشد زسنگ مزارے
ضمیرش تہی از خیال بلندے
خودی نا آشنا سے زخود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنت او
نصیب تنش جامۂ تار تارے

"کشمیری غلامی سے اتنا عادی ہو چکا ہے کہ قبرستان کے پتھر کو اپنے لئے بت بناتا ہے۔ اس کا ضمیر بلند خیالات سے خالی ہے، خودی نہ سمجھی ہے اور اپنے آپ سے بھی شرمندہ ہے، اس کی محنت سے امیروں کے کوٹ ریشم کے بنے ہیں اور بے چارہ خود پھٹے کپڑے پہنے ہوئے ہے، نہ اس کی آنکھ میں کوئی روشنی ہے اور نہ اس کے سینے میں بے قرار دل ہے"۔

ڈاکٹر اقبالؔ "جنت کشمیر، ہی کے خیابان" کے ایک گل سر سبز تھے۔ ڈوگرہ راج کی سختیاں اور مصیبتیں آج بھی لوگ سن کر بید لرزان کی طرح کانپ اٹھتے ہیں۔ علامہؔ کو سرزمین کشمیر محبت اور تحریک آزادی سے پورا پور جذبہ تھا۔

جگن ناتھ آزاد اپنی کتاب ''اقبال اور کشمیر'' میں لکھتے ہیں۔

''جس طرح اقبال کے لئے ذکر کشمیر ذکر محبوب کی حیثیت رکھتا ہے، اُسی طرح اہلِ کشمیر کے لئے بھی ذکرِ اقبال ذکرِ محبوب کی حیثیت رکھتا ہے''۔ [1]

کشمیر کے لوگ مدتوں سے ظلم و جبر کی چکی میں پسے ہوئے تھے۔ اس لئے بلند خیالی، عالی ہمتی اور آزادی کی نعمت کو بلا چکے تھے۔ انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ آزادی خود ضمیر کی ہو یا اظہار خیال کی۔ سیاسی آزادی ہو یا اقتصادی، ایک ایسی لطیف شے ہے کہ جس کے لئے جتنی بھی قربانی دی جائے کم ہے۔

1931 عیسوی کے بعد شاعر، ادیب، افسانہ نگار اور ناول نویس کشمیری قوم کو حصول آزادی کے لئے جان جوکھوں میں ڈال کر صحیح مقام کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کرشن چندر نے درجنوں افسانے کشمیر پر تحریر کئے ہیں۔ ان میں خالص کشمیری ماحول دکھایا گیا ہے اور جاگیردارانہ نظام کی خرابیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ کرشن چندر نے ''شکست'' میں سورنکوٹ کی فضا دکھائی ہے اور پہاڑی سماج کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ''یادوں کے چنار''، ''نظارے''، طلسم خیال'' اور ''گرجن کی شام'' میں پونچھ اور مینڈھر کا سماجی و جغرافیائی ماحول دکھایا گیا ہے۔ ''کشمیر کی کہانیاں'' بھی کرشن چندر کے افسانوں کا ایسا دلِ آویز مجموعہ ہے جس میں باشندگان ریاست کی سانسوں کی گرمی محسوس کی جا سکتی ہے۔

---

[1] اقبال اور کشمیر، جگن ناتھ آزاد صفحہ ۱۳۔

عزیز احمد کا ناول ''آگ'' میں درہ زوجیلا کی فضا پائی جاتی ہے۔ ''آگ'' میں وادیٔ کشمیر کو ایسی جہنم کہا گیا ہے جس میں ہر جانب آگ ہی آگ نظر آتی ہے۔ مگر یہ آگ کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب شعبان ہانجی اس طرح دیتا ہے۔

''ہماری غربت کا باعث ہماری جہالت ہے۔ ہم جاہل ہیں اس لئے غریب ہیں''۔

''آگ'' کا ایک کردار انور کہتا ہے۔

''اصل غلامی نہ انگریز کی ہے۔ نہ ہندو کی۔ اصل غلامی سرمایہ غلے کی ہے اور ہماری لڑائی سرمایہ کی ہے''۔

سماجی وتہذیبی حالات:

وادیٔ کشمیر جغرافیائی، تاریخی، سیاسی خصوصیات کی طرح سماجی زندگی کے طور طریقہ اور رسم و رواج میں بھی امتیازی خصوصیت رکھتی ہے۔ تمدن جس کا دوسرا نام تہذیب وثقافت بھی اور جسے کلچر بھی کہا جاتا ہے، جو کسی قوم کے رہن سہن کے مخصوص طرزِ زندگی کا نام ہے۔ اس ذیل میں مذہب، زبان، لباس وخوراک، طرزِ تعمیر، شادی بیاہ کے رسوم اور تمدنی سرگرمیاں مثلاً لوک گیت، ناچ ونغمہ قسم کی چیزیں آجاتی ہیں۔

دورِ قدیم:

نیل مت پران کا مطالعہ بتاتا ہے کہ سرزمین کشمیر کی فضا زمانہ قدیم میں بھی خوش طبع اور خوش مزاج لوگوں سے معمور تھی۔ مذہبی، نیم مذہبی اور عوامی زندگی سے تعلق رکھنے والی تقریبوں پر موسیقی کا خاصا دخل تھا۔ حتیٰ کہ برف باری ہو یا کھیتوں میں بیج

بونے کے وقت آس پاس کی فضا ہو، موسیقی کی رسیلی لہروں سے جھوم اٹھتی تھی۔

نیل مت پران کے حوالے سے ڈاکٹر وید کماری گھئی کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

''بھگوان ویشنو کے آرام یا عالم بیداری کے سمان کی خالص مذہبی تقریب ہو، کسی نیم مذہبی جشن کی آمد یا وداع کی تقریب ہو، یا پھر نئی برف باری یا نئے بیج بونے کی موسمی تقریب ہو، موسیقی کا ہر وقت بڑا دخل تھا۔ گانے کو بھی اور بجانے کو بھی''۔ [1]

کشمیری معاشرے میں رقص کی اہمیت:

کشمیر میں موسیقی اور رقص کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مذہبی تقاریب سے قطع نظر روزمرہ کی زندگی میں رقص کا بڑا دخل تھا۔ موسم بہار کا استقبال رقص سے ہوتا تھا۔ اسی طرح زراعت سے متعلق جتنی تقریبیں ہوتی تھیں، رقص کے بغیر نامکمل تھیں۔ مذہبی تہواروں پر جس طرح کے رقص ہوتے تھے، وہ عام طور سے دیوتاؤں سے متعلق ہوتے تھے۔ ہندو دور میں لڑکیوں کو مندروں کے لئے وقف رکھنے کی ایک اہم رسم موجود تھی۔ وہ مندروں میں ناچتی اور گاتی تھیں۔

راج ترنگنی سے ظاہر ہوتا ہے کہ راجہ للتادیتہؒ کے زمانہ میں لڑکیوں کو مندروں کے لئے وقف رکھا جاتا تھا''۔

کشمیر مہمان نوازی میں بھی ساری دنیا میں مشہور ہے۔ علامہ ڈاکٹر عزیز احمد نے اپنی کتاب ''تاریخ تمدن کشمیر'' میں کشمیریوں کی مہمان نوازی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

---

[1] The "Nilmata Purana" ڈاکٹر وید کماری جلد اصفحہ نمبر ۱۰۰

''مہمان نوازی کا طریقہ اس قدر نفاست سے لبریز اور عمدہ ہوتا
ہے کہ اس کی مثال دنیا کے کسی بھی ملک میں نہیں ملے گی اور اس
سے ثابت ہوتا ہے کہ کشمیری قوم سابقہ زمانے کی نہایت متمدن
قوم ہے''۔ [1]

جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں نے کشمیر کی معاشرتی زندگی کی ترجمانی بڑی سنجیدگی سے کی ہے۔ کشمیری لال ذاکر اور ٹھاکر پونچھی نے اپنے افسانوں میں کشمیریوں کی غلامی کے کئی پہلو اُجاگر کر کے ان کی بیداری وانقلاب کا پیغام دیا ہے۔ رامانند ساگر نے اپنے افسانہ ''بخشش'' میں ریاستی عوام کو بیدار کیا ہے۔ نظیر زیدی نے اپنے ناول ''حبہ خاتون'' اور مسعود مفتی نے اپنے افسانہ ''قحط'' کے ذریعے اپنی مٹی کا قرض چکا دیا ہے۔ سعادت حسن منٹو نے ''ٹیٹوال کا کُتا'' اور ''آخری سلوٹ'' میں انسانی مسائل کی کامیابی سے گرہ کشائی کی ہے۔

نرگس داس نرگس نے افسانوی مجموعہ ''دکھا دیس'' میں وطن کی تباہ حالی اور اہلِ وطن کی مظلومی کا رونا رویا ہے۔ طاؤس بانہالی، الطاف قریشی، فوزیہ نقوی، خالد نظامی، احمد شمیم اور کئی اور ادیب اہلِ کشمیر کو دعوت انقلاب دیتے رہے ہیں۔ لطیف کاشمیری کا ''سوسن'' خوبصورت ناول ہے، جس ک ساری فضا سرزمین کشمیر ہے۔

[1] تاریخ تمدن کشمیر علامہ ڈاکٹر عزیز احمد صفحہ نمبر ۸۱۔

جموں وکشمیر میں اُردو زبان وادب کا ارتقا

(1868 عیسوی تا حال)

لسانیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ زبان صدیوں کے طویل سفر کے بعد معرضِ وجود میں آتی ہے۔زبان کی پیدائش اور نشو ونما میں بنیادی طور پر سماجی سطح پر اظہاریت کی خواہش کارفرما ہوتی ہے۔صدیوں کے تہذیبی سفر میں اس کا واسطہ بہت سی قوموں اور نسلوں سے پڑتا ہے اور اِن کے گونا گوں تجربے اس میں شامل ہوتے ہیں۔اس طرح زبان وتہذیب کی ایک علامت بن جاتی ہے۔اس میں کئی نسلوں کا خونِ جگر شامل ہوتا ہے۔ایشائی تہذیب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں وسعت اور لچک ہے۔کسی بھی تہذیب کو قبول کرنے کے لئے اس کے تمام دریچے کھلے رہتے ہیں۔قوموں، مذاہب اور نسلوں کے باہمی ارتباط نے یہاں کی زبانوں میں وسعت اور لچک پیدا کی ہے۔

جموں کشمیر بھی ایشا کا ایک ایسا حصہ ہے، جہاں ہمیشہ مختلف تجربوں اور تہذیبوں کی آمیزش ہوتی رہی ہے اور اس آمیزش کی وجہ سے یہاں کی زبان وادب میں متعدد پہلو پیدا ہوئے ہیں۔یہاں کے لوگ قدیم زمانے سے مختلف حملہ آوروں

اور مطلق العنان بادشاہوں اور راجاؤں کے ظلم وتشدد، غلامی، جہالت اور پسماندگی کا شکار رہنے کے باوجود اپنی فطری ذہانت، قابلیت، ہوش مندی سے نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک کو بھی گہرے طور پر متاثر کرتے رہے ہیں، مسلمانوں کے دورِ حکومت میں جب فارسی زبان کا رواج ہوا تو یہاں کے عالموں نے نہ صرف فارسی زبان میں مہارت پیدا کی بلکہ اس سے شعری اظہار کا ایسا موثر وسیلہ بنایا کہ بیسوں قابل قدر شعرا سامنے آئے جن کے کارناموں سے اہلِ ایران دنگ رہ گئے۔ ملکی سطح پر تو ہر زمانے میں کشمیری ذہن کی طباعی گہرائی اور فوقیت کا لوہا مانا گیا ہے۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ کشمیر میں اُردو شعر و ادب کی ابتدا کب سے ہوئی۔ مگر اتنا یقینی ہے کہ پنجاب میں اُردو کے ارتقا کا اثر اس ہمسایہ ریاست پر بھی پڑتا رہا۔ 18 ویں صدی کے اُکا دکا فارسی شاعروں کے یہاں ایک آدھ اردو شعر مل جاتے ہیں مگر صحیح یہ ہے کہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد سے اُردو زبان کے استعمال کے شواہد اور اُردو نامور علماء کی یہاں آمد سے اس کی ادبی تاریخ کے خدوخال ابھرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ 1862 عیسوی میں طبقات الارض کے ماہر فریڈرک ڈریو نے جو یہاں طبقات الارضی خدمات انجام دینے آیا تھا۔ مہاراجہ کے دربار سے متعلق یہ بات بھی لکھی ہے کہ ہندوستان سے آنے والے ملازم لوگ بلاشبہ ''ہندوستانی (اردو) بولتے ہیں۔ مقامی لوگ اس سے سمجھ لیتے ہیں''۔ 1868 عیسوی میں ''بدیا بلاس سبھا'' کے قیام سے اردو زبان کو بڑھاوا ملا۔ اس لئے کہ اس کے زیرِ اہتمام اردو میں بہت سی کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ اس طرح دھیرے دھیرے اردو شعر و ادب کا جادو

اس ریاست پر بھی اپنا اثر دکھانے لگا۔ چنانچہ ہرگوپال خستہؔ کی پہلی اردو تاریخ ''گلدستہ کشمیر'' 1873 عیسوی کے مطابق:

> ''باہر کے سیاحوں اور سیلانیوں سے بازاروں اور دوکانوں میں عام کشمیری اُردو زبان میں آسانی سے بات چیت کر لیتا تھا۔ خود ''گلدستہ کشمیر'' کی اشاعت ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے بہت پہلے سے لوگوں میں اردو زبان وادب سے شغف پایا جاتا تھا''۔

یہی سب ہے کہ مہاراجہ پرتاب سنگھ نے 1885 عیسوی میں اس کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔ بیسویں صدی کی ابتدا تک ریاست میں باہر کے متحد اہلِ علم وادب کے زیرِ اثر مقامی شاعروں اور ادیبوں کا بھی ایک حلقہ پیدا ہو گیا تھا جن کی شعری کاوشیں ''مخزن'' لاہور اور دوسرے رسالوں میں چھپنی شروع ہو گئی تھیں۔ خوشی محمد ناظرؔ کے حلقہ مفرج القلوب سرینگر نے بھی مقامی شاعروں اور ادیبوں کی ادبی کاوشوں کو بڑھاوا دینے اور سنوارنے میں خاصا حصہ لیا۔ اسی طرح جموں میں ''بزمِ سخن'' نے بھی جو بعد میں ''بزم ادب'' بن گئی۔ اس علاقے میں اردو شعر وادب کو فروغ دینے میں نمایاں کام کیا۔ ان کوششوں سے نہ صرف اردو زبان کو فروغ مقبولیت اور وسعت ملی بلکہ اردو شعر وادب کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہو گیا۔

جموں کے علاقے میں ''بزمِ سخن'' جموں 1912 عیسوی میں قام ہوئی اور تقریباً 20 سال تک قائم رہی۔ اس کے بعد یہ ''بزم ادب'' کے نام سے تقسیم ہند تک

باقی رہی۔ اس کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے ادیبوں اور شاعروں کے ذریعہ شاعری، ناول، ڈراما اور تنقید میں اچھی تخلیقات خلق کروائیں خصوصاً نند لال طالبؔ، نند لال کول، محمد عمر نور الٰہی ، اللہ رکھا، قدرت اللہ شہاب اور بہت سے دوسرے شاعروں اور ادیبوں نے اپنی تخلیقات سے اردو ادب کے دامن کو وسیع کیا۔ پنجاب کے اخبار ورسائل خصوصاً پنجاب میں مقیم اردو نواز کشمیریوں اور پنجابیوں کے جرائد مثلاً کشمیری میگزین، اخبار عام، اخبار کشمیر، صبح کشمیر، کشمیر درپن وغیرہ نے نہ صرف اردو زبان کے حلقہ اثر کو وسیع کرنے میں حصہ لیا بلکہ اردو شعر و ادب کے فروغ کے لئے مہمیز کا کام بھی کیا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے ریاستی عدالتوں میں فارسی کے بجائے اردو میں کام ہونے لگا۔ تقریباً اسی زمانے میں محکمہ مال میں اردو کی ابتدا ہوئی۔

1940 عیسوی میں سیدین کمیٹی کی سفارشات کی منظوری سے ریاست کے اسکولوں کیلئے اردو ذریعہ تعلیم بن گئی۔

1956 عیسوی میں جموں کشمیر آئین ساز اسمبلی نے دفعہ 145 کے تحت اردو کو ریاست کی سرکاری زبان قرار دیا۔ اس طرح اردو زبان کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کی رفتار ترقی بھی تیز تر ہوتی گئی۔

1924 عیسوی میں محمد عمر نور الٰہی صاحبان کے ''ناٹک ساگر'' نے جموں وکشمیر کے اہلِ علم و ادب کی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت کا لوہا منوالیا۔ اسی سال جموں سے ''رنبیر'' اجرا ہوا۔ اگر چہ اس سے پہلے ''بدیا بلاس'' کے نام سے ایک سرکاری

ہفتہ وار اُردو اور ہندی میں "بدیا بلاس سبھا" کے قیام کے زمانے ہی سے نکلتا تھا
مگر "رنبیر" سے آزاد صحافت کی ابتدا ہوئی۔ بعد کے برسوں میں "چاند" اور
دوسرے ہفتہ وار بھی نکلنا شروع ہوئے۔ پونچھ سے صادق، پربھات اور المجاہد اور
وادی سے "خدمت" اور دوسرے اخبار اور رسائل کے اجراء سے اردو شعر و ادب کو
اشاعتی فورم مہیا ہوئے۔ ان میں چھپنے والی ادبی رودادوں نے جموں و کشمیر میں نہ
صرف شعر و ادب کو بڑھاوا دیا۔ بلکہ اردو صحافت کو ترقی دی۔ ریاست میں شعر و ادب
کو بڑھاوا دینے میں ہفتہ وار "چاند"، "آئینہ"، "سنگم" اور ہفتہ وار "رفتار" کے رول
سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح "بزمِ سخن جموں"، "حلقہ مفرج القلوب"،
"بزمِ ادب پونچھ" اور بعد کے زمانے میں "بزم فروغ اردو جموں" نے ریاست
میں شعر و ادب میں نئے رجحانات کو جہت دینے اور شعر و ادب میں نئی صلاحیتوں کو
نمایاں کرنے میں قابلِ قدر کام کیا۔

آزادی سے پہلے کے شاعروں میں ذوالفقار علی نسیمؔ، کشن لال حبیبؔ، کشن
چند کشنؔ، سمبلپوریؔ، علیم یزدانیؔ، ہدایت اللہ فوقؔ، عبدالسمیع پالؔ، فیض شروانیؔ،
پنڈت نندلال طالبؔ، نندلال ثابتؔ، شہ زور کشمیریؔ، رسا جاودانیؔ، خواجہ غلام رسول
کامگارؔ، نرسنگھ داس نرگسؔ، الفت کشمیریؔ، گلزار احمد فداؔ، میکش کشمیریؔ، غلام رسول تنہاؔ،
عشرت کاشمیریؔ، اکبر جے پوریؔ، غلام رسول نازکیؔ، منوہر لال دلؔ، اللہ رکھا ساغرؔ،
دیا کرشن گردشؔ، کیفی اسرائیلیؔ، مولانا چراغ حسن حسرتؔ، دینا ناتھ رفیقؔ اور بہت
سے شعرا کے نام مختلف اخبار و رسالے اور مختلف انجمنوں کی ادبی کاروائیوں میں

بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ ان شاعروں نے اپنے عہد کے مختلف ادبی رجحانات، دبستانوں اور شعری روایات سے متاثر ہو کر مختلف النوع شعری تجربے کیئے۔ اس سے ان کی عصری آگہی اور شعروادب میں تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے زمانے میں ریاست میں کلاسیکل شعری روایات کی پاسداری کے ساتھ ساتھ جدت، تنوع اور عصری حسّیت کی مختلف شعری سطحیں بھی نوجوان شعرا کے کلام میں تازہ بہ تازہ ڈھنگ سے ملتی ہیں۔

ریاست میں بزرگ شعرا کی شعری تخلیقات اور ان کے تربیت یافتہ دوسرے نوجوان شعرا کی شعری کاوشوں نے ریاست میں اردو شعروادب کے ارتقا اور توسیع میں نمایاں حصہ ادا کیا۔ غلام حسین تنہاؔ کا مجموعہ کلام ''شبنمستان'' نندلال کول طالبؔ کا ''رشحات تخیل'' غلام رسول کا ''دیدہ تر'' اکبر جے پوریؔ کا ''ساز شکستہ'' کشن سمبل پوری کا ''فردوس وطن'' رسا جاودانیؔ کا ''نیرنگ غزل'' اور نظم ثریا منوہر لال کا ''نقد دِل'' اور پنڈت دینا ناتھ رفیقؔ کا ''سنبل و ریحان'' قابلِ قدر ادبی اضافے ہیں۔ ان کی کلاسیکی روایات کو آگے لے جانے والے شعرا میں قیصرؔ قلندر، اندر جیت لطفؔ، عرشؔ صہبائی، عابدؔ مناوری، قاضی غلام محمد، شہبازؔ راجوری، منشور بانہالیؔ، نشاطؔ انصاری، رہبرؔ جدید، برج موہن شفقؔ، رشید نازکیؔ، محمود الحسن محمودؔ، فداؔ کشتواڑی کا نام لیا جا سکتا ہے۔

''بربط اول'' (اندر جیت لطف) شکست جام، شگفت گلِ، اور صلیب (عرش صہبائی) ''بہارِ غزل، ''شمیم گُل'' اے جنت کشمیر (عابد مناوری) خیابان

''طلوع جام'' اور ''حریم ناز'' (رہبر جدید) کلاسیکی شاعری کی روایات کے امین مجموعے ہیں۔ قاضی غلام محمد کی مزاحیہ شاعری کا مجموعہ ''حرف شیرین'' دلچسپ اور بامقصد شاعری کا اچھا نمونہ ہے۔

دوسری طرف جدید ادبی رجحانات سے متاثر نئی نسل کے ان شعرا کی بھی خدمات کم اہم نہیں، جنہوں نے کلاسیکی روایات سے انحراف کیا اور نئے ذہن نئے عہد اور نئی شعری حیثیت کی ترجمانی کی۔ انہوں نے نئی تراکیب کی نراش و خراش، اپنے عہد کی زبان اور حیاتی شعری تجربوں کے ذریعہ اردو کے شعری اُفق کے نئے دریچے پیدا کئے۔ اس طرح کے شعرا میں سب سے بڑا نام حکیمؔ منظور کا ہے۔ ان کے شعروں سے ذہانت، کشمیر کا دلکش ماحول اور قدرت کے حسن کے رنگا رنگ پہلوؤں کی تراوش ہوتی ہے۔ اس کے یہاں لفظوں کے کھر درے پن میں بھی معنویت کی کئی تہیں پوشیدہ ہیں۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیریؔ دوسرے بڑے شاعر ہیں، ''عروس تمنا'' کے بعد اُن کی شعری کاوشوں میں نئی شعری ابہام کی نئی منزلیں سر کی ہیں۔

فاروق نازکیؔ، شجاع سلطانؔ، مظفر ایرجؔ، سلطان الحق شہیدیؔ، رفیق رازؔ اور فاروق مفطرؔ نے ادبی اُفق میں نئے شعری رنگ اجاگر کئے ہیں۔ ان کی کوششیں اردو شعر و ادب کی رفتار ترقی میں بہت معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ آنند لہرؔ دانش ملکؔ اور بہت سے دوسرے شعرا نے نئے اہنگ، نئے لب و لہجے اور عصری حسّیت کے نئے طرز اظہار کے ذریعہ ریاست میں اردو شعری قافلے کو جادہ پیما کر رکھا ہے۔ اس جہت کو عام کرنے میں بزم فروغ اردو جموں کا بھی ہاتھ رہا ہے۔

جموں میں اردو زبان و ادب کا ارتقا:

جموں کا علاقہ عام طور پر ابتداء ہی سے خصوصاً اشوک کے زمانے سے ملک کے پرشکوہ دھارے میں شامل رہا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ نہ صرف پنجاب کے میدانوں سے قریب تر ہے، بلکہ تاریخ کے متعدد ادوار میں وہ پنجاب ہی کے ایک حصے کے طور پر نشو نما پاتا رہا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ملک میں خصوصاً پنجاب میں نمودار ہونے والی ہر تبدیلی اس خطے کی سیاسی و سماجی زندگی کو اتنی ہی سرعت کے ساتھ متاثر کرتی رہی ہے کہ جتنی سرعت سے سیالکوٹ اور لاہور میں بسنے والے عوام ان سے متاثر ہوتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پنجاب میں مسلمانوں کی آمد کے بعد بھی جو بھی سیاسی، سماجی اور لسانی تبدیلیاں نمودار ہوئی انہوں نے اس خطے کو بھی اُسی طرح متاثر کیا کہ جس طرح اُس نے پنجاب کو متاثر کیا۔ پورے ملک اور خصوصاً پنجاب سے خطہ جموں کے انہیں سیاسی تجارتی، سماجی، مذہبی اور لسانی تحلقات کہ جو ہمیں قدیم زمانے سے ان کے درمیان ایک مضبوط رشتے کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ ان کی بنیاد پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو اس علاقے میں اُس وقت بھی بولی اور سمجھی جاتی تھیں کہ جب اس کا ابتدائی نقشہ پنجاب میں تیار ہو رہا تھا۔

اس علاقے میں اُردو کے ارتقاء کو سب سے زیادہ فروغ مغلوں کے زمانے میں حاصل ہوا۔ اکبر اور اس کے بعد کے سبھی شہنشاہ ہر سال گرمیوں میں کشمیر آیا کرتے تھے۔ اس شاہی قافلے میں صرف اُمرا، وزراء ہی شامل نہ ہوتے تھے بلکہ سپاہیوں کے علاوہ تاجر، مزدور اور بے شمار دوسرے لوگ بھی شامل ہوتے تھے۔ ایک طرح سے پورا

دارالخلافہ شاہی قافلے کے ساتھ سفر کرتا تھا۔ اُس میں ہر طبقے اور پیشے کے لوگ ہوتے تھے، کہ جو اگرچہ اپنی بولیاں بھی بولتے تھے، لیکن عام بول چال کا کام اُسی ملی جُلی زبان سے لیتے تھے کہ جو اُن کے آپسی ارتباط سے پروان چڑھ رہی تھی۔ یہ قافلہ جس میں ابوالفضل اور برنیر (Bernier) کے اندازے کے مطابق ڈیڑھ دولاکھ کے قریب افراد ہوتے تھے اس سفر کے دوران طویل عرصہ تک راجوری کے علاقے میں قیام کرتے۔ کیونکہ کشمیر جانے والا راستہ جس سے آج ہم مغل روڑ کہتے ہے۔ اسی علاقے سے گزرتا تھا۔ اس پوری شاہراہ پر قافلے کے قیام کے لئے بڑی بڑی سرائیں تعمیر کی گئی تھیں کہ جن میں سے کچھ کھنڈرات آج بھی راجوری کے علاقے میں موجود ہیں۔ ان میں سپاہیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں مستقل طور پر تعینات ہوتی تھیں۔ تاکہ شاہی قافلوں کے قیام کے لئے انتظامات کرسکیں۔ یہ سپاہی بھی عام بول چال میں اسی ملواں زبان کو استعمال کرتے تھے، اس قدر بھاری تعداد پر مشتمل شاہی قافلوں کا ہر سال اُدھر سے گزرنا اس علاقے میں اردو کے فروغ کے لئے ایک اور وسیلہ ثابت ہوا۔

اسلام کے پھیلاؤ اور مغلیہ حکومت کے زیرِ اثر جب اس علاقے میں عربی اور فارسی زبانوں کو فروغ ملا۔ دو تین ایسے ادبی مراکز بھی اُبھر آئے کہ جن سے وابستہ علماء وفضلا نے عربی اور فارسی کے ساتھ ہی ساتھ اُردو کو بھی اظہار خیال کا وسیلہ بنایا۔ یہ مراکز کشتواڑ، پونچھ اور مظفر آباد تھے۔ ان ادبی مراکز نے جہاں عربی و فارسی کی تعلیم وتربیت کے مواقعے پیدا کئے وہیں اردو کا ایک سلجھا ہوا مذاق عام کرنے کی کوششیں بھی کیں۔ اِن علاقوں میں آج بھی متعدد ایسی ذاتی لائبریریاں موجود ہیں

کہ جن میں عربی اور فارسی زبانوں کی اہم ادبی اور مذہبی کتابوں کی قلمی کاپیاں جو سترویں یا اٹھارویں صدی میں تیار کرائی گئیں اب بھی محفوظ ہیں۔ تاہم ان ذاتی لائبریریوں میں اس دور کی کوئی اردو تحریر نہیں مل سکی ہے۔

مہاراجہ پرتاب سنگھ کے بعد یہاں مہاراجہ ہری سنگھ 1925 عیسوی تا 1947 عیسوی نے بھی اردو کی سرپرستی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اردو کے فروغ کے لئے جہاں اردو کے انسپکٹر آف اسکولز تعینات کئے وہیں ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے لئے انعامات و اعزازات دینے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ محمد عمر نور الٰہی کو ناٹک ساگر 1924 عیسوی پر اور پنڈت وشوا ناتھ بی، اے کو تلاش حقیقت 1925 پر اسی زمانے میں بالترتیب ڈھائی سو اور دو سو روپے کے انعامات ملے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کو سبھی بڑی اصناف ادب میں طبع آزمائی کرنے والے ادیبوں کا ایک جم غفیر پیدا ہو گیا۔ نظم، غزل، افسانہ، ناول، ڈراما اور تنقید سبھی میں طبع آزمائی کی گئی اور بے پناہ ادب تخلیق ہوا۔

1935 عیسوی میں جب ملک میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی۔ تو اس کے اثرات یہاں بھی پہنچے اور بہت سے مقامی ادیب اس سے متاثر ہو کر فن پارے تخلق کرنے لگے اور اس طرح ان عناصر نے بھی ایک موثر متحرک کا کام کیا۔ کشتواڑ جو کہ شروع سے ہی ایک علمی و ادبی مرکز کی حیثیت حاصل کر چکا تھا، وہاں بھی یہ عناصر پہنچے جن سے متاثر ہو کر 1935 عیسوی میں ''بزمِ ادم کشتواڑ'' کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی۔ عشرت کاشمیرؔی اس کے سیکریٹری منتخب ہوئے۔ نشاط کشتواڑؔی اور دوسرے

ساتھیوں نے بھی اس انجمن سے وابستہ رہ کر قابل قدر فن پارے تخلیق کیئے۔ اسی زمانے میں انہیں تحریکات کے زیر اثر پونچھ میں بھی دیا نند کپور اور دوسرے ساتھیوں نے بزم ادب پونچھ قائم کی۔ اس بزم کے قیام سے اس علاقے کے ادیبوں کو مناسب سمت اختیار کر کے آگے بڑھنے اور اپنے اندر عصری تقاضوں کو پورا کرنے کا شعور پیدا کرنے میں مدد ملی۔ چنانچہ اسی بزم کی کوششوں سے چراغ حسن حسرتؔ، دینا ناتھ کپورؔ سراج الحسنؔ، ضیاء الحسنؔ اور دینا ناتھ رفیقؔ جیسے فنکار سامنے آئے۔

خطۂ جموں میں اردو زبان و ادب کو مزید فروغ دینے اور تحقیق، تنقیدی کاموں کی روایت شروع کرنے کا سہرا اردو جموں یونیورسٹی 1965 عیسوی کے سر ہے۔ یونیورسٹی میں ایم اے کا شعبہ قائم ہونے کا صحت افزاء اثر کالجوں پر بھی پڑا۔ آزادی کے بعد کالجوں میں اردو کی حالت کمزور ہو چکی تھی اور طلبہ کی تعداد روز بروز گھٹتی جا رہی تھی۔ اُردو کا شعبہ قائم ہونے سے اس میں پہلے تو ٹھہراؤ پیدا ہوا اور پھر آہستہ آہستہ طلباء کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا ڈاکٹر گیان چند جین کی سرکردگی میں شعبہ اردو نے نہ صرف یونیورسٹی کی چار دیواری کے اندر اردو کا ماحول پیدا کیا بلکہ اس کے باہر بھی اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کر کے اُردو کی فضا کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ پھر یہی کام پوری شدومد سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے انجام دیا۔ لا تعداد اسکالروں نے یہاں پی، ایچ، ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کی ہیں اور اس وقت تحقیقی کام شدومد سے جاری ہے۔ شعبے میں طلبہ اور اساتذہ کی کوششوں سے جو کام ہو چکے ہیں۔ ان کی تفصیل اس طرح سے ہے۔

اردو ڈراما جموں وکشمیر میں 1968 عیسوی از جتندر شرما، ''نقوش غالب''، 1969 عیسوی میں مرتبہ ڈاکٹر گیان چند جین، نریش کمار شاد۔ ''حیات اور شاعری 1970 عیسوی'' از کیلاش کمار، اردو پر گاندھی کا اثر 1971 عیسوی از تحمینہ اختر، تفسیر غالب 1971 عیسوی از ڈاکٹر ظہور الدین، تجزیئے 1973 عیسوی از ڈاکٹر گیان چند جین لسانی مطالعے 1972 عیسوی از ڈاکٹر گیان چند جین۔

''جموں وکشمیر میں اردو افسانہ'' 1973 عیسوی اسد اللہ وانی، ''جموں وکشمیر میں اردو ناول'' 1974 عیسوی محمد شریف ملک۔ ''اردو میں تمثیل نگاری'' 1975 عیسوی ڈاکٹر مناظر اعظمی،۔ تفکرات 1976 عیسوی از ڈاکٹر ظہور الدین، صوبہ جموں میں صحافت 1976 عیسوی از عبدالرحمٰن ادیخال، ''چراغ راہ'' 1976 عیسوی، ڈاکٹر منظر اعظمی، ''اقبال اور کشمیر'' 1977 عیسوی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اقبال، ''زندگی شخصیت اور شاعری'' 1977 عیسوی از پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ''مرقع اقبال'' 1977 عیسوی از پروفیسر جگن ناتھ آزاد، مالک رام (سوانح اور ادبی خدمات) 1978 عیسوی کنول کمار دگل، ''پشکر ناتھ'' حیات اور کارنامے 1979 عیسوی، رام دتہ چاڈک، علی عباس حسینی، ''حیات اور کارنامے'' 1979 عیسوی، ڈاکٹر نعیمہ اختر، نقطے اور شوشے، 1980 عیسوی ڈاکٹر ایس، ایل کالرا، اقبال اور مغربی مفکرین۔ ''پاکستان ایڈیشن'' 1980 عیسوی از پروفیسر جگن ناتھ آزاد، '' آنکھیں ترستیاں ہیں'' 1981 عیسوی از پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ''فکر اقبال کے بعض اہم پہلو'' 1982 عیسوی از پروفیسر جگن ناتھ آزاد،

''نشان منزل'' 1982 عیسوی از پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ٹھاکر پونچھی ''حیات اور کارنامے'' 1982 عیسوی از شری کلدیپ کمار گپتا، ''جموں میں اردو کی ادبی انجمنیں'' 1982 عیسوی راج سنگھ، ''گوپال متل کی شاعری'' 1983 عیسوی ضیاء الدین، جوش ملیح آبادی بحیثیت نثر نگار 1983 عیسوی، ''پروفیسر مجیب کی ڈرامہ نگاری'' 1983 عیسوی، وجے دیو سنگھ Iqbal mind and art 1983 عیسوی پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ''اقبال ایک ادبی سوانح حیات'' 1983 عیسوی از پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔

تحقیقی و تنقیدی کام کے سلسلے میں شعبے کے اساتذہ کی خدمات کو نہ صرف ریاست کے اندر بلکہ باہر بھی خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ ملک کے مختلف اداروں نے انہیں منتخب انعامات سے نوازا ہے۔ شعبے کے اُس وقت کے صدر پروفیسر جگن ناتھ آزاد اپنی متعدد کتابوں پر اُس وقت تک 17 انعامات حاصل کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر عابد پشاوری ایک، ڈاکٹر منظر اعظمی دو اور ڈاکٹر ظہور الدین دو انعامات حاصل کر چکے ہیں۔

اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں ''سنٹر فار پروفیشنل سٹیڈیز ان اردو'' جموں یونیورسٹی جموں کا ایک کلیدی رول ہے جس سے کوئی بھی ذی شعور فرد انکار نہیں کر سکتا۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جموں یونیورسٹی جموں، ملک کی واحد یونیورسٹی ہے جہاں پروفیشنل ازم اور اردو زبان کا کامیاب ترین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ آج تک یہاں ڈیپارٹمنٹ آف اردو کی طرف سے بے شمار سمینار منعقد کئے گئے۔ مگر اردو زبان کا سیکولر مزاج عنوان کے تحت 2008 عیسوی میں جو دو روزہ قومی سمینار جموں یونیورسٹی میں منعقد ہوا، ''سنٹر فار پروفیشنل اسٹڈیز ان اردو''

معیاری اور کامیاب رہا۔ اس سمینار میں ملک کے مختلف ریاستوں سے اُدبا، شعرا، محققین، ناقدین، مدرسین، دانشور مفکر اور صحافی مدعو کئے گئے تھے۔ سبھی ریاستوں کے بلند تربیت مندوبین نے اس میں شرکت کی اور اردو کے سیکولر مزاج، اردو کی رواداری، اردو کو درپیش مسائل اور اس زبان کی بقا و تحفظ کے حوالے سے اپنے مقالات پیش کئے۔ پدم شری پروفیسر امیتا بھ مٹو نے اپنے صدارتی خطبے میں اردو کو گنگا جمنی تہذیب قرار دیتے ہوئے بڑے پتے کی بات کہی۔ انہوں نے فرمایا۔

> ''اردو کیوں ایک مذہب کے ساتھ جوڑی گئی، سب جانتے ہیں۔
> لیکن اگر اردو کو بچانا ہے تو ہمیں اس کے سیکولر کریکٹر، تاریخ اور
> بنیادی خصوصیات کو پھر جگانا ہوگا اور مجھے پورا یقین ہے کہ یہ سمینار
> اردو زبان اور ہم سب کے لئے ایک نئی صبح لے کر آئے گا''۔ [1]

اس مختصر جائزے سے یہ بات عیاں ہے کہ خطہ جموں میں اردو زبان ادب کا مستقبل روشن ہے۔ اس خطے کے عوام کی روایتی فراخدلی نے انہیں اردو زبان کا گرویدہ بنادیا ہے اور وہ اس سے ترقی کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔

جموں کشمیر میں اردو نثر:

پندرہویں صدی سے انیسویں صدی تک کشمیر میں فارسی زبان کو ایک علمی و ادبی زبان کا درجہ حاصل تھا اور جب ملک میں اردو زبان کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی تو یہاں بھی آج سے یہی کئی سوا سو سال پہلے اردو نے فارسی زبان کو پیچھے دھکیل

---

[1] ''اردو کا سیکولر کردار'' پروفیسر شہاب عنایت ملک، صفحہ نمبر ۲۴

"نشان منزل" 1982 عیسوی از پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ٹھاکر پونچھی "حیات اور کارنامے" 1982 عیسوی از شری کلدیپ کمار گپتا، "جموں میں اردو کی ادبی انجمنیں" 1982 عیسوی راج سنگھ، "گوپال متل کی شاعری" 1983 عیسوی ضیاء الدین، جوش ملیح آبادی بحیثیت نثر نگار 1983 عیسوی، "پروفیسر مجیب کی ڈرامہ نگاری" 1983 عیسوی، وجے دیو سنگھ Iqbal mind and art 1983 عیسوی پروفیسر جگن ناتھ آزاد، "اقبال ایک ادبی سوانح حیات" 1983 عیسوی از پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔

تحقیقی وتنقیدی کام کے سلسلے میں شعبے کے اساتذہ کی خدمات کو نہ صرف ریاست کے اندر بلکہ باہر بھی خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ ملک کے مختلف اداروں نے انہیں منتخب انعامات سے نوازا ہے۔ شعبے کے اُس وقت کے صدر پروفیسر جگن ناتھ آزاد اپنی متعدد کتابوں پر اُس وقت تک 17 انعامات حاصل کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر عابد پشاوری ایک، ڈاکٹر منظر اعظمی دو اور ڈاکٹر ظہور الدین دو انعامات حاصل کر چکے ہیں۔

اردو زبان وادب کی ترویج وترقی میں "سنٹر فار پروفیشنل سٹڈیز ان اردو" جموں یونیورسٹی جموں کا ایک کلیدی رول ہے جس سے کوئی بھی ذی شعور فرد انکار نہیں کر سکتا۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جموں یونیورسٹی جموں، ملک کی واحد یونیورسٹی ہے جہاں پروفیشنل ازم اور اردو زبان کا کامیاب ترین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ آج تک یہاں ڈیپارٹمنٹ آف اردو کی طرف سے بے شمار سمینار منعقد کئے گئے۔ مگر اردو زبان کا سیکولر مزاج عنوان کے تحت 2008 عیسوی میں جو دو روزہ قومی سمینار جموں یونیورسٹی میں منعقد ہوا، "سنٹر فار پروفیشنل اسٹڈیز ان اردو"

معیاری اور کامیاب رہا۔ اس سیمینار میں ملک کے مختلف ریاستوں سے اُدبا، شعرا، محققین، ناقدین، مدرسین، دانشور مفکر اور صحافی مدعو کئے گئے تھے۔ سبھی ریاستوں کے بلند تربیت مندوبین نے اس میں شرکت کی اور اردو کے سیکولر مزاج، اردو کی رواداری، اردو کو درپیش مسائل اور اس زبان کی بقا و تحفظ کے حوالے سے اپنے مقالات پیش کئے۔ پدم شری پروفیسر امیتابھ مٹّو نے اپنے صدارتی خطبے میں اردو کو گنگا جمنی تہذیب قرار دیتے ہوئے بڑے پتے کی بات کہی۔ انہوں نے فرمایا۔

> ''اردو کیوں ایک مذہب کے ساتھ جوڑی گئی، سب جانتے ہیں۔
> لیکن اگر اردو کو بچانا ہے تو ہمیں اس کے سیکولر کریکٹر، تاریخ اور
> بنیادی خصوصیات کو پھر جگانا ہوگا اور مجھے پورا یقین ہے کہ یہ سیمینار
> اردو زبان اور ہم سب کے لئے ایک نئی صبح لے کر آئے گا''۔ [1]

اس مختصر جائزے سے یہ بات عیاں ہے کہ خطہ جموں میں اردو زبان ادب کا مستقبل روشن ہے۔ اس خطے کے عوام کی روایتی فراخدلی نے انہیں اردو زبان کا گرویدہ بنادیا ہے اور وہ اس سے ترقی کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔

جموں کشمیر میں اردو نثر:

پندرہویں صدی سے انیسویں صدی تک کشمیر میں فارسی زبان کو ایک علمی و ادبی زبان کا درجہ حاصل تھا اور جب ملک میں اردو زبان کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی تو یہاں بھی آج سے یہی کئی سوا سو سال پہلے اردو نے فارسی زبان کو پیچھے دھکیل

---

[1] ''اردو کا سیکولر کردار'' پروفیسر شہاب عنایت ملک، صفحہ نمبر ۲۴

کر اس کی جگہ لے لی اور سب سے پہلے اس جادو اثر زبان نے اپنا اثر جموں اور

پونچھ پر ڈالا۔ پونچھ سے چراغ حسن حسرتؔ کی شاداب طبیعت نے اردو زبان میں اپنی تخلیقات پیش کیں۔ پونچھ اور جموں کے دوش بدوش وادی کے مردم خیز خطے نے محمد دین فوقؔ کو ادب اور تاریخ کے میدان میں لا کھڑا کیا۔ تاریخ اقوام کشمیر، تاریخ بڈشاہی، تاریخ پونچھ، تاریخ کشمیر مکمل، خواتین کشمیر، اُس کی زندہ یادگاریں ہیں۔ صحافتی میدان میں اردو زبان کے اخبارات نے یکے بعد دیگرے جنم لینا شروع کیا۔ چنانچہ سرینگر، جموں اور پونچھ سے اخبار صداقت، حقیقت، ہمدرد، خالد، البرق، خدمت، المجاہد، وتستا، رنبیر، چاند، دیش، ذوالفقار، وکیل مختلف اوقات پر منظر عام پر آتے رہے۔ رسالوں میں پرتاپ میگزین، فردوس، لالہ رُخ، رتن، تنظیم اور تعلیم جدید نام قابلِ ذکر ہیں۔

''مہاراجہ رنبیر سنگھ کے انتقال کے بعد مہاراجہ پرتاپ سنگھ 1885 عیسوی میں تخت نشین ہوئے۔ اس عہد تک اردو پڑھے لکھے لوگوں کا حلقہ بڑھ گیا تھا اور اردو زبان ذریعہ اظہار بن گئی تھی۔ مہاراجہ نے اس زبان کی مقبولیت کے پیش نظر 1889 عیسوی میں اسے سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کرلیا''۔

ہرگوپال خستہؔ کے چھوٹے بھائی سالک رام سالکؔ اس عہد کے دوسرے اہم نثر نگار ہیں۔ سالکؔ کا ادبی ذوق بھی خستہؔ کی طرح لاہور کی ادب پرور فضاؤں میں پروان چڑھا تھا۔ وہ عرصہ دراز تک اخبار ''اودھ'' لکھنو میں مضامین لکھتے رہے۔ انہوں نے خود بھی لاہور سے اپنے بھائی کے ساتھ ''خیر خواہ کشمیر'' نام کا ایک

ہفت روزہ جاری کیا تھا۔ 1964 عیسوی میں لالہ ملک راج صراف نے ریاست کا پہلا اخبار جمہوں سے جاری کیا۔ اس اخبار کی اشاعت نے اردو نثر کی توسیع اور ترقی کیلئے راہیں کھول دیں اور نئی صلاحیتوں کو اُبھرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس طرح سے نئے نثر نگاروں کا ایک بڑا حلقہ پیدا ہوا۔ ان میں مولوی زین العابدین، سالگرام کول، جیالال کلم، مولوی عبداللہ وکیل، پریم ناتھ بزاز، کشپ بندھو، پریم ناتھ رونق، بلدیو پرشاد شرما، عشرت کشتواڑی، نشاط کشتواڑی قابلِ ذکر ہیں۔

سرینگر کا پہلا اخبار ''وتستا'' پریم ناتھ بزاز کی ادارت میں 1933 عیسوی میں شائع ہوا۔ اس کے بعد بزاز صاحب اور شیخ محمد عبداللہ نے 1935 عیسوی میں ہمدرد شائع کیا۔ پھر اسی سال کشمیری پنڈتوں کی انجمن کے پرچے ''مارتنڈ'' کا اجرا بھی ہوا۔ ان اخبارات نے صحافت کا ایک نیا معیار قائم کیا۔ ان اخباروں کے ذریعے نثر کی آبیاری ہوئی۔ اہم نثر نگار پردیسی، دینا ناتھ واریکو شاہد، انور پریمی، آنند کول بامزی، شیام لال ایمہ، تیرتھ کاشمیری کی ''دیوتا'' وشوا ناتھ درماہ کی '' تلاش حقیقت اور انکشاف حقیقت'' اور آفتاب کول وانچو کی چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں۔ رنبیر، وتستا، ہمدرد اور مارتنڈ کے بعد آج تک اخبارات کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ 1947 عیسوی تک اخبارات کی تعداد 47 تک پہنچ گئی تھی۔ آزادی کے بعد اس تعداد میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ ان اخبارات میں روزنامے بھی ہفت روزہ بھی اور پندراہ روزہ بھی شامل ہیں۔ دیش، چاند، کیسری، خدمت، حقیقت، نور، جیوتی، آفتاب، چٹان، سرینگر ٹائمز، نوائے صبح، اقبال، ہمارا اُستاد، کشمیر، سویرا، امر، وادی کی آواز،

پولیٹکل ٹائمز، قومی آواز، عُقاب، پاسبان، سدرشن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ رسائل میں پریم، فردوس، کونگ پوش، تعلیم جدید، آزاد، گلریز، تعمیر، جیوتی، وکیل، ہما، جھرنا، کینواس، دیش، ادبیات، شیرازہ، ہمارا ادب، بازیافت، اقبالیات قابلِ ذکر ہیں۔ مختلف وقتوں پر چھپنے والے ان رسائل نے کشمیر کے تخلیقی ذہن کی بازیافت کی اور اردو نثر کے امکانات روشن کیئے۔

ہماری ریاست کو بہر حال یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے اپنے آئین کی رو سے اُردو کو یہاں کی سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں اردو زبان کی روز افزوں ترقی کے ساتھ ساتھ یہاں شاعروں کے دوش بدوش نثر نگار، تمثیل نگار، افسانہ نویس، ڈرامہ نگار اور صحافتی تیزی کے ساتھ اُبھرتے گئے، جنہوں نے اپنی تخلیقات کو پیش کر کے کشمیر میں اردو نثر نگاری کی کمی کو پورا کیا۔ اردو نثر کو توسیع کے ساتھ ساتھ فکشن کے مختلف شعبے بھی معرضِ وجود میں آگئے۔ چنانچہ افسانے، ناول، ڈرامے، ادب لطیف، انشائیے، تحقیق وتنقید غرض کہ شعبے میں ریاست کے قلم کاروں نے اپنے قلم کی جولانیاں دکھائیں۔ آج ہمارے کتنے ہی قلم کار ہیں جن کی اردو دنیا میں اپنی پہچان ہے۔ فکشن کے شعبے میں پریم ناتھ پردیسیؔ، پریم ناتھ درؔ، نرسنگھ داس نرگسؔ، کشمیری لال ذاکرؔ، موہن یاورؔ، ٹھاکر پونچھیؔ، علی محمد لونؔ، غلام حیدر چشتیؔ، نند لال بے غرضؔ، دینا ناتھ واریکو شاہدؔ، شیام لعل ایمہؔ، گنگا دھر دیہاتیؔ، محمود ہاشمیؔ، تیرتھ کاشمیریؔ، سوم ناتھ زتشیؔ، بنسی نردوشؔ، پشکر ناتھؔ، تیج بہادر بھانؔ، حامدی کشمیریؔ، برج پریمیؔ، ہری کرشن کولؔ، کشوری منچندہؔ، ییش سروجؔ، نور شاہؔ،

ڈی کنولؔ ، مالک رام آنندؔ، محمد زماں آزردہ، شبنم قیومؔ، عمر مجیدؔ اور دوسرے بیسیوں تابناک ستارے ہیں جن کی تخلیقات ہر زمانے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی رہی ہیں۔ ہمارے محققین اور ناقدین نے ادھر تنقید اور تحقیق کے میدان میں اچھا کام کیا ہے۔ ادبی تنقید کے ابتدائی نمونوں میں محمد عمر نور الٰہی صاحبان کی معرکتہ الآرا تصنیف ''ناٹک ساگر'' تسلیم کی گئی، جو پہلی بار 1964 عیسوی میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کو ڈرامہ نگاری کے فن پر پہلی اردو تصنیف تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ان ہی مصنفین نے امانت کی اندر سبھا مرتب کر کے شائع کی۔ اس میں مقدمہ اور حواشی شامل کر کے اس کی افادیت میں اضافہ کیا۔

1974 عیسوی کے فوراً بعد یہاں کی حکومت نے پرائمری اور مڈل کلاسوں کی درسی کتابیں مقامی مصنفین سے ہی لکھوائیں۔ ان مقامی مصنفین میں پریم ناتھ پردیسیؔ، پرفیسر صاحب زادہ حسن شاہؔ، میر غلام رسول نازکیؔ، تنہاؔ انصاری، مرحوم غلام احمد کشفیؔ، پروفیسر ایم ایل فاضلیؔ، اور غلام حسین نحویؔ قابلِ ذکر ہیں۔

1958 عیسوی میں یہاں جب فن تمدن اور زبانوں سے متعلق کلچرل اکادمی کا وجود عمل میں لایا گیا تو اس ثقافتی ادارہ نے نہات فیاضی کے ساتھ دوسری زبانوں کے علاوہ اردو کی طرف بھی خاصی توجہ دی۔ اردو نثر و نظم اور دوسری تخلیقات کو منظر عام پر لانے کے سلسلے میں اس ادارہ نے نثر نگاروں، افسانہ نویسوں، کہانی کاروں اور شاعروں کو مالی امداد دینے کا سلسلہ شروع کیا، تاکہ وہ اپنی تصنیفات شائع کرا سکیں۔ چنانچہ اس ادارے کی کوششوں سے ہی آج تک درجنوں اردو کتابوں کو چھپوا کر ایک

خاص کمی کو پورا کیا گیا۔ ادباء کی حوصلہ افزائی کے پیش نظر مالی امداد سے قطع نظر معیاری کتابوں کی اشاعت کے لئے ہر سال انعامات دینے کی روایت بھی کلچرل اکادمی نے ہی ڈالی اور نثر نگاری کے میدان میں جن نثر نگاروں کی تصانیف 1958 عیسوی کے بعد منظر عام پر یکے بعد دیگرے آتی رہیں، اُن میں ڈاکٹر حامدی کاشمیریؔ کی ''بلندیوں کے خواب، سراب، جدید نظم کا ارتقاء، غالب کے تخلیقی سرچشمے، اقبال اور غالب، کارگہہ شیشہ گری، میر کا مطالعہ، حرف راز اور امکانات'' شامل ہیں۔

پرفیسر عبدالقادر سروریؔ کی ''پایل کے زخم اور یہ میری دنیا'' محمد امین پنڈت کی ''مختصر تاریک کشمیر اور لداخ کی کہانی'' تنہا انصاریؔ مرحوم کے خطوط کا مجموعہ ''خاطر احباب، صحیح اردو بولئے اور تعلیم زبان'' عشرتؔ کشتواڑی کی ''تاریخ کشتواڑ'' ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی ''ادبی قدریں اور نفسیات، لاوے کا سمندر اور شعوری عمل''۔ پروفیسر نندلال طالبؔ کی ''جوہر آئینہ''۔ شبنم قیوم کی ''ایک زخم اور سہی اور یہ کس کا لہو بہا'' ملک راج آنندؔ کی ''جانے وہ کیسے لوگ تھے''۔ ڈاکٹر اکبر حیدریؔ کا ناول ''فطرت'' میر انیس بحیثیت روزمیہ شاعر، میر ضمیر اور دیوان نامی، مطالعہ زور اور نسخہ میر بخط میر، شیخ محمد عبداللہ کی ''آتش چنار''۔ ثنا اللہ بٹ کی ''47 یا 77''۔ پروفیسر سیواؔ سنگھ کی ''کشمیر میں پنجابی زبان و ادب''۔ علی محمد لون کی ''شاید ہے تیری آرزو''، ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈت کی ''خواجہ حافظ شیرازی کا مفصل مطالعہ''۔ ڈاکٹر محمد زماں آزردہؔ کی ''فانوس خیال، شیریں کے خطوط، غباروں کا کارواں'' اور مرزا سلامت علی کی ''دبیر حیات اور کارنامے''۔ ڈاکٹر برج پریمی کا ''سعادت حسن منٹو، حیات اور

کارنامے، ذوق نظر، حرف جستجو، جلوۂ صدرنگ اور چند تحریریں''۔ جگن ناتھ آزاد کی ''اقبال اور کشمیر''۔ غلام رسول سنتوش کا ناول ''سمندر پیاسا ہے''، ڈاکٹر مشعل سلطان پوری کی ''نگاشات''۔ امر سالموہی کا ''زعفران زار''۔ بھوشن لال بھوشن کی کتاب ''صرف پانچ ہزار'' موہن یاور کی ''سیاہ تاج محل اور اپنا گھر''۔ جان محمد آزاد کی ''جموں وکشمیر کے اردو مصنفین''، ''شیرازہ، جموں، کشمیر اور لداخ...... قدیم تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں'' شیرازہ...... ''جموں وکشمیر میں اردو ادب کے پچاس سال''۔ اور بہت سی بیسوں چھوٹی بڑی تصانیف قابلِ توجہ ہیں۔

1958 عیسوی سے اب تک کلچرل اکادمی نے اردو زبان کو فروغ دینے میں جو رول ادا کیا ہے وہ بجائے خود ایک تاریخ ہے۔ اسی ادارے کے تحت ایک دوماہی ادبی جریدہ 'شیرازہ'' محمد یوسف ٹینگ کی ادارت میں جاری کیا گیا۔ ٹینگ صاحب ڈپٹی سیکریٹری اور پھر سیکریٹری بھی رہے، لیکن وہ اس جریدے کے ساتھ نگراں ومدیر اعلیٰ کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ کچھ عرصہ کیلئے رشید نازکی اس کے ایڈیٹر رہے، پھر محمد احمد اندرابی اس کے مدیر رہے۔ آج محمد اشرف ٹاک شیرازہ کے مدیر ہیں۔ نثر نگاروں کی تخلیقات کو عوام سے روشناس کرانے کے سلسلہ میں سالنامہ ''ہمارا ادب'' بھی نہایت پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے اور اس کے کئی نمبر مثلاً مشاہیر نمبر 2 جلد، جموں وکشمیر نمبر 5 جلد، شخصیات نمبر 5 جلد، اولیاء نمبر 4 جلد قابلِ ذکر ہے اور اکادمی نام کا مصور خبرنامہ بھی اس ثقافتی ادارے کی کوششوں سے چھپا جاتا ہے۔

ریاستی محکمہ اطلاعات کی طرف سے ''تعمیر'' نام کا رسالہ بخشی غلام محمد کی

وزارت کے دوران اجراء کیا گیا۔ اس سے پہلے ایڈیٹر مرحوم شمیم احمد شمیم تھے، پھر محمد یوسف ٹینگ اس کے مدیر بنے، جن کی ادارت میں کئی خاص نمبر شائع ہوئے اور ''تعمیر'' نے ادبی حلقوں میں ایک خاص مقام حاصل کرلیا۔ کشمیر یونیورسٹی کا شعبہ اردو کئی برسوں تک ''ادبیات'' نام کا ایک رسالہ سال میں ایک بار چھپتا رہا۔ اب یہ رسالہ ''بازیافت'' کے نام سے شائع ہورہا ہے اور اس میں تخلیقی اور تنقیدی، لسانی وادبی تخلیقات کو منظرِ عام پر لایا جارہا ہے۔

اردو زبان کی خدمت انجام دینے میں یہاں کے ریڈیو اسٹیشن اور پھر 1972 عیسوی سے قیام دوردرشن کیندر (ٹیلی وژن) کی ادبی خدمات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ دونوں ماس میڈیا ادارے زبان و ادب کی توسیع و تشہیر میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان اسٹیشنوں سے آئے دِن علمی، ادبی، ثقافتی، تنقیدی و تحقیقی پروگرام پیش کئے جاتے ہیں۔ جموں، کشمیر اور لداخ تینوں خطوں کی وحدت کے لئے اردو ہی وہ زبان ہے جسے تبادلہ خیالات کی قدر مشترک ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ہم اس زبان کی مدد سے ریاست کی تینوں اکائیوں کے ثقافتی وتہذیبی رشتوں کو برقرار رکھنے اور فروغ دینے کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ ہمیں دوسری مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کی ترقی کے لئے مصروف جدوجہد کرنی ہے۔ اس کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر ترقی کے لئے ایک ٹھوس اور واضح لائحہ عمل کو تشکیل دینا ہے اور ان میں رکاوٹوں کو دور کرنا ہے جو اس کے راستے میں سدِ باب بن کر موجود ہیں۔ ہمیں خلوص اور ایمان داری سے اس کی طرف توجہ

دینا ہے۔

''آج جب کہ ہندوستان میں جتنے بھی اردو بولنے والے ہیں اُن کی نظریں کشمیر کی طرف لگی ہوئی ہیں اور کشمیر میں اُنہیں ایک اُبھرتے ہوئے مرکز کی روشنی پھوٹتی ہوئی نظر آرہی ہے، تو ہمیں اپنے فرائض کا احساس اور تیز کر دینا چاہیے اور وہ تمام اقدامات کرنے چاہئیں جن سے ہمارے اور دوسرے وابستہ گان اردو کے خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکیں''۔

ڈرامہ نویسی کے فن میں آغا حشر کاشمیری اور محمد نور الٰہی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آغا حشر نے درجنوں ڈرامے لکھ کر سٹیج کرائے۔ انہوں نے پہلی بار ڈرامہ نویسی کو پارسیوں کی تجارت گرفت سے نکال کر اُسے اردو ادب کی اہم صنف بنانے کے لئے ساری زندگی وقف کردی۔ نور الٰہی محمد عمر کی کتاب ''ناٹک ساگر'' ڈرامائی ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ آج تک زیادہ تر ریڈیائی ڈرامے لکھے گئے۔ ان میں پریم ناتھ پردیسی، علی محمد لون، سوم ناتھ زتشی، گن شام سیٹھی وغیرہ پیش پیش ہیں۔

1947 عیسوی سے 1997 عیسوی تک لکھے گئے اردو سٹیج ڈراموں کا جائیزہ لیتے ہوئے مرحوم علی محمد لون کی ہی نگارشات کا اولین فرصت میں تذکرہ کروں۔ اُن کا ڈرامہ ''دیوانے کا خواب'' سٹیج بھی ہوا، یہ ڈرامہ 1956 عیسوی میں کلچرل کانگریس کے اہتمام سے کھیلا گیا تھا۔ اس کے بعد علی محمد لون نے ''گھروندے'' لکھا جو ڈل جھیل کے ماحول میں رہائش پزیر ہانجیوں کی زندگی پر مبنی ہے۔

ریاستی کلچرل اکادمی نے اپنی مالی وساطت سے لون صاحب کا ڈرامہ

''جھیل بلا رہی ہے'' پیش کیا۔ یہ کھیل بھی، ''کھروندے'' کی طرح کشتیوں میں رہنے والے ہانجیوں کی گھریلو زندگی پر مبنی ہے۔

علی محمد لون کے انتقال کے بعد وادیٔ کشمیر میں موجود لے دے کے بنسی نردوش اور سجود سیلانی ہی دو ایسے ناٹک کار ہیں جو کشمیری کے علاوہ اردو میں بھی سٹیج ڈرامے لکھتے ہیں۔ بنسی نردوش کا لکھا ہوا ڈرامہ ''ایک رات کا مہمان'' بہت عرصہ پہلے طبع شدہ صورت میں منظر عام پر آچکا ہے۔ 1976 عیسوی میں سجود سیلانی کے لکھے ہوئے ایکٹ کے اردو ڈراموں کا مجموعہ ''شاہکار'' منظر عام پر آیا جس میں ''شاہکار'' کے علاوہ ''مجنون کا مقدمہ''، ''لقمان کا دادا''، جنم جنم کے پھیرے'' اور ''ریت کی دیوار'' شامل ہیں۔ اس کے بعد اُن کا ایک طویل ناٹک ''ٹھسکری'' سٹیج پر کھیلا گیا جو بہت مقبول ہوا۔ کہانی کے لحاظ سے یہ ڈرامہ ہندوستانی خانہ بدوش بنجاروں کی معاشی بدحالی اور گھریلو کشمکش پر مبنی ایک پُراثر المیہ ہے۔ اس کے علاوہ سجود سیلانی نے ریڈیائی ڈراموں اور دوردرشن کے سیریلوں کے علاوہ ڈھیر سارے اردو ڈرامے لکھے ہیں جن میں کچھ ریاستی کلچرل اکادمی کے اشاعتی سلسلے کے طفیل منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان میں ''گرگٹ کے رنگ''، پتھر پگھلتا ہے''، ''لوہے کے چنے''، ''سونے کی چڑیا'' ''ساجھے کی ہانڈی''، ''حیاتِ نو''، ''آستین کا سانپ'' اور ''رائی کا پہاڑ'' شامل ہیں۔

اُدھر گرد و پیش میں پنپ رہے ناٹک کاروں کا بڑا گروپ اردو ڈرامے لکھنے میں محو ہے۔ منوہر رائے زادہ کے ڈراموں کا مجموعہ ''اردو ڈرامے'' 1964 عیسوی

میں چھپ کر منظرِ عام پر آچکا ہے۔ اس مجموعے میں پانچ ڈرامے شامل ہیں۔ ''تاش کا گھر''، ''پنجرا''، ''ایک پتھر اور ایک محل''، ''شمع جلاؤ شمع بجھاؤ'' اور ''ہار جیت''۔ مدن موہن شرما کے بھی کئی ڈرامے شائع ہو چکے ہیں اور وقتاً فوقتاً سٹیج پر بھی کھیلے جاتے ہیں۔ سرینگر کے ٹیگور ہال میں ان کا ایک ڈرامہ ''جانور'' پیش ہو چکا ہے جو معیار کے اعتبار سے بہت ہی اعلیٰ ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انسان اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل کے لئے کب اور کیسے جانور بنتا ہے۔ رام کمار ابرولؔ کا لکھا ہوا ناٹک ''انسان جیت گیا'' 1959 عیسوی میں شائع ہوا اور اسی سال منچ پر بھی پیش کیا گیا۔ اسی ناٹک کار کے مزید کچھ ڈرامے کتابی صورت میں منظرِ عام پر آئے۔ ''دھرتی اور ہم''، ''چکی کے پاٹ'' وغیرہ۔ جموں کے ہی دیانند کپور کا کھیل ''تاج'' بھی کتابی صورت میں چھپ کر منظرِ عام پر آچکا ہے۔

ریاستی کلچرل اکادمی نے اپنی نگہداشت اور مالی کفالت سے دو ڈرامے ''جھیل بلا رہی ہے'' اور ''ٹیپو سلطان'' کے علاوہ اردو کے دو اوپیرا ''ہمالیہ کے چشمے'' اور ''پیا باج پیالہ'' پروڈیوس کئے اور بیرون ریاست جا کر کئی شہروں میں اُن کی نمائش کی اور داد تحسین حاصل کی۔

مرحوم علی محمد لون کے بعد صرف سجود سیلانیؔ واحد تمثیل نگار وادی میں موجود ہے، جو وقتاً فوقتاً سٹیج کے لئے ڈرامے لکھتے رہے اور وہ بھی اردو زبان میں۔ یہی ایک ڈرامہ نگار سنجیدہ ہے، جو کچھ لکھا ہے برمحل لکھا ہے، اردو ڈرامہ کے فن سے واقف ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو وادی کے تھیٹر کیلئے مستقبل میں اردو ڈرامہ قطعی ناپید

ہوگا۔ اس لئے ریاستی کلچرل اکادمی کو چاہیئے کہ وہ اپنی نگہداشت سے اور وسائل کو بروئے کار لاکر ڈرامے کے فن کی طرف متوجہ ہوکر قلم کاروں کی نئی پود کو اردو سٹیج ڈرامے تحقیق کرنے پر راغب کریں۔

جموں و کشمیر میں اردو تنقید:

ادبی تنقید کے ابتدائی نمونوں میں محمد عمر نور الٰہی صاحبان کی معترکتہ الآرا تصنیف ناٹک ساگر تسلیم کی جاسکتی ہے۔ یہ دونوں دوست مشترکہ نام سے برسوں تک مشترکہ کارنامے انجام دیتے رہے۔ ان کا سب سے اور بڑا قیمتی کارنامہ ''ناٹک ساگر'' ہے جو پہلی بار لاہور کے مرکنٹائل پریس سے 1924 عیسوی میں شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کو ڈرامہ نگاری کے فن پر پہلی اردو تصنیف قرار دیا جاسکتا ہے۔ علامہ کیفی نے ناٹک ساگر کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ برحق ہے۔ مصنفین نے بڑی محنت و جاں فشانی کے ساتھ پہلے مواد اکٹھا کیا اور پھر اس کو بہ نظر غائر دیکھا۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کا نام ریاست کے نامور ناقدین میں آتا ہے۔ حیدری بنیادی طور محقق ہیں، اُن کی تصانیف کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ تنقید بھی اُن کا میدان رہا ہے۔ اردو ادب میں اُن کے کئی تحقیقی کارنامے منظر عام پر آئے لیکن انہوں نے تنقیدی خیالات کا بھی اظہار کیا۔ تنقید کے ضمن میں اُن کی مشہور کتاب ''میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر''، ''مطالعہ زور''، ''میر ضمیر''، ''تحقیق و تنقید''،

''مضامین حیدری'' اور ''دیوان میر'' قابلِ ذکر ہیں۔ان کتب کے مطالعے سے اکبر حیدری کی تنقیدی بصیرت کا بخوبی پتہ چل سکتا ہے۔

1947 عیسوی کے بعد جن لوگوں نے تنقیدی کارنامے انجام دیئے اُن میں ایک نام ڈاکٹر برج پریمی کا بھی ہے۔اُن کی تحقیقی وتنقید کے حوالے سے کتابیں چھپ کر منظر عام پر آئی ہیں۔جن میں ''حروف جستجو''، ''جلوہ صدرنگ''، ''منٹو کتھا'' (سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے)، ''ذوق نظر''، ''جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشوونما'' چند تحریریں اور ''مباحث'' قابلِ ذکر ہیں۔اس کے علاوہ ڈاکٹر برج پریمی کے تنقیدی مضامین ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ڈاکٹر برج پریمی کی تنقیدی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر برج پریمی نے اردو زبان وادب کی تدریس اور تنقید کے سلسلے میں جو نمایاں کام انجام دیئے ہیں اُن کی اہمیت مسلم ہے۔ منٹو پر اُن کی کتاب ایک بڑے فن کار کو سمجھنے اور پرکھنے میں بہت مدد دیتی ہے''۔

ریاست کے نامور ناقدین میں ایک بلند قامت نام پروفیسر ڈاکٹر ظہور الدین کا ہے جو اپنے دور کے ناقدین میں امتیازی اہمیت کے حامل ہیں۔ تحقیق وتنقید کے شعبے میں موصوف کی جو کتابیں خاصی مشہور ہیں اُن میں ''تفکرات'' اور ''کہانی کا ارتقا'' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر موصوف کو تنقید کے فن پر پوری دسترس حاصل ہے۔''محروم کی شاعری'' میں اُنہوں نے تلوک چند محروم کی

شاعری کے اُن عناصر کا تنقیدی جائزہ لیا ہے جن پر اُن سے پہلے کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا۔ ''بیسویں صدی کے اردو ادب میں انگریزی رجحانات'' پروفیسر موصوف کی ایسی معرکتہ الآرا تصنیف ہے جن میں ادب کی غایت، کلاسکیت، رومانیت، مارکسیت، ترقی پسند ادب، تحلیل نفسی، وجودیت، اشاریت جیسے موضوعات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور ہر موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

محمد زماں آزردہ ریاست کے اہم محققین اور نقادوں میں شمار ہیں۔ مرزا سلامت علی دبیر ''حیات اور کارنامے'' اُن کا ایک قابلِ قدر مقالہ ہے۔ اس میں حیات دبیر کے ایسے گوشوں کو منظر عام پر لایا گیا ہے جو مدتوں سے تاریکیوں میں دفن تھے۔ پریم ناتھ در کی افسانہ نگاری، اقبال کا تصورِ عشق، کشمیر کے اردو ادیب، پریم چند کی حقیقت نگاری، تنہا انصاری، بحیثیت اردو شاعر اور ایسے متعدد مضامین ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں جن سے آزردہ کی تنقیدی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

پروفیسر کنول کرشن بالی کی تصنیف ''آزاد اور اردو شاعری'' اپنے موضوع کی مطابقت سے اچھی کتاب ہے، اس میں متعدد موضوعات پر تنقیدی مضامین شامل ہیں۔

اردو تنقید کی توسیع میں جموں اور کشمیر یونیورسٹی کے اردو شعبہ جات اور ریاستی کلچرل اکادمی کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے ''بازیافت'' اور دوسرے کتابی سلسلوں میں ریاستی کلچرل اکادمی کے ''شیرازہ'' اور ''ہمارا ادب''، محکمہ اطلاعات کے ''تعمیر'' کے ذریعے بھی برسوں سے اچھا کام ہو رہا

ہے۔ان رسالوں میں علمی اور تحقیقی مضامین کے علاوہ خاصی تعداد میں تنقیدی مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی میں تحقیق وتنقید کا کام ہوا ہے۔ان میں ڈاکٹر اسداللہ کامل کا''اردو میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب''،ڈاکٹر نذیر احمد ملک کا''اردو رسم الخط کا ارتقا اور جائزہ''،ڈاکٹر محبوبہ وانی کا''اردو اور کشمیری شاعری میں رومانی رجحانات''قابل ذکر ہیں۔اگرچہ یہ بنیادی تحقیقی مقالے ہیں لیکن ان میں تنقیدی مباحث ملتے ہیں۔ڈاکٹر قدوس جاوید کی کتاب''ادب اور سماجیات''میں بھی تنقیدی مباحث ملتے ہیں جن سے موضوع کی تنقیدی صلاحیتوں کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

جموں یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے زیرِ اہتمام بھی کئی گراں قدر مقالے تحقیق وتنقید کے حوالے سے لکھے گئے۔ڈاکٹر ظہور کا''بیسوی صدی کے اردو ادب پر انگریزی کے ادبی رجحانات''،ڈاکٹر منظر اعظمی مرحوم کا''اردو پریس میں تمثیل نگاری'' ڈاکٹر تہمینہ اختر کا''اردو ادب میں گاندھیائی اثرات''اور''علی عباس حسینی کا فن'' ڈاکٹر ضیاء الدین کا''خواجہ احمد عباس''،ڈاکٹر صابر مرازکا''صوبہ جموں کے اردو ادب میں علاقائی زبانوں کے اثرات''،سردار کرتار سنگھ کا''بیدی کا فن''ڈاکٹر سکھ جین کا ''جوش کی نثری خدمات''قابل ذکر ہیں۔یہ مقالات تنقید کے ضمن میں آتے ہیں جن سے اردو تنقید میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

نئی نسل سے تعلق رکھنے والے بعض نوجوان بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں، جنہوں نے تنقید کے میدان میں قدم رکھا ہے۔ان میں ڈاکٹر اسد اللہ وانی، ڈاکٹر مجید مضمر، ڈاکٹر بشیر احمد نحوی، ڈاکٹر ضیاء الدین، پریمی رومانی، یوسف سلیم اور

منیب الرحمٰن اہم نام ہیں۔

ڈاکٹر اسد اللہ وانی کی تصانیف ، ''شیخ العالم ایک مطالعہ'' اور ''اقبالیات آزاد'' تنقیدی حوالے سے اچھی کتابیں ہیں۔ ''شیخ العالم ایک مطالعہ'' میں شیخ العالم کی حیات و خدمات کا تنقیدی جائیزہ لیا گیا ہے۔ اسی طرح ''اقبالیات آزاد'' میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی ادبی خدمات کا بھرپور جائیزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نصرت چودھری کی تصانیف ''فیض کی شاعری ایک مطالعہ''، ''فیض احمد فیض''، ''روایت اور انفرادیت''، میں فیض کی شاعری اور انفرادیت کا تجزیہ ہے، جس سے جدید تنقید نگاری میں اضافہ ہوا ہے۔

اردو تنقید نگاری کا ذکر کرتے ہوئے ریاست کی ادبی انجمنوں اور رسائل کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلے میں جموں کی بزم ادب شعبہ اردو، جموں و کشمیر اردو فورم، انجمن فروغ اردو، انجمن ترقی پسند مصنفین ، جموں سے نکلنے والے رسائل نوری چھم، دھنک ، دیہات سدھار قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ رسائل اور انجمنوں سے لوگوں میں تحقیق و تنقید کی ایک تحریک پیدا ہوئی۔ پروگراموں میں جو تنقیدی مقالات پڑھے جاتے ہیں وہ ان رسائل میں چھپ کر منظرِ عام پر آئے، جن سے اردو تنقید میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد اقبال کے شیدائی ہیں۔ آزاد کا وطن ثانی جموں ہے۔ اُن کی اہم تصانیف میں ''اقبال اور کشمیر''، اقبال اور مغربی مفکرین'' ''اقبال اور اس کا عہد''، ''اقبال کی کہانی''، ''نشان منزل''، ''ہندوستان میں اقبالیات''، ''وطن میں اجنبی''، ''اقبال زندگی ،شخصیت اور شاعری''، قابلِ ذکر

ہیں۔ آزاد نے اقبال کے اُن پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے جو گذشتہ تاریکی میں پڑے ہوئے تھے۔ عبدالقادر سروری کی تصانیف ''کشمیری میں فارسی کی تاریخ'' اور ''کشمیر میں اردو'' اپنی امتیازی اہمیت کی حامل ہے۔

1947 عیسوی کے بعد ہی ریاست میں علوم وفنون اور شعر وادب کی ترقی و تعمیر کے لئے ایک نیا جذبہ جاگ اُٹھا ہے۔ ریاستی زبانوں کشمیری اور ڈوگری کے ساتھ ساتھ اردو کی ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوا ہے، جو اس کے روشن مستقبل کے امکانات واضح کر رہا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اردو کو یہاں سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ سرینگر اور جموں میں ادبی اجتماعات کا اہتمام کیا جاتا ہے اور ہندوستان کے گوشے گوشے سے سرکردہ ادیب اور شاعر مدعو کئے جاتے ہیں۔ ہمیں دوسری مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کی ترقی کے لئے مصروف جدوجہد کرنی ہے۔

موجودہ دور کا اردو ادب:

کشمیر جس خون آشام دور سے گذرا ہے اس کی بازگشت موجودہ دور کے اُردو ادب میں موجود ہے۔ اس میں کشمیریوں کے ولولوں، خوابوں، حسرتوں اور دُکھوں کی ترجمانی، قلب مجروع، چہرے پژمردہ، خوف وہراس کا ماحول ہے۔ چند شعر غلام محمد طاؤس کی ایک نظم سے:

مرغزاروں، کوہساروں کی نہ پہلی شان ہے

ان بہاروں، آبشاروں میں نہ کوئی جان ہے

پھول کھلتے ہیں ابھی لیکن چمن ویران ہے

صحنِ گلشن جس کو سمجھے ہو وہ ایک شمشان ہے

☆

چاک ہے دِل، ناک میں دم ہے جوان و پیر کا

اک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا!

ماحول، اقدار اور حالات کی تبدیلی کے پہلو بہ پہلو ادب اور خاص کر شعروشاعری کے مزاج اسالیب اور اصناف وغیرہ میں بھی تبدیلی ایک فطری امر ہے اور شاعری مختلف مراحل سے گذر کر ہر دور میں نئی جہتوں کا سامنا کرتی رہتی ہے۔ اس طرح پرانے اور نئے میں فرق کرنا اگرچہ مشکل ہے۔ اس کے باوجود کچھ تبدیلیاں راہ پا کر وجود منواتی ہیں اور اس میں صرف پرانے اور نئے شعرا کے حالات و ماحول کا ہی دخل نہیں بلکہ ان کے اپنے مزاج احساسات اور حالات سے اثر پذیری اور اپنے مخصوص انداز اظہار کا بھی دخل ہوتا ہے اور نئے تخلیقی تجربات بھی کلام میں ایک نیا حُسن پیدا کرنے کے موجب ہوتے ہیں۔ کئی لوگ ڈکشن میں تبدیلی لاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ خیالات کے ساتھ آہنگ کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ کبھی کسی نئی تحریک یا ماحول میں خاص ذہنوں کو متاثر کرنے والی تبدیلی کا اثر بھی شعرا میں زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ ان باتوں کے پیشِ نظر کشمیر میں اردو شعرا کی ایک نئی کھیپ تیار ہوئی۔ جن میں کچھ کم لیکن کچھ بہت زیادہ اپنے جدت مواد و اظہار کے نمونے پیش کرتے ہیں۔

رفیق راز: اردو اور کشمیری دونوں میں کامیابی کے ساتھ غزل لکھتے ہیں۔ ان کا رنگ اردو میں بھی اور کشمیری میں بھی دوسرے شعرا سے بالکل منفرد ہے۔ ان کی تفصیلات کا دائیرہ بہت وسیع ہے۔ ان کے تجربات کا عمل روان دوان ہے اور وہ حسیاتی بھی ہے اور بصری بھی۔ فارسی الفاظ کے ساتھ وابستگی سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں اور بندشِ الفاظ پر بھی توجہ خوب ہے۔ فکر واحساس کی تازگی نمایاں ہے اور ان کے تجربات میں تہہ داری ہے۔ 1960 عیسوی سے پہلے سے لکھ رہے ہیں۔ کلچرل اکادمی سرینگر کے اردو رسالہ ''شیرازہ'' میں بھی آپ کا کلام چھپا ہے اور ہندوستان کے کئی کثیر الاشاعت معیاری رسائل میں بشمول ماہنامہ ''شب خون'' اُن کا کلام وقتاً فوقتاً چھپتا رہتا ہے۔ ان کے ابھی تک پانچ شعری مجموعے اور ایک نثری مجموعہ منظرِ عام پر آچکا ہے جن میں اردو کے دو شعری مجموعے بھی شامل ہیں۔ جن کا نام ''مشراق'' اور ''نخلِ آب'' ہیں۔ رفیق رازؔ کو ساہتیہ اکادمی اور ریاستی کلچرل اکیڈیمی دونوں اعزازات سے نوزا گیا ہیں۔

سیلاب ہفت رنگ مری خامشی میں ہے
سہمے ہوئے سکوت کی چھکار مجھ میں ہے

نذیر آزادؔ: ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جس کی فضا ابتداء سے ہی شاعرانہ اور علم وآگہی کے نور سے کافی حد تک آرستہ رہی ہے۔ نئے شعرا میں ان کا ایک اہم مقام ہے۔ ایک مجموعہ ''نغمہ زنجیر پا'' کے نام سے 1992 عیسوی میں

چھپا ہے۔ وہ غزلیں زیادہ لکھتے ہیں اور نظموں میں بھی کسی سے پیچھے نہیں اور وہ 1960 عیسوی کے بعد جب تک کہ ترقی پسندی اور مقصدیت کا شور شر ہر طرف سے سُنا جارہا تھا اپنی مخصوص آواز ادا لے کر میدان میں اترنے والوں میں ماضی قریب سے تعلق رکھنے والے معروف مشق سخن شاعر کی صورت میں نمودار ہوئے۔ وہ روایت سے ناآشنا نہیں اور موجودہ زمانے کی کربنا کیوں اور انتشار سے بھی بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ اردو زبان کی شعری دنیا سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ پروفیسر حامدی کاشمیری کا یہ اقتباس نذیر آزاد کے حق میں کافی ہے:

> ''خوشی اس بات کی ہے کہ نذیر آزاد روایت کا صحت مند شعور رکھتے ہیں اور ساتھ ہی وہ الفاظ سے پیکر تراشی کا کام لیتے ہیں۔ یہ سنگ سے آئینہ سازی کا عمل ہے۔ نذیر آزاد آئینہ سازی کے اس عمل میں تن دہی سے مصروف ہیں۔ ان کے کلام میں تازگی بھی ہے اور کشش بھی''۔

اپنی ناگفتہ کہانی کا کوئی لمحہ ہوں میں
تونے کیوں سمجھا کہ تیرے واسطے ٹھہرا ہوں میں

سیدہ نسرین نقاش: نسرین نقاش کا کلام زبان وبیاں اور لب ولہجہ پیش نظر رکھتے ہوئے حسین اور شوخ الفاظ سے تعمیر ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایک کامیاب شاعرہ ہے جو اپنے کلام میں اپنے ذاتی تجربات اور واردات سے

حاصل شدہ احساسات وخیالات اور جذبات کو حسین و دِل کش رنگ میں پیش کرتی ہے۔ جب اُن کا مجموعہ کلام ''دشتِ تنہائی'' سامنے آیا تو ان کی شعری خوبیوں اور اہمیتوں کو دیکھ کر قارئین حیران رہ گئے۔ نسرین بنیادی طور پر غزل کی شاعرہ ہیں۔ کچھ نظمیں اور گیت بھی لکھے ہیں۔

شبنم عشائی : کی شاعرانہ حیثیت 1993 عیسوی میں سامنے آ گئی۔ جب آپ کی ایک چھوٹی سی کتاب ''اکیلی'' قارئین کی توجہ کا مرکز رہی۔ کتاب کے نام سے ہی ''اکیلی'' کی شاعرہ کا حساس اور کئی ذہنی اور قلبی حادثات سے دو چار ذہن کھُل کر سامنے آتا ہے۔ اُن کی شاعری میں غم واندوہ کا ایک دلچسپ فطری رقص ہے۔ یہاں آرزؤں کے بازار سجے سجائے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے سفر میں کسی کو شریک کرنے کا شدید غم نہیں کرتیں بلکہ اکیلی جلتی ہوئی ہیش آنے والے حادثات کو نقش بر سنگ کرتی چلی جاتی ہے اور صبر و رضا کا پیکر بن کر حوصلہ مندی کے ساتھ اگلی منزل کی طرف گامزن ہیں۔

شفق سوپوری: 1959 عیسوی میں عبدالقیوم خطائی کا تعلق تاریخی قصبہ سوپور کشمیر کے ایک روایتی صوفی گھرانے سے ہے۔ وہ لگ بھگ بیس برس سے لکھ رہے ہیں اور اُن کی نگارشات افسانے، غزلیں، نظمیں اور تبصرے مختلف رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔ زیادہ تر غزلیں اور نظمیں لکھتے ہیں۔

1991 عیسوی میں غزلوں کا ایک مجموعہ چھپ گیا ہے۔ ''موسیقی شاعری اور لسانیات'' کے عنوان سے ان کی تنقیدی کتاب 2001 عیسوی میں شائع ہوئی۔ ان کے شعری مجموعے ''دشت میں دور کہیں'' 2007 عیسوی کو ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے اُنہیں انعام سے نوازا ہیں۔ موسیقی سے اُنہیں لگاوٗ ہے اور اس فن پر وہ ماہرانہ اور عالمانہ مہارت رکھتے ہیں۔ اس لئے اس موضوع پر ''مخزن موسیقی 2009 عیسوی اور اردو غزل اور ہندوستانی موسیقی'' 2010 عیسوی میں کتابیں رقم کیں۔ اس کے علاوہ شفق سوپوریؔ میڈیا کے لئے بھی لکھتے ہیں اور طنز و مزاح کا ایک کالم بھی ایک مقامی اخبار کے لئے لکھتے ہیں۔ شاعری کے ساتھ ساتھ انہیں تخلیقی نثر پر بھی کافی قدرت حاصل ہے اور وہ لفظوں کی ترتیب سازی کے گُر سے فن کارانہ مہارت رکھتے ہیں، جو کہ ''طنز و مزاح'' کے فن کے لئے از حد ضروری ہے۔ اصل میں فن شاعری پر اُنہیں استادانہ حیثیت حاصل ہے اور وہ علم عروض و دیگر شعری صنعتوں کے برتنے کا ہمیشہ خاص خیال اپنی شاعری میں رکھتے ہیں۔

خوشبو خواب میں تھی پہرے پہ پنکھڑی تھی
میرے خیال میں بھی شہزادی سو رہی تھی

اُن کے پاس اپنے داخلی تجربات کو اپنی پوری قدرت اور تاثیر کے ساتھ قارئین کے سامنے ایک نئی اور معتبر آواز کے ساتھ پیش کرنے کے لئے الفاظ و محاوارت کا ایک خزانہ ہے۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیریؔ شفق سوپوری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ کشمیر کی نئی نسلوں میں شفق سوپوریؔ نہ

صرف نسبتاً ''گہرے تخلیقی شعور کا احساس دلاتے ہیں بلکہ وہ لفظ و پیکر کی فراوانی اور تازہ کاری کا احساس بھی دلاتے ہیں۔ اُن کی شعری فضا میں حد بندی، یک رنگی اور گھٹن کا احساس نہیں ہوتا ہے، بلکہ آزادی، توسیع اور رنگا رنگی کا احساس ہوتا ہے اور یہ خاصیت نئے شعرا میں کم ملتی ہے''۔

ڈاکٹر فرید پربتی: (1961 عیسوی تا 2011 عیسوی) عصری ادبی منظرنامے پر جو روشن اور تابناک ستارے اپنی جگہ بنانے میں کامیاب وکامران ہوئے۔ اُن میں فرید پربتی ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ اُن کی ہمہ جہت شخصیت کے پہلوؤں کا دائرہ کار عملی وملی سطح پر وسیع معنوں میں پھیلا ہوا ہے۔ کبھی وہ شاعر بن کر ابھرے تو کبھی محقق ونقاد کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ کبھی عروض واصطلاح کی شناور بن کر تو کبھی خالص رباعی گو شاعر بن کر سامنے آتے ہیں غرض جس میدان میں بھی قدم رکھتے ہیں تو اس کا پامروی سے پامال کر کے دم لیتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں قدیم و جدید کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ اُنہوں نے عمیق مطالعے اور گہرے مشاہدے سے ایک ایسی شعری دنیا تخلیق کی ہے، جس کی مغیاتی اور جمالیاتی ترسیل عام قاری کیلئے بھی تسلی اور تشفی بخش ہے۔ وہ زبان وبیان پر قدرت رکھنے کے باوجود سہل اور آسان پیرایئے میں اپنی داخلی وخارجی احساسات و تجربات کو شعری پیکر دینے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ یہی خاصیت فرید پربتی کے ہم عصر شعراء سے ممتاز و

ممیّز کرتی ہیں۔ اُنھوں نے روایتی اسلوب کو نیا آہنگ و پیراہن بخش بنا کر ایک نئ ڈگر قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُنھوں نے ذہنی اختراع اور تخلیقی صلاحیت کو بروئے کار لا کر رباعی جیسی مشکل صنفِ سخن کو منہ نہیں لگایا بلکہ باقاعدہ مردِ میدان کی حیثیت اختیار کر کے رباعی کے نقاد کے طور پر بھی ایک شناخت بنالی ہے۔

پرفیسر حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

''فرید پربتی نہ صرف موجودہ بحرانی صورتحال کا احساس رکھتے ہیں بلکہ وہ الفاظ کے ایمائی امکانات کی کھوج لگانے کی ضرورت کا بھی شعور رکھتے ہیں۔ یہ شعور احساس اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب شاعر زندگی اور حقیقت کے بارے میں ایک انفرادی نقطہ نظر قائم کرتا ہے۔ ظاہر ہے اِسی صورت میں اس کے فکر و احساس کا انداز بدل جاتا ہے۔ یہ عمومیت کے بجائے اختصاصی ہونے پر اصرار کرتا ہے، نتیجے میں مروجہ اسالیب اظہار کی ایک نئ تشکیل کی ضرورت آن پڑتی ہے۔ فرید پربتی کی جو غزلیں میری نظر سے گزری، اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حقیقت کو اپنی نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں اور پھر اپنے مشاہدات و احساسات کو اپنے اسلوب میں پیش کرنا چاہتے ہیں یہ دراصل اپنے وجود سے متعارف ہونے کا عمل ہے''۔

فرید پربتی کے اظہار میں ایک بے تکلفی کا جو احساس ملتا ہے اُس سے اندازہ

ہوتا ہے کہ رباعی اُن کے مزاج کوراس آتی ہے اور وہ اس سنگ صفت کو پگھلانے اور اپنی پسند کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔فریدؔ نے کثرت سے رباعیاں لکھی ہیں۔وہ رباعی کے فن کی رعایتیں ملحوظ رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ان کی رباعیوں میں کہیں کہیں نئے رنگ اور نئے آہنگ اور نئے احساس کی چمک نظر آتی ہے۔

فرید پربتیؔ کی شعری جمالیات کا نکتہ حوالہ اور محور بالعموم وادیٔ کشمیر کی زندگی ہے۔اس کے دریا، چمن زار، سرسبز ماحول اور احساسی کیفیات کا حامل گردوپیش کا منظرنامہ ہے جو شاعر کے وجود کے رگ وریشے میں گرم خون کی مانند گردش کرتا ہے۔ جمالیاتی شعری روایت سے آگہی کے ساتھ اُنہوں نے اپنی فطرت کے عین مطابق ملک کی عام تہذیبی روحانی اور انسانی روایات واقدار کا بھی گہرا عرفان حاصل کیا ہے،جس کے سبب ان کے ہاں تہذیب نفس اور تزکیہ نفس کے مرحلے آسان ہوتے ہیں۔ان کے ہاں کسی نوع کی بغاوت ،نفرت یا غصے کا سراغ نہیں ملتا۔ان کے ہاں ایک دانشورانہ استہفام اور ایک مسلسل خزینہ آہنگ ملتا ہے جو شاعر کی دردمند روح، اس کی روحانی سوز وتپش اور زخموں کا پتہ دیتا ہے۔

ابر تر: 1987 عیسوی، آب نیساں 1992 عیسوی، اثبات 1995 عیسوی، فریدنامہ 2003 عیسوی فرید پربتیؔ کی شاعرانہ ہنرمندی کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے کافی ہیں۔''فریدنامہ'' رباعیات کا مجموعہ ہے۔پھر بھی کہا جاسکتا ہے کہ فرید پربتیؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل جیسا کہ معلوم ہے روایات اور اجتہادات کے تمام تر مرحلوں سے گزر کر اپنی آج کی جدید تر صورت میں معاشرتی اور ثقافتی

مدو جزر کی مختلف النوع لہروں اور دائروں کے ساتھ سامنے آنے والی وہ صنف سخن ہے جو شعر بہ شعر اردو شاعری کے لسانی، مغیاتی اور جمالیاتی نظام کے امکانات کو زیادہ سے زیادہ روشن اور وسیع کر رہی ہے۔ چنانچہ فرید پربتی کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ مرحوم فرید پربتی کی شاعری، اردو شاعری کی مضبوط و مستحکم روایت پر اپنی اساس رکھتی ہے۔

رباعی کے تاریخی، فنی اور شعری مضمرات کے غیر معمولی شعور کے ساتھ رباعی کو برتنے کی جیسی فطری اور ماہرانہ مثالیں مرحوم فرید پربتی کے مجموعہ رباعیات ''فرید نامہ'' میں ملتی ہیں ان کی بنا پر یقین اُن کا فکری تناظر بھی وسیع ہے۔ اُنہوں نے ''اثبات'' کے ذریعے عشق و عرفان کی بہت سی منزلوں اور مقامات کو طے کیا ہے۔ اُن کی شاعری میں اثبات کا جو فکری اور جمالیات تناظر سامنے آیا ہے، وہ عام شاعروں سے مختلف ہے۔ اس اثبات میں نفی کی وہ منزل بھی روشن ہے جو انکشاتِ ذات کا وسیلہ بنتی ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جس کو طے کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس غروب میں طلوع بھی مضمر ہے اور اسی طلوع میں غروب بھی یہ احساس فرید پربتی کو بھی ہے کہ فنا بھی بقا ہے اور بقا میں فنایت۔

اُن کے کلام میں فنی محاسن کے علاوہ جو موضوعات و محسوسات ہیں اُن میں کشمیر کی روماں پرور فضا سے اخذ کردہ حسن و عشق کے اظہاریئے بھی ہیں۔ کشمیر پر طاری سیاست کے عذاب ناک سایوں کا بیان بھی ہے اور دیگر عمومی عصری علائق بھی۔ وہ نہ صرف غم جانان میں نالہ وفغان کرتے ہیں بلکہ غمِ دوران کو بھی سینے سے

لگائے پھرتے ہیں۔ اُن کے یہاں عصری آگہی بھی ملتی ہے اور حالتِ حاضرہ کا معروضی تجزیہ بھی۔ پچھلے بیس برسوں سے کشمیر جن حالات سے گزر رہا ہے، شاعر نے اُن حالات کی بے ساختہ منظر کشی اپنی دو نظموں ''نروان'' اور ''شہرِ آشوب'' میں کی ہے۔

کھو گئے گاڑھے دھویں میں شہر کے منظر تمام
اک پرندہ رہ گیا آہ و فغاں کرتا ہوا
رونق یہ میرے شہر کی اب لے گیا کون
ایک اک سڑک خموش ہے ایک اک مکان بند
اس درجہ گھٹ گیا ہے مکینوں میں اعتماد
کرتے ہیں شام ہونے سے پہلے مکان بند

پروفیسر قاضی عبدالرحمٰن ہاشمی کا ماننا ہے کہ فرید پربتی نے کشمیر میں رہتے ہوئے یہاں کے سیاسی وسماجی منظر نامے کا حصہ ہوتے ہوئے بھی خود کو صرف کشمیر کے حد تک محدود رکھنا پسند نہیں کیا۔ اس کے برعکس وہ اپنی شاخت پورے ملک بلکہ وسیع کائنات اور اس کے لامحدود افکار وعلائق سے قائم نظر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے یہاں ایک آفاقی شعری تناظر کی بھی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ اُن کی شاعری اظہار ذات کی شاعری ہے۔ اُن کی غزلیں اور رباعیاں اپنے مخصوص لہجے اور منفرد اسلوب کی وجہ سے دور سے پہچان جاسکتی ہیں۔ فرید پربتی کا تعلق اگرچہ جدید ترنسل سے ہے مگر اُن کو اردو کی کلاسیکی شاعری کا عرفان حاصل ہے۔ اُن کی شاعری مسرت سے شروع ہوتی ہے اور بصیرت پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ کہنا حق بجانب ہے کہ جدید

ترنسل کے جن اردو شعرا نے غزل کے جسم سے بوسیدہ لباس کو اُتار پھینکا ہے اور جن کے ہاں نئی سوچ، نئے شعور اور نئے تیور نظر آتے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر فرید پربتی کا نام بھی شامل ہے اور اہمیت کا حامل ہے۔ ''گفتگو چاند'' سے اُن کی نئی شعری تخلیق ہے اور غزلوں پر مشتمل ہے۔ اُن کی غزلیں خیال، موضوع اور لب ولہجہ کے پس منظر میں بے پناہ معنویت رکھتی ہے۔ وہ اپنے فن اور ترقی کے عروج پر تھے کہ اچانک موت نے ان کے ہاتھ سے قلم چھین کر اُنہیں ڈھیر ساری مٹی کے نیچے ملا دیا۔

ترنم ریاض: (1923 عیسوی) اردو فکشن اور شاعری میں ترنم ریاض ایک اہم نام ہے۔ اُن کی تمام تر نگارشات ملکی سطح پر سرکاری وغیرہ سرکاری اداروں سے بڑے پیمانے پر اہتمام کے ساتھ چھپتی ہیں۔ ''یہ تنگ زمین''، ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی''، ''میرا رخت سفر''، ''یمبر زل'' جیسے افسانوی مجموعوں کے ساتھ ساتھ ''پرانی کتابوں کی خوشبو''، ''چشم صحرا ہماری آنکھ''، اُن کے چند شعری مجموعے ہیں۔ ''مورتی، فریب''، خط، گل، ''برف آشنا پرندے''، جسے ناول بھی لکھے۔ بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب، ''چشمِ نقشِ قدم'' اُن کی تنقیدی کتابیں ہیں۔

یو پی اردو اکادمی، دہلی اور اردو اکادمی، جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی، ادیب انٹرنیشنل ایوارڈ کے ساتھ ساتھ اُنہیں اور بھی بہت سارے اعزازات سے نوازا گیا، اردو کے مابعد جدید میں اُن کا خاص مقام ہے۔ اُن کی تحریروں میں ہمیں اپنے وطن

کی حالت زار جگہ جگہ دیکھنے کو ملتی ہے

ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی: علامہ اقبال اور اقبال انسٹیچوٹ کشمیر یونیوسٹی اُن کا ذہنی مرکز ہے۔ اُن کا 1963 عیسوی تحقیق مقالہ ''فلسفہ اقبال میں اجتہاد اہمیت، نظریہ اجتہاد اور اقبال'' کے عنوان سے 2003 عیسوی میں شائع ہوا۔ اس میں اُنہوں نے علامہ کا نظریہ اجتہاد اور مختلف مذہبی تحریکوں کو بھی زیر بحث لایا ہے۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے اقبال اور اقبالیات کے موضوع پر کئی کتابیں طبع کی ہیں۔ مثلاً 2004 عیسوی ''اقبال عشق رسول ﷺ کے آئینے میں'' اور نالہ نیم شب 2006 عیسوی میں لکھی ہیں۔

شفیع احمد: اگرچہ شفیع احمد کا تعلق انجینئر نگ سے ہے لیکن ان کا مشغلہ ادب ہے۔ 2003 عیسوی میں اُن کے انشائیوں کا ایک مجموعہ ''لو آج ہم بھی صاحب کتاب ہوگئے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ان کے انشائیوں میں زمانے کی کج روی، ہمارے سیاسی نظام کا کھوکھلا پن اور سماجی حالات پر عام فہم زبان میں طنز کے تیر برسائے گئے ہیں۔

اشرف عادل: 1966 عیسوی کشمیر کے ابھرتے ہوئے ایک ڈرامہ نگار اور شاعر کا نام ہے۔ لذت گریہ 2002 عیسوی کے عنوان سے اُن کا شعری مجموعہ اور ''تمثیل داغ'' اُن کا طویل ریڈیائی ڈرامہ شائع ہوا۔ اُنہوں نے ریڈیو اور ٹی وی کے لئے سینکڑوں ڈرامے لکھے اور وہ اکثر مشاعروں میں شرکت کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری : اب تک اردو میں کئی

کتابیں لکھی ہیں۔ ادبی تحقیق وتنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ تعلیم کے موضوع پر کافی کام کیا ہے۔ اردو اُن کی زندگی ہے اور یہی اُن کا کام ہے۔ ''روداد اردو'' کی کتاب کا بیشتر مواد زور صاحب نے لداخ میں تیار کر لیا تھا۔ درس وتدریس کے سلسلے میں لداخ میں اُن کی تخلیقاتی سرگرمی پونے دو برس رہی۔ وہاں ایک نئے کلچر کا مشاہدہ کیا، اپنی پرانی نگارشات کی نوک پلک سنوارتا رہا۔ برسوں سے تلاش و تیار کیا ہوا مواد جمع کر کے ''رودادِ اُردو'' کی ادبی تاریخ ہمارے سامنے رکھی۔ اس کتاب میں اردو کی مختلف تحریکوں، رجحانوں اور دبستانوں کی سیر کر کے مصنف اردو کے منجملہ اصناف ادب پر الگ الگ بات کی ہے۔ اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اردو ہم سبھوں کی زبان ہے۔ زور صاحب کی اپنی ایک الگ دنیا آباد ہے۔ جس میں صرف علم وادب ہی نظر آتا ہے۔ وہ گھر میں ہوں یا گھر سے باہر، بس چراغ سے چراغ جلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ''دبستانِ جموں وکشمیر میں اردو 2012 کتابچہ لکھنے کا مقصد اُن کا یہ تھا کہ ہمارا یہ اردو دبستان ریاست سے باہر بھی متعارف ہو، تاکہ ہمارے اردو ادیبوں کو پوری اردو دنیا میں پزیرآئی مل سکے۔ کتابچہ دبستان جموں وکشمیر کے بارویں باب میں ڈاکٹر زور نے ''جموں وکشمیر میں اردو کے لئے تیس نکاتی پروگرام'' کے بارے میں جو خیالات پیش کئے ہیں، قابلِ تحسین ہیں۔

اُن کے تحقیق وتنقیدی مضامین کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ زور صاحب عنقریب سمندر کی طرح ادبی دنیا میں پھیل جائے گا۔

ڈاکٹر اشوک پٹواری:(1945 عیسوی) معروف فکشن اور ڈراما نگار وریندر پٹواری کے برادر اصغر ہیں ''کچھ لمحے کے کچھ سائے'' کے عنوان سے اپنا افسانوی مجموعہ شائع کیا۔ پیشہ سے ڈاکٹر ہیں اس لئے افسانوں میں وہ اپنے پیشے سے متعلق مسائل کو اُبھارتے ہیں۔

دیپک کنول:(1969 عیسوی) فکشن نگار ہیں۔ بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں اپنا ادبی سفر شروع کر کے ناول کشمکش 1971 عیسوی، تماشہ 1980 عیسوی، ترنگ 1984 عیسوی، نیا سفر 1985 عیسوی کے عنوان سے لکھے۔ کشمیر سے ہجرت کر کے ممبئ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد ''ہم تیرے ہو گئے'' 2001 عیسوی میں برگ کی آگ، 2009 عیسوی اور افسانوئی مجموعہ ''پمپوش'' 2011 عیسوی میں جیسے مجموعے شائع کروایئے۔

اُن کے افسانے امن سلامتی، آپسی بھائی چارے، پیار محبت گندی سیاست نے نفرت کا پیغام دیتے ہیں۔

راجہ نذر بونیاری:(1969 عیسوی) کالم نویس اور افسانہ نگار ہیں۔ ''دوسرا آدمی'' 1971 عیسوی اور ''یہ کس کی لاش ہے میرے کفن میں'' 2008 عیسوی اُن کیے افسانوی مجموعے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں کشمیر کی چیخ و پکار سنائی دیتی ہے۔

دیپک بدکی (1950 عیسوی) نے ادھورے چہرے (افسانوی مجموعہ) چنار کے پنچے 2005 عیسوی، زیبرا کراسنگ پھر کھڑا آدم 2007 عیسوی، عصری تحریریں 2006 عیسوی، عصری شعور 2009 عیسوی جیسی تصانیف منظر عام پر لا کر ادبی دنیا میں ایک اہم مقام پا کر کافی اعزازات پالئے۔ ان کے فن کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے بے مطلب قصے رقم نہیں کئے اور نہ داستان طرازی بلکہ اپنی صاف اور سلیس زبان میں اپنے افسانوں میں حُسن نزاکت پیدا کی ہے۔

مشتاق مہدی: (1952 عیسوی) اردو کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''مٹی کے دیئے'' کے عنوان سے چھپا۔ ان کا دوسرا مجموعہ ''آنگن میں وہ'' 2010 عیسوی میں منظرِ عام پر آ گیا۔ وہ افسانہ نگاری کی طرف بڑی سنجیدگی سے توجہ دے کر علامتوں میں اپنا اظہار کرتے ہیں اور ہمارے خوش آئیندہ مستقبل کے لئے فکر مند رہتے ہیں۔

ڈاکٹر بریمی رومانی: (1953 عیسوی) ڈاکٹر برج پریمی وادیٔ کشمیر میں اردو کے حوالے سے اہم نام ہے۔ اولین منٹو شناسوں میں اُن کا نام آتا ہے۔ ڈاکٹر رومانی نے اپنا ادبی سفر صرف پندرہ برس کی ہی عمر میں شروع کیا۔ اُن کی ابتدائی تحریریں ماہنامہ ''پیام تعلیم'' نئی دہلی میں شائع ہوئیں۔ پھر اردو میں اعلیٰ تعلیم شروع ہوتے ہی پریمی صاحب ادبی دنیا میں چھا گئے۔

1980 عیسوی سے 2000 عیسوی تک انہوں نے ''جدید اردو شاعری چند مطالعے'' اوراق، انتخاب مضامین، ردِ عمل، تاثرات جیسی کتابیں متفرق موضوعات پر لکھی ہیں۔ اکیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی رومانی نے اپنا شعری مجموعہ ''سنگ میل'' کے عنوان سے شائع کیا۔ اس کے بعد ''اقبال اور جدید شاعری'' میزان، مظہر امام حیات اور فن، بھگوان گوپی ناتھ، عقائد و افکار، اعتراف، توازن جیسی بڑی سنجیدہ تحقیقی و تنقیدی کتابیں لکھ کر قارئین سے مقبولیت حاصل کر لی۔ کشمیریات کے موضوع پر ڈاکٹر رومانی کے مقالے ہمیشہ تحقیق نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ادب کا کوئی بھی گوشہ ان سے چھوٹتا نہیں، البتہ جدید شاعری میں وہ زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر منصور احمد منصور:(1957 عیسوی) شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے صدر ہیں۔ ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے کی۔ کالم نویسی، انشایہ نگاری اور افسانہ نویسی کے ساتھ وہ فکشن کے ایک مستند نقاد مانے جاتے ہیں۔ اُنکا تحقیقی مقالہ ''اردو افسانے میں مشترکہ تہذیبی عناصر'' شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی میں لکھے گئے، چند اہم مقالوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر منصور نے یہ مقالہ 1988 عیسوی میں فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی میں مالی امداد سے شائع کیا۔ اُنہوں نے کشمیر، خواب سراب، گرداب (انشائیوں اور خاکوں کا مجموعہ) عذابوں کی بستی (افسانوی مجموعہ) موج قلم (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) جیسی بہترین کتابیں منظر

عام پر لا کر قارین کو سنجیدگی اور متانت کی طرف لے گیا۔ اُن کا طرز بیان بالکل نرالا ہے۔ وہ اپنے انشائیوں اور مضامین زیادہ تر اپنی یادوں کے حصار میں مقید رہتے ہیں، جس کی وجہ سے ان پر مقامیت کا اثر غالب رہتا ہے اور اس طرح اُن کی تحریر رشید احمد صدیقی کی طرح ایک مخصوص ماحول کے اردگرد گھوم کر آفاقیت سے دور ہوتی چلی جاتی ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ موصوف موجودہ دور کے درد و کرب کو بڑے تمثیلی انداز میں ہنستے ہنساتے بیان کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرشید:(1959 عیسوی) کشمیر میں اردو کے ایک فعال، نڈر، تیز طراز شخص کا نام ہے۔ وہ برسوں سے ریاست کے مختلف کالجوں میں درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں اور انتظامی سطح پر بھی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ریجنل ڈائریکٹر رہے۔ اُنہوں نے درسی ڈھنگ کی کتابیں لکھ کر شہرت پائی ہے۔ فکشن کی تنقید کی طرف بڑی سنجیدگی سے توجہ دینے لگے۔ اُن کی کئی کتابیں منظر عام پر آکر طلباء، عام قارئین کے ساتھ ساتھ ادبی حلقوں میں بھی لوہا منوا چکی ہے۔ اُنہوں نے مختلف سمیناروں، ادبی پروگراموں اور تربیتی کورسوں میں شرکت بھی کی ہے۔ اردو افسانے میں جنسی نفسیات، ورق ورق ادب، اردو کہانی میں وطنیت اور اتحاد، اردو افسانے میں جنس نگاری، حامدی کاشمیری کی افسانہ نگاری ان کی چند اہم کتابیں ہیں۔ اُن کا ''وژن'' اور ''مشن'' شیشے کی طرح صاف اور پاک ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں دوسروں سے ہٹ کر لکھتے ہیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ وہ

فارسی ادبیات میں ایم اے گولڈ میڈلسٹ ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ فارسی ادبیات سے براہِ راست استفادہ کر کے اپنی تحریروں سے ایک انوکھی فضا پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ کسی کی اندھی تقلید کے قائل نہیں ہے بلکہ خود نئے نئے اور منفرد عنوانات کے تحت مدلّل ادبی اور علمی مباحث پیش کرتے ہیں۔

انہوں نے ''اردو کہانی میں وطنیت اور اتحاد'' موضوع پر کتاب 2011 عیسوی میں لکھی۔ جو اردو ادب میں ایک بڑا سرمایہ ہے۔ ''کشمیر کی ایک قدآور شخصیت، پروفیسر حامدی کاشمیریؔ کی افسانہ نگاری'' 2012 عیسوی میں اُن کی یہ کتاب منظر عام پر آئی۔

بشیر شاہ: (1943 عیسوی تا 2011) معروف فکشن رائیٹر اور براڈ کاسٹر اور نور شاہ کے بھائی ہیں۔ افسانہ، ڈرامہ اور ریڈیائی فیچر لکھتے تھے۔ ''شب سمندر میں'' ان کا افسانوی مجموعہ 2011 عیسوی میں شائع ہوا۔

حاجی فیروز الدین بیگ: کا تعلق پہاڑی طبقہ سے ہے۔ دیوان فیروز 2009 عیسوی میں شعری مجموعہ، آواز حق 2012 عیسوی شعری مجموعہ، اور یادیں (نثر) اُن کی یہ تین کتابیں اردو میں اُن کے انتقال کے بعد زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔

نذیر احمد نذیر: (1947 عیسوی) یادوں کے سائے

(افسانوی مجموعہ) اور دوشعری مجموعے "سراب اور سیلاب" کے عنوان سے منظر عام پر آگئے ہیں۔ وہ زیادہ تر روایتی اردو غزل کے تجربے کرتے ہیں۔

ایاز رسول نازکی: کا تعلق کشمیر ایک ایک علمی وادبی گھرانے سے ہے۔ وہ کشمیری، اردو اور انگریزی زبان میں لکھتے ہیں۔ "خودرو" 2001 عیسوی اور "شام سے پہلے" 2008 عیسوی اُن کے اردو شعری مجموعے منظر عام پر آکر داد حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی شاعری میں کشمیر کا درد و کرب نمایاں نظر آتا ہے۔

زاھد مختار: (1956 عیسوی) خداداد صلاحیتوں کے مالک ہیں اور تن من دھن سے ادب کی خدمت کرتے ہیں۔ اردو رسالہ "لفظ لفظ" کے عنوان سے نکال کر نوجوان قلم کاروں کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔

ڈاکٹر فریدہ کول: کا شعری مجموعہ "سلگتی بہاریں" کے عنوان سے چھپا جس میں غزلوں کے اچھے تجربے ملتے ہیں۔

ڈاکٹر نرگس لون: نے اپنا تحقیقی مقالہ "کشمیری اور اردو مرثیہ میں ڈرامائی عناصر" کے عنوان سے 2012 عیسوی میں شائع کیا۔

ڈاکٹر شفیع ایاز:(1960 عیسوی) کے دوشعری مجموعے، تلاش سحر 2010 عیسوی اور ''شب تنائی اور دو افسانوی مجموعے'' درد پنہاں 1999، پگڈنڈی کا مسافر 2011 عیسوی کے عنوانات سے اُن کے شائع ہوئے۔

ڈاکٹر ریاض توحیدی:(1973 عیسوی) اردو زبان وادب اور درس وتدریس کے ساتھ دلی لگاوٗ رکھتے ہیں۔ جہاں اقبال 2011 عیسوی اور کالے پیڑوں کا جنگل (افسانوی مجموعہ 2011 عیسوی) ان کی دو اہم کتابیں ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں کشمیریوں کی بے بسی اور افلاس کو اکثر موضوع بناتے ہیں۔

ڈاکٹر درخشاں اندرابی:(1993 عیسوی) نے ڈاکٹر عزیز عباس کی نگرانی میں پنجاب یونیورسٹی پٹیالہ سے ''مخمور سعیدی کی حیات وشاعری'' پر مقالہ لکھا ہے۔ کشمیر کے ساتھ ساتھ اُن کا موضوع زیادہ تر ''عورت'' اور اس سے متعلق سماجی مسائل رہتے ہیں۔ اُن کا اردو شعری مجموعہ ''دِل ہی کافر ہوگیا'' حال ہی میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر شبیہ پروین صاحبہ:(محکمہ اعلیٰ تعلیم میں درس وتدریس کے پیشہ سے وابستہ ہے۔ شبیہ پروین صاحبہ کا PHD مقالہ ''اردو غزل، جدیدت سے مابعد جدیدیت تک'' کے عنوان سے ہے جو اُنہوں نے نامور نقاد پروفیسر قدوس جاوید کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔

سلیم سالک:(1972عیسوی) کلچرل اکیڈیمی کے اردو ایڈیٹر ہیں۔ ادبی صحافت سے شروع سے وابستہ تھے۔ ریاست کے اردو افسانہ نگاروں پر اُن کا کام دقیع ہے۔ کالم نویسی میں ماہر ہے۔

ڈاکٹر نصرت جبین:(1978 عیسوی) شعبہ اردو سنٹرل یونیوسٹی سے وابستہ ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کا PHD مقالہ ایجوکیشنل ہاؤس دہلی کی وساطت سے 2012 عیسوی میں منظر عام پر آ کر اقبالیات میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اس مقالے کا عنوان ہے ''اقبال کا تصور نسوان''۔

ریاست جموں وکشمیر کا اپنا ایک تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی پسِ منظر ہے۔ ادبیات عالیہ کا بہت بڑا ذخیرہ بھی ہے جو کشمیری، ڈوگری اور فارسی زبانوں میں بھی ہے اور اردو میں بھی۔ ہر صدی میں سخنواران وقت نے قلم سے وجدان کے پھول کھلائے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اس کے باجود یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کشمیر میں سخنوروں کو اردو ادب نے وہ مرتبہ نہیں دیا جس کے وہ مستحق ہیں۔ ایسا کیوں ہوا ہے اور اب تک کیوں ہو رہا ہے؟ اردو کی نئی نسل کے لئے یہ ایک چلینج ہے اور نئے تخلیق کاروں کو اس کا بھرپور جواب دینا ہے۔ سرینگر اقبال اکادمی بھی اس دور میں مسلسل طور پر سمیناروں، ادبی محفلوں اور مناظروں کا اہتمام کرتی ہے اس کے علاوہ کشمیر یونیورسٹی میں شعبہ اردو میں ''بزم ادب'' کی میٹنگیں منعقد ہوتی رہیں۔ ان میں نوخیز لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ ریاست اور بیرون ریاست کے ادیب

شریک ہوتے ہیں۔ شعبہ اردو کے زیرِ اہتمام سمیناروں اور ادبی اجتماعات کا انعقاد ہوتا ہے۔ اقبال انسٹچوٹ کے تحت ہر سال کُل ہند سمینار منعقد ہوتے ہیں۔ ادھر نور شاہ کی صدارت میں اردو اکادمی کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔

اردو زبان میں ادبی سرگرمیوں کے اس اجمالی جائیزے سے اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ عہد حاضر میں کشمیر اردو کے ایک اہم مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ ملکی سطح پر اردو کی اہم مراکز یعنی دہلی، لکھنو اور حیدر آباد کی اہمیت خاصی گھٹ گئی ہے۔ آزادی کے بعد سرکاری زبان ہندی بن گئی ہے۔ اردو ریاستوں سے بے دخل ہوگئی ہے۔ البتہ کشمیر میں اس سے سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ گذشتہ سوا سو سال سے اردو کشمیر میں برابر ترقی کر رہی ہے اور ریاست کی تہذیبی زبان کے طور پر اپنی حیثیت منوا چکی ہے۔ تعلیمی اداروں میں اسے تعلیمی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ پرائمری سے یونیورسٹی کی سطح اس کی تعلیم وتدریس کے معقول انتظامات ہیں۔ اس زبان میں تخلیق، تنقیدی اور تحقیق کا کام اعلیٰ پیمانے پر ہوتا ہے۔ ہر سال اردو میں متحدد کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ اس وقت اردو میں درجنوں روزنامے اور ہفتہ وار اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ اردو پڑھنے والوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اردو میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کیلئے روزگار کے نئے نئے مواقع بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ بلاشبہ اردو کیلئے ریاست میں ایک سازگار ماحول ہے۔ نئی نسلوں کے لکھنے والے پورے اعتماد اور قوت کے ساتھ اردو میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کر رہے ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان کو پہلی بار اپنی شناخت اور پہچان اب سے

قریب قریب ایک سوتیس برس قبل مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دورِ اقتدار میں ہوئی۔ تب سے اردو زبان وادب کی ریاست کے ساتھ ایک ان مٹ وابستگی رہی ہے اور آج اردو ریاست آئین کے پسِ منظر میں یہاں کی سرکاری زبان ہے۔ شعرأ اور اُدبأ نے تاریخ کے ہر دور مین اردو زبان کو اپنے فکر وفن کا وسیلہ بناتے ہوئے اس سے خون جگر پلایا ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے قائم ودائم ہے۔ بے پناہ عوامی مقبولیت، جاذبیت، وسعت اور عقیدت کے پیش نظر اردو ریاست اور ریاست سے باہر بھائی چارہ کو یقینی بنانے میں روزِ اول سے ہی ایک عظیم اور نمایاں رول ادا کر رہی ہے۔

❀❀❀

ریاست جموں و کشمیر میں غیر افسانوی نثر

(1947 عیسوی سے تا حال)

''انشائیہ''

ایک ایسی فکر انگیز اور جامع طرزِ نگارش ہے جس میں تخلیق کار بے تکلف اور شگفتہ اسلوب کے وسیلہ سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اس میں کسی پند و موعظت یا تشہیر کا دخل نہیں انشائیہ۔ ادب کی ایک لچکدار صنف ہے۔ انگریزی صنف، ایس اے (Essay) کا ترجمہ در حقیقت ''انشائیہ'' ہے۔ اس میں ہر طرح کے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا جا سکتا ہے اسکی یہ خصوصیت بھی قابل توجہ ہے کہ اس میں ذہنی رو کو نہایت ہی عمدگی سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ مقالہ نگاری اور تنقید نگاری کے برعکس انشائیہ نگاری میں زیادہ تعمق اور گہرائی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس میں کسی خاص ترتیب، تسلسل اور ربط کی پابندی بھی ضروری نہیں بلکہ ذہنی اور شخصی احساسات جس سمت مائل بہ پرواز ہوتے ہیں، انشایہ نگاری اسی جانب اپنے قلم کی جولانیاں دکھانا شروع کر دیتا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ صنف انشائیہ کی وسعت اور لچک سے جتنا

فائدہ طنز مزاح نگار ادیبوں نے اٹھایا ہے دوسری صنفِ ادب کے قلمکاروں نے نہیں۔ انشائیہ کی حیثیت صنفِ ادب میں ''قلب'' کی مانند ہے کیونکہ یہ ایک ایسی طرزِ نگارش ہے جس میں مصنف کو ذوقِ سلیم، کثرتِ مطالعہ اور افتادِ طبع کے بین بین ژرف نگاہی، نفسیاتی بصیرت اور خوش طبعی جیسے خصائل سے متصف ہونا ضروری ہے۔ ان خصائل کی ہم آہنگی اور اتصال کے نتیجہ میں ہی ایک ادبی قوسِ قزح وجود میں آتی ہے جس کو ہم انشائیہ کا نام دے سکتے ہیں۔ اور جس کے مطالعہ سے ہمیں سرور ذہنی اور مسرّت قلبی حاصل ہوتی ہے۔

اردو ادب میں انشائیہ نگاری کا ارتقاء:

ہندوستانی تاریخ میں اٹھارہویں صدی کو کئی جہتوں سے خصوصیت حاصل ہے۔ ادب اردو کیلئے یہ صدی ایک نیک فعال ثابت ہوئی۔ اسی صدی میں پرانی ادبی اقدار اور روایات کہنہ سے انحراف اور نئے افکار و خیالات کا اظہار شروع کیا گیا۔ معاشرتی تبدیلیاں، مذہبی، تعلیمی اور تہذیبی رجحانات میں جدید خیالات کو قبول کرنے کی ابتداء کا سہرا بھی اسی عہد کے سر ہے۔ یعنی یہ پوری صدی ادبی معاشرے کیلئے ایک سنگِ میل کی حیثیت سے ممتاز ہے۔ اس عہد میں سرسیّد احمد خاں کی رنگا رنگ اور متنوع شخصیت ہمہ جہت صفات سے مزّین تھی۔ ان کی زندگی کا اولین نصب العین حب الوطنی، ملت پرستی، علم دوستی اور سب سے بڑھ کر جذبات پسندی تھا۔

سرسید احمد خان کا عہد اردو ادب کا عبوری دور تھا۔ مشرق و مغرب کی کشمکش

کے نتیجہ میں مشرقی تہذیب کے نقوش اپنی آب و تاب کھو رہے تھے اور اس کی جگہ مغربی علوم اور تہذیب و تمدن کا آفتاب تازہ اپنی چکا چوند سے اہلِ ہند کی آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ سر سید احمد خاں نے اس عروج و زوال کے درمیان ایک پل کا کام انجام دیا۔

جدید نثر کا آغاز سر سید احمد خاں کی کاوشوں کا ثمر ہے۔ وہ اردو میں جدید نثر کے بانی مبانی ہیں۔ اُنکی مسحور کن شخصیت سے متاثر ہو کر محمد حسین آزادؔ، ذکاء اللہؔ، شبلیؔ، حالیؔ، محسن الملکؔ، وقار الملکؔ اور شررؔ جیسے عظیم نثر نگاروں کی ایک پوری کھیپ تیار ہو کر اُنکے شانہ بشانہ نظر آتی ہے۔ اردو ادب کا ممتاز جریدہ ''تہذیب الاخلاق'' کا اجراء سر سید نے اسی جذبہ کے تحت کیا تھا۔ اس ادبی رسالے میں سر سید احمد خاں کے علاوہ انکے مذکورہ رفقائے کار بھی اپنے مضامین لکھتے تھے یہ مضامین اپنے اندازِ بیان کی جدّت، موضوع زیر بحث کی نُدرت اور مغربی انشائیہ نگاری کی خصوصیات سے متصف تھے۔ اردو ادب میں انشائیہ نگاری کی داغ بیل انہیں مضامین کے وسیلہ سے پڑی۔ اسی لئے اردو انشائیہ نگاری کی تاریخ میں سر سیدؔ، حالی اور ذکاء اللہؔ کو نہ صرف افضلیت اور فوقیت بلکہ اولین معمار کی حیثیت بھی حاصل ہے۔

سر سید احمد خاں کی طرزِ نگارش میں سادگی، سلاست اور مقصدیت کے باوصف، گرچہ ادبی چاشنی کی حلاوت نہیں ملتی، تاہم ان کے مضامین میں جذبۂ حب الوطنی اور انکا نظریہ حیات ضرور پایا جاتا ہے۔ ان کے رفیق کار حالیؔ پہلے مولوی ہیں اور اس کے بعد ادیب, ان کے مضامین میں اصلاحی جذبہ کو اولیت حاصل ہے مگر

ان کے اسلوب کی نمایاں صفت انکی رحم دلی اور مروّت ہے، انکی سنجیدگی اور متانت نے ان کو انشائیہ نگاری کی شگفتگی اور دِل آویزی جیسی صفات سے دور رکھا۔

مولوی ذکاءاللہ، سرسید احمد خاں کے رفیقوں میں ایسی شخصیت کا نام ہے جو زودنویسی کیلئے مشہور ہیں۔ اردو میں انہوں نے تاریخ، تہذیب اور لٹریچر پر گراں مایہ کتب تصنیف کیں۔ اُنکے مشہور مضامین ''ذہانت اور تہذیب'' اور ''آگ''۔ اُنکو انشائیہ نگاری کے ابتدائی معماروں میں جگہ دلاتے ہیں۔ تاہم یہ بات ذہن نشین رہے کہ سرسید، اور ذکاءاللہ نے جدید تقاضوں کے مدِ نظر رکھ کر صاف، سلیس اور شگفتہ اسلوب اپنا کر مضامین ضرور سپردِ قلم کئے ہیں مگر ان مضامین میں انشائیہ کی تمام صفات نہیں ملتیں۔ اس لئے ان نثاروں کو مکمل انشائیہ نگار نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اردو انشائیہ کی صحیح فضا سرسید کے مضامین سے پیدا ہوتی ہے۔ سرسید نے سب سے پہلے یہ مضامین (جو تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے) لکھ کر اردو میں انشائیہ کے فن کا چراغ روشن کیا۔ اس چراغ سے دوسروں نے بھی اپنے فن کے چراغ جلائے۔ اس طرح فن کی روایت کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ سرسید کے ساتھیوں میں محسن الملک، حالی اور وقار الملک نے بھی ایسے مضامین لکھے جن کو انشائیہ کے تحت شمار کیا جاسکتا ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں غیر افسانوی نثر:

غیر افسانوی نثر میں ریاست میں جن قلم کاروں نے رنگ بھرے ان میں پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر شکیل الرحمٰن ، پروفیسر محمد زماں آزردہ ،

غلام نبی خیالؔ، غ۔م۔ طاوس، سوم ناتھ زتشیؔ، شمیم احمد شمیمؔ، خواجہ ثنا اللہ بٹ (مدیر آفتاب)، اور ستار احمد شاہد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جنہوں نے سفرناموں، انشائیوں، خاکوں، رپورتاژ اور فکائیہ تحریروں سے غیر افسانوی نثر کے دامن کو نہ صرف پھیلایا بلکہ اس میں نئے گُل بوٹے بھی کھلائے اور اس سے کئی رنگوں سے مزئین کر دیا۔

کشمیر میں غیر افسانوی نثر پر تفصیلی نظر ڈالیں تو سفرناموں کی صورت میں شکیل الرحمٰن، حامدی کاشمیریؔ، غلام نبی خیالؔ، خواجہ ثناء اللہ بٹ اور غلام نبی شیدا کے پانچ سفرنامے ہمیں روس، عراق، اور پاکستان کی فضاؤں میں پہنچا کر وہاں کی علمی، ادبی اور معاشرتی زندگی میں جھانکنے کا موقعہ فراہم کرتے ہیں۔ انشائیوں میں محمد زماں آزردہؔ، کے سات مجموعے فکر و شعور کی پھلجڑیاں بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ خاکوں، انشائیوں میں شمیم احمد شمیمؔ، سوم ناتھ زتشیؔ، غ۔م۔ طاؤس اور ستار احمد شاہدؔ کی تحریریں ذہن و شعور کی کروٹیں اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ سرگزشتوں میں شیخ محمد عبداللہ (آتش چنار) سید میر قاسم (داستان حیات) اور سید علی گیلانی (قصہ درد) قابلِ ذکر ہیں۔

انشائیوں میں ''بن بلائے مہمان'' اور خاکوں میں ''ڈیڈی'' شمیم احمد شمیمؔ کی یادگار تحریریں ہیں۔ فکاہیہ تحریروں میں خواجہ ثناء اللہ بٹ بھی ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' کے علاوہ ''خبر زینہ کدل کی'' کے عنوان سے مزاحیہ تحریریں لکھتے تھے۔ رپوتاژ نگاری میں سوم ناتھ زتشیؔ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اُنہوں نے ''نوالے سروش'' اور ''ڈل کی تہ میں'' جیسے دلچسپ رپورتاژ لکھے۔

جہاں تک ریاست جموں وکشمیر میں انشائیہ نگاری کا تعلق ہے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں پنڈت ہرگوپال کول خستہؔ اور سالک رام سالکؔ نے بھی مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں پنڈت ہرگوپال کول خستہؔ اور سالک رام سالکؔ نے بھی انشائے لکھے۔ اس کے بعد تیرتھ کشمیریؔ کا نام آتا ہے۔ ''کتاب'' کے عنوان سے لکھے ہوئے ایک انشائے میں تیرتھ کشمیری لکھتے ہیں۔

''زندگی کی یہ کتاب میں نے لکھنا شروع کی اور اس میں لڑکپن، جوانی اور ادھیڑپن کے انوکھے تجربے بیان کئے۔ خیال تھا کہ یہ مقبول ہوگی۔ لیکن...... مقبول ہونے کی کوئی سبیل نہیں اس لئے جسم کے انگ انگ میں محسوسات ، وسوسات اور خواہشات دردو کرب اور اور بے چینی کی نہ دیکھی جانے والی لہریں...... روزافزوں اُمڈنے لگیں''۔

تیرتھ کشمیریؔ کے نام کے بعد محی الدین حاجنیؔ، اختر محی الدینؔ، غ، م، طاوس، ستار شاہدؔ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ مگر انہوں نے جو انشائیے لکھےُ سے منہ کا ذائقہ بدلنے سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ان ادیبوں نے یک آدھ انشائیہ لکھ کر اُردو سے منہ موڑ لیا اور بعدازاں جس قدر بھی انشائیے لکھے وہ کشمیری زبان وادب کا حصہ بن گئے۔ اردو میں صنف انشائیہ کو شعوری طور پر پروفیسر محمد زماں آزاردہؔ آگے لے گئے۔ اُن کے انشائیوں کے 9 مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اولین مجموعہ

''غبارِ خیال'' کے نام سے 1973 عیسوی میں شائع ہوا۔ تین کشمیری انشائیوں اور پانچ اردو انشائیوں کے مجموعے۔ ایک کشمیری مجموعے پر اُنہیں ساہتیہ اکادمی انعام ملا۔ اردو میں اُن کے انشائیوں کے مجموعے مندرجہ ذیل ہیں۔

۱) غبارِ خیال، ۲) شیرین کے خطوط، ۳) غبارِ کارواں،

۴) کانٹے، ۵) گلدستہ، ۶) سُن تو سہی۔

آزردہ صاحب بلاشبہ ایک منجھے ہوئے انشائیہ نگار ہیں۔ وہ اس فن کی باریکیوں، نزاکتوں اور گہرائیوں کا واضح احساس رکھتے ہیں۔

''غبارِ خیال'' سے ''سُن تو سہی'' تک اُنہوں نے ایک لمبا سفر طے کیا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اُن کے آرٹ کے متعلق رقم طراز ہیں۔

> ''انشائیہ وہ ہی لکھ سکتا ہے جو زندگی گزارنے کا ہُنر جانتا ہے اور زندگی کی خوشیوں، بلندیوں اور وادیوں ہر چیز کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہو۔ محمد زماں آزردہ کے انشائیوں میں اس بات کی اچھی کوشش ملتی ہے۔ وہ زندگی کے حسن پر بھی نظر ڈالتے ہیں اور اُس کی ناہمواریوں پر بھی ہنس سکتے ہیں۔ اُن کے یہاں اس بات پر توجہ ملتی ہے کہ لفظ خیال سے جدا نہ ہو''۔

لفظ و خیال کا یہی اتصال اُن کے انشائیوں میں رنگوں کی ایک قوس قزح بکھیر دیتا ہے۔ ایک لمحہ سے دوسرا لمحہ ایک واقعہ سے دوسرا واقعہ لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ اُنکے پاس مناظر، واقعات، کیفیات اور احساسات کا گلدستہ سا ہے۔ زبان کی

تخلیقیت کے کئی شیڈز ہیں۔ طنز ومزاح بھی اُن کے اسلوب بیان کا ایک نمایاں

وصف ہے اُن کے یہاں چھوٹے چھوٹے فقروں میں بے پناہ طنز ومزاح دلکشی اور خیال آفرینی ملتی ہے۔ جو بے حد متاثر کُن ہے۔

یہاں اُس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ یہاں انشائیہ نگاری 1947 عیسوی پہلے شروع ہوگئی تھی اس ضمن میں بازیافت میں اس طرح درج کیا گیا ہے۔

''کشمیر میں انشائیہ نگاری کے ضمن میں نشتر کاشمیریؔ، گنگا دھر دیہاتیؔ اور تیرتھ کشمیریؔ کو اولیت کا سہرا حاصل ہے جنہوں نے 1947 عیسوی سے قبل انشائیہ نگاری کے اولین نقوش قائم کیے تاہم حالات و واقعات نے انشائیہ نگاری کی بیل منڈھے چڑھنے نہیں دی۔ مذکورہ ادیبوں نے افسانوں کے علاوہ انشائیہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی۔ تیرتھ کشمیریؔ نے 1922 عیسوی میں لکھنا شروع کیا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے ''کشمیر میں اردو'' میں اُن کے بارے میں لکھا ہے کہ تیرتھ کشمیریؔ نے افسانوں کے علاوہ انشائیے بھی لکھے''۔

نشتر کاشمیریؔ، گنگا دھر دیہاتیؔ اور تیرتھ کشمیریؔ کی تحریروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے اندر انشائیہ نگاری کے بھرپور جوہر موجود تھے لیکن تقسیم وطن نے اُس جوہر کو پروان چڑھنے سے روک دیا۔ بدلتے ہوئے حالات میں بیشتر قلم کار ناول اور افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ انشائیہ کو دوبارہ ابھرنے کیلئے ایک

طویل وقفے کا انتظار کرنا پڑا۔ یہاں انشائیہ نگاری کی شمع ازسرنو محمود بیگ نے روشن کی جو کشمیر میں مشیر تعلیمات اور جموں کشمیر یونیورسٹی کے پروچانسلر کی حیثیت سے بیسویں صدی کے چھٹے دہے میں لگ بھگ پانچ سال کشمیر میں مقیم رہے۔ اس دوران وہ دیگر علمی و ادبی مضامین کے ساتھ انشائیے بھی لکھتے رہے۔ جو ریڈیو کشمیر سے نشر ہونے کے علاوہ ریاست سے باہر مختلف جرائد رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ اُن کی انشائیوں میں ''میری جو شامت آیہ شادی کی'' یہ بھی ایک فن ہے دوستی نبانا'' ''کیا ہوتا اگر اخبار نہ ہوتا'' وغیرہ انشائیے شامل ہیں۔

انشائیہ نگاری کے سلسلے میں شمیم احمد شمیؔم بھی منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ''آئینہ'' کی ادارت و اشاعت کے دوران اُنہوں نے کئی معرکے انشائیے لکھے۔ انشائیوں میں ''بن بلائے مہمان'' اُن کی ایک یادگار تحریر ہے۔ ڈاکٹر منصور احمد منصوؔر بھی انشائیے لکھنے میں مصروف ہیں۔ اُنہوں نے کافی انشائیے لکھے بھی ہیں۔

خوش دیو جن کا تعلق پونچھ سے ہے۔ افسانے، ڈرامے اور مضامین لکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کرتے ہیں۔ آپ نے انشائیے بھی لکھے۔ انشائیوں کا ایک مجموعہ ''جوتیاں'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

رپورتاژ:

رپوتاژ فرانسیسی زبان کا لفظ ہے جس کا انگریزی لفظ رپورٹ سے براہ راست تعلق ہے۔ فرانسیسی میں اس کا تلفظ رپورتاژ اور رومن رسم الخط میں اِملا reportage ہے۔ اردو میں رپورتاژ کو ایک ادبی صنف کے طور پر برتا جاتا ہے جو رپورٹ سے

مختلف ہوتا ہے۔ دیگر ترقی یافتہ اصناف کی طرح اس میں موضوع کی اہمیت ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے فن سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ اس صنف رپورٹ اور صحافت سے اس کا فن ہی علحیدہ کرتا ہے اس کا موضوع صحافتی لیکن قطعی ادبی ہوتا ہے۔

رپوتاژ چونکہ اس واقعہ پر لکھا جاتا ہے جو لکھنے والے کی نظر سے گذرتا ہے اسلئے اس کا تعلق زمانہ حال سے ہوتا ہے۔

جہاں تک رپورتاژ کے موضوع کا تعلق ہے تو اس ضمن میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ سماجی اور اجتماعی مسائل پر مبنی ہونا چاہیئے۔ زندگی جس قدر وسیع اور جامع ہے اسی قدر رپوتاژ کے موضوعات کا بھی دامن پھیلا ہوا ہے ایسے واقعات، حادثات اور حالات جو پورے سماج پر اثرانداز ہوسکتے ہوں، رپورتاژ کا موضوع بنتے ہیں۔

اردو میں پہلا رپورتاژ نگار:

اصطلاحی لحاظ سے اردو رپوتاژ کو سب سے پہلے کرشن چندر نے متعارف کرایا تھا۔ انہوں نے ہی اس صنف کیلئے رپورتاژ کا اصطلاع نام تجویز کیا جس سے پہلے حیرت سے سنا گیا لیکن بعد میں انگریزی لفظ ''ری پورٹیج'' کا اردو متبادل سمجھ کر قبول کرلیا گیا۔ فرحت اللہ بیگ کا معرکہ آرا مضمون ''پھول والوں کی سیر'' چند داخلی خصوصیات کی بنا پر اول درجے کا رپورتاژ کہلانے کا مستحق ہے۔ کرشن چندر کا ''پودے'' حیدرآباد میں منعقد کی گئی ترقی پسند مصنفین کی کانفرس کے حقیقی مشاہدے کا

شخصی اور تاثراتی رپورتاژ ہے۔ مشاہدے کی گہرائی، واقعات کا حقیقت پسندانہ بیانیہ اور شخصیات اور کانفرنس کے بنیادی نظریئے سے ہمدردی نے اس رپورتاژ کو ایک موثر ادب پارہ بنا دیا ہے۔

محمد ہاشمی نے ''کشمیر اداس ہے'' میں اس بحران کا موضوع بنایا ہے جو آزادی کے بعد کشمیر میں پیدا کر دیا گیا تھا۔ محمود ہاشمی نے اس رپورتاژ میں خارجی حقیقت کو شدید داخلی کرب سے پیش کیا ہے۔

سوانح نگاری:

اردو میں ادبی سوانح نگاری کے ابتدائی نقوش ادبی تنقید کی طرح تذکروں میں ہی ملے ہیں۔ سوانح نگاری سے مراد کسی شخص کے حالات لکھنے سے لئے جاتے ہیں۔

جوشؔ ملیح آبادی کی ''یادوں کی بارات'' آل احمد سرورؔ کی ''خواب باقی ہیں'' کلیم الدین احمد کی ''اپنی تلاش میں'' صالحہ عابد حسین کی ''سلسلہ روز وشب'' کلیم عاجزؔ کی ''ابھی سُن لو مجھ سے'' اختر الایمانؔ کی ''اس آباد خرابے میں'' مسعود حسین خاں کی ''ورود مسعود'' اداؔ جعفری کی ''جو رہی سو بے خبری رہی'' کشور ناہید کی ''بُری عورت کی بُری کتھا''، ''مجھے کہنا ہے کچھ اور بھی'' غلام السیدین کی سوانح حیات ہے۔ ''حیات جاوید'' سر سید کی سوانح حیات وغیرہ خود نوشت سوانح حیات ہیں۔ یہ ایک مسلم حقیقت ہے جو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اردو میں سوانح نگاری کی بنیاد باقاعدہ طور پر مولانا الطاف حسین حالؔی نے سر سید احمد خاں کی سوانح حیات لکھ کر

رکھی۔ اس طرح سے کہا جاسکتا ہے کہ جوشؔ ، کلیم الدین احمدؔ ، صالحہ عابد حسینؔ، کلیم عاجزؔ، مسعود خاں، کشورؔ ناہید، نے خود لکھ کر سوانح نگاری جیسی نثری صنف کو آگے بڑھایا۔

جہاں تک جموں صوبے میں اس صنف کے آغاز و ارتقا کا تعلق ہے تو اس ضمن میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ دوسری اصناف کے مقابلے میں یہاں اس صنف نے زیادہ ترقی نہیں کی۔ قدر اللہ شہابؔ نے خودنوشت ''شہاب نامہ'' لکھا۔ جو لگ بھگ تیرہ سو صفات پر مشتمل ہے۔ جس میں بے شمار عبرتیں چھپی ہوئی ہیں اس میں مصنف اور دوسرے کئی اشخاص اور اداروں کے حقیقی خدوخال اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ اس لئے اس کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ شہاب نامہ مکمل طور پر ایک قوم اور ایک ملک کے عروج و زوال کا آئینہ دار ہے۔ یہ اہل سیاست کی دغابازیوں اور ہیرا پھیریوں کے علاوہ سربراہوں ، کج رویوں، نوکر شاہی کی جی حضوریوں، بیوروکریٹس کی من مانیوں اور معاشرے کی بے حسی کی بے لاگ داستان ہے اس کے علاوہ ''آتش چنار'' کے نام سے شیخ محمد عبداللہ کی سوانح عمری بھی ہے۔ جسے ساہتیہ کادمی کے ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔

محمد زماں آزردہؔ کے انشائیوں میں شگفتگی اور انبساطی کیفیت:

محمد زماں آزردہؔ کا شمار عصرِ حاضر کے گنے چُنے انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اردو ادب کے فروغ میں بھی ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ انہوں نے انشائیہ نگاری، شاعری، افسانہ نگاری، ترجمہ نگاری، بچوں کے ادب پر لکھنے کے علاوہ

تحقیق وتنقید کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔

بحیثیت ادیب ان کی شناخت ہندوستان کے ممتاز انشائیہ نگاروں میں ہوتی ہے۔ان کے انشائیوں کے اب تک پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مثلاً غبار خیال، شیریں کے خطوط، غبارِ کارواں، سُن تو سہی اور کانٹے۔ ان کے انشائیوں کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ اپنے دلکش انداز بیان، اسلوب کی تازہ کاری، ہلکے پھلکے موضوعات، انوکھے اور لطیف انداز بیان کی وجہ سے قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ان کے انشائیے اپنے اطراف واکناف موجودگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ روزمرہ پیش آنے والے واقعات وحادثات پر اُنہوں نے ایک حساس ادیب کی طرح فلسفیانہ اندازفکر کے ذریعے سوچنے اور غور کرنے کی دعوت دی ہے۔

زماں آزردہ کے انشائیوں میں ہمیں (Intelectual pleasure) کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اس جہانِ رنگ و بو کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں اور اپنے قاری کو بھی یہ محسوس کراتے ہیں لیکن ان کے فن کی خاص بات یہ ہے کہ وہ قاری کو یہ احاس ہونے نہیں دیتے کہ وہ کسی مسئلہ کو تفہیم کرار ہے ہیں بلکہ ان کا انداز بیان اتنا دلکش اور دلچسپ ہوتا ہے کہ قاری اس کی شگفتگی اور انبساطی کیفیت میں کھوسا جاتا ہے اور اسے موضوع کی اہمیت اور اس کی گہرائی وگیرائی کی چنداں ضرورت نہیں رہتی۔ان کے انشائیے ''ون وے ٹریفک'' سے یہ مثال ملاحظہ کیجئے جہاں وہ ون وے ٹریفک کو ایک نئے اور انوکھے انداز سے دیکھتے ہیں۔ جس سے ان کے مزاج کی شگفتگی اور لطافت کا بھی اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

''ٹریفک کو ان راستوں تک ہی کیوں محدود کیا جائے جن پر گاڑیاں

موٹریں، یا لوگ چلتے ہیں۔ میرے خیال میں سب سے اہم ٹریفک باتوں کی ٹریفک
ہے۔ کچھ لوگوں کے ساتھ بات کرتے ہوئے واقعی اس ون وے ٹریفک سے بہت
کوفت ہوتی ہے ایسے لوگ بولتے ہی چلے جاتے ہیں اور انہیں پختہ یقین ہوتا ہے کہ
اس روٹ پر کسی اور کو زبان کی گاڑی چلانے کی اجازت نہیں۔ اپنے نزدیکی مشیر ممکن
ہے دائیں بائیں سے ایک جملے کی اورٹیکنگ (Over taking) کر بھی لیں۔ مگر
سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کا خون کھول اُٹھتا ہے۔ کافی کوشش کے باوجود بھی ایک
جملہ نہیں بول سکتا۔ آنکھوں کی پتلیوں کو تیز تیز گھما کر آپ ڈر کا احاس دلائے۔ منھ
پھیلا کر ہارن سے ملتی جلتی آواز پیدا کیجئے۔ دل میں دوسروں کو گونگا بنانے کا وظیفہ
پڑھیے مگر سب بیکار ہوگا۔ آپ جونہی گفتار کی گاڑی کو اسٹارٹ کرنا چاہیں گے اسی
وقت وہ صاحب زبان کے ایکسلیٹر پر الفاظ کا پریشر بڑھائیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ
آپ دِل کی دِل میں لیے رہ جائیں گے کبھی جو محسوس ہوگا کہ رفتار کم ہوگئی اور شاید
گاڑی کسی سائڈ پر کھڑی ہوگئی تاکہ آپ اپنی گاڑی آگے نکال لے جائیں۔ تو آپ کو
احساس ہوگا کہ وہ صاحب تو صرف گیر بدل رہے تھے۔ مجبوراً آپ کو الفاظ نوک
زبان سے واپس لانے ہونگے''۔ (ون وے ٹریفک، غبارِ کاروان، ص136)۔

زماں آزردہ کے اسلوب کا خاص وصف ان کا پر لطف اور شگفتہ انداز بیان
ہے۔ انشائیے میں شگفتگی سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جب انشائیہ نگار کسی موضوع پر اپنے
تجربات اور مشاہدات کا اظہار کرتا ہے۔ تو اس موضوع سے متعلق اس کا نقطۂ نظر

دوسروں سے بالکل جداگانہ ہو یعنی وہ اپنے خیال کو نئے معنی دے کر پیش کرے۔ اسکا یہی انوکھا اور اچھوتا زاویۂ نگاہ انشائیہ کے اسلوب میں شگفتگی پیدا کرتا ہے۔ سلیم اغاز قزلباش لکھتے ہیں۔

''انشائیہ ایک گھتی ہوئی تحریر ہے جس میں ایک نقطۂ خیال دوسرے نقطۂ خیال سے پھوٹتا ہے اور پھیل کر دوبارہ پہلے نقطے کو چھوتا ہے تو معنی کا ایک نیا پرت، فکر کا ایک انوکھا زاویہ اور خیال کی ایک تازہ لہر نمودار ہو جاتی ہے''۔

انشائیے میں اچھوتا پن یا نیا پن اُس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک کہ انشائیہ نگار کے تجربات، مشاہدات اور خیالات اس کی شخصیت، جذبے اور فکر میں گھل مل نہ جائیں۔ محمد زماں آزردہ اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں جب کسی بات کو ہلکے پھلکے اور لطیف پیرائے میں پیش کرتے ہیں تو ان کی کہی ہوئی باتیں قاری پر گراں نہیں گزرتیں بلکہ وہ قاری کو اعتماد میں لیتے ہیں۔ اسے احساس دلائے بغیر اپنی انفرادیت بھی منواتے ہیں۔ اسی انوکھے اور منفرد انداز کی ایک مثال ان کے انشائیے ادیب سے ملاحظہ کیجئے:

''آپ سوچتے ہوں گے کہ ادیب کوئی عام انسان نہیں ہوگا۔ آپ کا سوچنا بالکل درست ہے واقعی یہ عام انسان نہیں ہوتا مگر عام انسانوں کی خصوصیات بھی اس میں ہوتی ہیں۔ یہ بھی ہنستا کھیلتا ہے البتہ لوگ نہیں سمجھتے۔ اصل میں یہ اتنا نازک حس ہوتا ہے کہ

ادھر کسی نے دیا سلائی دکھائی ادھر سوکھے تنکے کی طرح سے آگ پکڑتا ہے۔ مگر یہ عموماً خود ہی جلتا ہے، دوسروں کو اپنی آگ کی لپیٹ میں نہیں لینا چاہتا"۔ (ادیب، سن تو سہی، ص 12)

انشائیہ میں شگفتگی کیلئے نہ صرف انشائیہ نگار کی منفرد سوچ اہمیت رکھتی ہے بلکہ اسے انوکھا اور دلچسپ بنانے میں اس کے جذبے اور فکر کی تازگی کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلیم اختر لکھتے ہیں:

"اگر اس (انشائیہ نگار) کے پاس قاری کو متاثر کرنے والی شخصیت اور تازگی فکر سے جنم لینے والی منفرد سوچ کے نئے زاویے ہیں تو یقیناً اس کا انشائیہ دلچسپ اور پرلطف ہوگا"۔

زماں آزردہ طبعتاً بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج واقع ہوئے ہیں اور طبیعت کی یہی شوخی ان کی تحریروں کو پرلطف اور دلچسپ بناتی ہے۔ وہ گفتگو کا انداز اختیار کرتے ہوئے انوکھے اور منفرد انداز میں قاری کو اپنے تجربات اور مشاہدات میں شریک کرتے ہیں اور انہیں ایسے اعتماد میں لیتے ہیں کہ قاری بذاتِ خود ان کے تجربے کو اپنا تجربہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ مثلاً بیل کو سڑک کے بیچوں بیچ بیٹھے رہتے، ہم نے کئی مرتبہ دیکھا ہے۔ یہ ہمارا، آپ کا ہر روز کا مشاہدہ ہوتا ہے لیکن زماں آزردہ نے اپنے انشائیے "بیل" میں اسے کتنے نئے زاویوں سے دیکھا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

"جب ایک ساتھ سپاہی کا وِسل اور مختلف گاڑیوں کے ہارن فضا کو جھنجھوڑتے ہیں یہ بھی ڈسٹرب (Disturb) ہو جاتا ہے اور کان

اس طرح ہلاتا ہے کہ جیسے شیشہ تفکر سے گرد جھاڑ رہا ہو۔ اس کے
انداز جنون پر غور فرمائیے تو اس بات کا خیال ضرور آئیگا کہ شاید
پچھلے جنم میں کوئی سیاسی لیڈر رہا ہو جو بظاہر اب مقبول نہیں رہا مگر
اب بھی دھرنا دیئے بیٹھا ہے یا کسی مانگ کو پورا کروانے کیلئے
برت رکھے ہوئے ہے۔ ادھر اس کی مستقبل مزاجی سے یہ گمان
بھی ہوتا ہے کہ یہ آئیڈیلسٹ (idialist) ہے لوگ کسی طرف کو
بھی جائیں، گاڑیاں آپس میں ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں مہینوں
کے فاصلے منٹوں میں طے ہوں مگر یہ اپنی آن اور اپنے آیڈل
(ideal) پر قائم ہے''۔ (بیل، غبارِ کارواں، ص 42)

اچھے انشائیہ نگار میں بیدار ذہن اور متجس آنکھ کا ہونا بھی ضروری سمجھا جاتا ہے کیوں کہ بیدار ذہن آنکھ کو متجس رکھتا ہے اور متجس آنکھ ذہن کو بیدار رکھتی ہے اور ان دونوں کی باہم عمل پزیری سے انشائیہ نگار چیزوں کو سوچنے اور غور کرنے کا ایک نیا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے انشائیہ میں جو تازگی اور شگفتگی ملتی ہے اس کو صرف اسلوب تک محدود نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کی تشکیل میں انشائیہ نگار کا ذہن اور آنکھ دونوں فعال کردار ادا کرتے ہیں۔ زماں آزردہ کے انشائیوں میں بھی ان کے فکر کی گہرائی اور مشاہدہ کی گہرائی سے نیا پن اور انفرادیت پیدا ہوتی ہے۔ ان کے انشائیہ ''ذکر ممبئی کا'' سے ایک مثال دیکھئے۔ جس میں وہ ممبئی شہر کی بھیڑ بھاڑ اور مصروف ترین زندگی کو مشینی زندگی سے تعبیر کرتے ہوئے ایک نئے اور انوکھے

زاویئے سے دیکھتے ہیں کہ معنی کی ایک نئی پرت اور خیال کی ایک تازہ لہر نمودار ہونے لگتی ہے:

''جذبات کو ابھارنے والے اس شہر میں جب میں نے تھوڑی دیر رُک کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ پورا شہر ایک بڑی مشین ہے اور اس میں رہنے والے اس مشین کے چھوٹے چھوٹے پرزے جو اپنے محور سے ہٹتے ہی نہیں اور کبھی کسی زور زبردستی نے ان کو ہٹا بھی دیا تو مختلف قوتیں آ کے ان کو پھر اپنی جگہ پر پہنچا دیتی ہیں۔ لوگ بھی اسی طرح کی زندگی گزارتے ہوئے عافیت محسوس کرتے ہیں''۔

انسان کی قوت حافظہ طوطا چشم ہے۔ یہ کب دید بدل دے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تعجب تو یہ ہے کہ اس کی حقیقت اس وقت معلوم ہو جاتی ہے جب پانی سر سے اوپر ہو چکا ہوتا ہے اور کبھی کبھی انسان ایسا دھوکا کھا جاتا ہے کہ جواب نہیں''۔

(حافظ غبار کاروان ،ص 13)

''انسان لاکھ کوشش کرے کہ جتنی چادر ہو پاؤں اتنے ہی پھیلائے جائیں۔ مگر یہ بات اسی وقت تک ممکن ہے جب تک پاؤں پھیلانے کا ہوش ہو یا چادر اپنے بس میں ہو۔ یہ دنیا اتنی وسیع ہے کہ اپنے قد کا اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے اور کبھی نظر چوک جاتی ہے اور پاؤں پھیل جاتے ہیں دوسروں کی نگاہ اس طرح پڑتی

ہے کہ چادر چھوٹی ہی پڑ جاتی ہے"۔ پیشے کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے، (غبارِ کارواں ص 51)

وہ چھوٹے چھوٹے فقروں میں بھی فلسفیانہ انداز بیان کے ذریعے معنی کی ایک نئی دنیا آباد کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اسلوب میں تازگی اور لطافت کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے:

"فطرت کا قانون عجیب ہے۔ ہر پھول کے ساتھ کانٹا ہے۔ زندگی کے ساتھ موت ہے۔ دھوپ کے ساتھ سایہ"۔

(حضرت مدیر، غبارِ کارواں، ص 73)

"آدمی نا اہل، بدنیت اور سازشی مالک یا افسر کے ساتھ رہ کر بھی اطمینان سے بسر کرسکتا ہے مگر سچ بولنے کی عادت ہو تو کسی کے ساتھ بھی نباہ مشکل ہے۔ چاہے آدمی کتنا ہی مخلص کیوں نہ ہو"۔

(باز آئے سچ بولنے سے، غبارِ کارواں، ص 189)

زندگی صرف ایک ہموار شاہراہ نہیں اس میں پیچ وخم والی پگڈنڈیا بھی آتی ہیں"۔

(شادی کو سودا سمجھنے والوں کے نام، سن تو سہی، ص 86)

"انسانی زندگی حادثوں کا ایک مجموعہ ہے بلکہ انسان کا دنیا میں آنا بجائے خود ایک حادثہ ہے" (حادثہ، سن تو سہی، ص 86

زماں آزردہ کے انشائیوں میں اس طرح کی بے شمار مثالیں مل جاتی ہیں

جہاں وہ فلسفیانہ فکر کے ذریعے زندگی اور کائنات کے بارے میں ایک نئے زوایئے سے دیکھنے اور سوچنے پر مجبور کرتے ہیں لیکن ان کا انداز اتنا دلکش اور دلچسپ ہوتا ہے کہ ہم ان کی باتوں کو بڑی آسانی سے قبول کرتے جاتے ہیں۔ الغرض زماں آزردہ کے انشائیوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ خوشگوار موڑ پر جب اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اپنے خیالات کو نئے اور انوکھے انداز میں پیش کرتے ہیں تو نہ صرف ان کی فلسفیانہ سوچ اور خوش طبعی کے جوہر ہم پر عیاں ہوتے ہیں بلکہ وہ اپنے قاری کو افراد اشیاء اور واقعات کو ایک نئے تناظر میں دکھا کر ایک لطیف وانبساطی کیفیت اور نئے وتازہ احساس سے دوچار کرتے ہیں اور غور وفکر کا ایک نیا زاویئہ بھی عطا کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کی اسی خصوصیت کے پیش نظر کے، نیّر نے آزردہ کے انشائیوں کی جو تعریف کی ہے وہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

> ''ہمارے ملک میں انشائیہ کے شیدائیوں کی تعداد زیادہ نہیں، زیادہ کیا اتنی بھی نہیں جتنی پاکستان میں ہے۔ زماں آزردہ کا قلم غنیمت ہے۔ جو انشائیے کی جوت جگائے ہوئے ہیں۔ ان کے موضوعات بے حد دلچسپ ہیں وہ زندگی اور اس کے مظاہرے اور اشیاء کو نئے زوایئے سے دیکھنے کے عادی ہیں وہ بے حد حساس ہیں اور اسی لئے جب بھی ان کے لطیف احساسات خارجی ماحول سے متصادم ہوتے ہیں تو ان کے قلم میں شدید قسم کی جنبش اور ارتعاش جاگ اٹھتا ہے۔ مجھے تو ان کے انشائیوں کو پڑھتے ہوئے

ہمیشہ ہی زندگی اور فرحت کا احساس ہوا ہے کہ وہ انشائیے میں

ڈوب کر جی لگا کے لکھنے کے عادی ہیں اور یہی وہ رویہ ہے جسے

فیضؔ نے خون دل میں انگلیاں ڈبونے کا نام دیا ہے"۔

(کے، کے نیّر، تاثرات، بشمولِ غبارِ کاروان، ص206)

منصور احمد منصورؔ بحیثیت انشائیہ نگار:

کشمیر میں شاعری، ڈراما، تحقیق وتنقید، صحافت اور فکشن کے حوالے سے اردو کی خدمت کرنے والوں کی کمی نہیں لیکن اردو انشائیہ کے میدان میں دو تین حضرات ہی ہیں جنھوں نے اس صنف کی طرف توجہ دی ہے ان میں محمد زماں آزردہؔ، محمد شفیع اور ڈاکٹر منصور احمد منصورؔ کے نام اہم ہیں۔

منصور احمد منصورؔ کا وطن بانڈی پورہ ہے جہاں وہ 1957 عیسوی میں ایک باعزت گھرانے میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں ہی حاصل کرنے کے بعد سوپور ڈگری کالج سے بی، اے کیا اور پھر کشمیر یونیورسٹی سے اردو میں ایم، اے اور پی ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ منصور احمد منصورؔ کچھ عرصہ ڈگری کالج پونچھ میں اردو لیکچرر کے فرائض انجام دینے کے بعد 1981 عیسوی میں شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے اور آج وہ اس شعبہ کے صدر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

منصور احمد منصورؔ ایک بے حد شریف الطبع اور بااخلاق شخص ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ لیکن منصور احمد منصور کی ایک خاص اور

نمایاں خوبی اپنے وطن کشمیر کے ارضِ پاک و ستان کی بے پناہ محبت ہے۔ منصور احمد نے طالب علمی کے زمانے سے ہی لکھنا شروع کیا تھا۔ ان کی ابتدائی تحریروں میں ہی چونکہ کشمیر عوام کے دردِ غم کی ترجمانی ہوتی تھی۔ اس لئے بہت جلد انہیں عوامی مقبولیت حاصل ہوگئی۔ منصور احمد کم لکھتے ہیں لیکن جو کچھ بھی لکھتے ہیں ایک معیار اور وقار کے ساتھ لکھتے ہیں۔

منصور احمد منصوؔر کی تازہ ترین تصنیف ''کشمیر خواب، سراب، گرداب'' ہے۔ دراصل یہ تصنیف منصور احمد منصوؔر کے ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جن کا مرکزی محور کشمیر ہے۔ ''کشمیر خواب، سراب، گرداب'' کے مضامین میں کشمیر کے حالات، اہل کشمیر کی نفسیات اور عروج و زوال کے اسباب کے حوالے سے بھرپور طنز کے تیر بھی ہیں اور مزاح کے شگوفے بھی، دانشورانہ تبصرے بھی ہیں اور فقیرانہ بے نیازی بھی، اس بات کا اندازہ ان کے درج ذیل اقتباسات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

> ''ہماری کہانی بالکل مختلف ہے نہ اس کی کوئی ابتدا ہے نہ وسط اور نہ ہی کوئی انتہا۔ یہ کہانی نہ تو کلائمیکس کو پہنچتی ہے اور نہ کسی انجام کو۔ اس کہانی کا کوئی عنوان بھی نہیں کوئی مرکزی کردار بھی نہیں۔ اسکے بہت سے کردار ہیں اس میں سارا معاشرہ ایک کردار کی طرح ہے لیکن نہ کسی کے منہ میں زبان ہے نہ کوئی بولتا ہے تو وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار نہیں کرتا کیونکہ فطرت نے ہمیں ضمیر سے معاف رکھا ہے۔ اس کے یہاں زبان پر جو بات آتی ہے وہ دل

میں نہیں ہوتی اور جو بات دل میں ہوتی ہے وہ زبان پر نہیں آتی۔

(’کشمیر خواب، سراب، گرداب‘)

بھائیو! رب کا شکر ادا کرو بہار آئے نہ آئے گُل اب بھی کھلتے ہیں اور روز نئے گل کھلائے جاتے ہیں یہ گُل باغوں میں نہیں بلکہ ڈرائینگ روموں، اقتدار کے ایوانوں اور محل خانوں میں کھلائے جاتے ہیں، ویسے بھی گل کھلانا عجائب خانہ کی پرانی ریت ہے یہاں کی مریادا ہم نے کب گل نہیں کھلائے۔ ہم نے اس وقت بھی گل کھلائے جب مسلم کانفرنس کے ماتھے پر نیشنل کانفرنس کا قشقہ لگایا۔

ہم نے اس وقت بھی گُل کھلائے جب ''محاذ رائے شماری'' کو حرف غلط کی طرح اس کی جگہ زعفرانی اور کیسری رنگ سے ''آوارگی'' لکھ دیا۔ (مضمون: کیسے کیسے گُل کھلاتے ہیں لوگ)

منصور احمد منصوؔر اپنی تحریروں میں ریاست جموں وکشمیر کو ایک عجائب خانہ سے تعبیر کیا ہے۔ ریاستی عوام کی امیدوں اور خوابوں کی لغزشوں کا عجائب خانہ اس ریاست کی تاریخ کے ہر ورق پر ایسے خواب نظر آئیں گے جو کبھی پورے نہیں ہوئے۔ منصور احمد منصوؔر نے کیا غلط لکھا ہے؟

ہم نے رائے شماری کا خواب دیکھا سرینگر راولپنڈی روڈ کھلنے کا خواب، آزادی اور عزت وآبرو کا مقام پانے کا خواب دیکھا لیکن

نتیجہ ہمیشہ ہمارے خوابوں کے برعکس ہی سامنے آیا۔ ہماری ناتمام اورنا آسودہ آرزوئیں ہمیں تڑپاتی ہی رہیں۔

مضموں: (خواب، خاک اور خون)

منصور احمد منصورؔ نے کشمیریوں کی سادہ لوحی کی بنیاد پر ریاست کو ایک عجائب خانہ قرار دیا ہے اگر دیکھا جائے تو منصور احمد نے طنزیہ ومزاحیہ انداز میں کشمیریوں کو جھنجھوڑا ہے اور بیدار کرنے کی ایک بہترین کوشش کی ہے منصور احمد کی تحریریں پڑھ کر ہنسی تو آتی ہے لیکن جب الفاظ اور جملوں میں چھپے ہوئے طنز کا اثر پڑھنے والے کے وجود میں آہستہ آہستہ اُترتا ہے، پھیلتا ہے تو ہنسی شرمدگی اور پچھتاوے میں بدل جاتی ہے۔

منصور احمد منصورؔ میں بے پناہ صلاحتیں ہیں ان کی تحریروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف ان کا مشاہدہ بہت گہرا ہے بلکہ زبان و بیان پر بھی قدرت حاصل ہے۔ عام طور پر سادہ اور سہل اسلوب اختیار کرتے ہیں لیکن موقع ومحل کے اعتبار سے جن خیال کے ساتھ ساتھ حُسن بیان کا مظاہرہ بھی بڑی خوبی کے ساتھ کیا ہے مثلاً:

> ''تو صاحبوں سب جل کے راکھ ہوا'' سوچمن یا قرار خاطر، جسم وجاں ہو یا عزت وناموس مکان ہو یا مکین......سرخ جوڑے میں ملبوس آزادی کی دلہن اپنے ہاتھوں میں خون کی مہندی رچائی ہے۔ یہ اُسی کے ہاتھ آتی ہے جو مرد آزما اور مرد آفریں ہو، اور

جس کے ہاتھ میں طاوس و رباب نہیں بلکہ شمشیر و سناں ہو، جو نعم وناز میں پلا ہو۔ ابریشم نہ ہو بلکہ فولاد سے بھی سخت ہو۔

تحریر: (نہ جنون رہا نہ پری رہی ص:23)

منصور احمد منصوؔر کی تحریروں میں مزاج کی چاشنی کے ساتھ طنز کی جو کاٹ ملتی ہے وہ کشمیر کے عصری حالات اور اہلِ کشمیر کی بے بسی بلکہ بے حسی کے حوالے سے قاری کے دل کی گہرائیوں تک اُتر جاتی ہے۔ مثلاً

''اپنی زمیں تو صدیوں سے خون اگلتی رہی ہے اگر کبھی خدانخواستہ خشک سالی کی وجہ سے زمین خون اگلنا بند کر دیتی ہے تو لیڈر حضرات فوراً ترنگ میں آ کر نعرہ مستانہ بلند کرتے ہیں کہ ''اس زمین کو خون سے سینچو'' چنانچہ جو لوگ اپنی چھونپڑیوں کے ننگے فرش پر خون تھوک رہے ہوتے ہیں وہ نعرہ مستانہ سن کر دیوانہ وار جھونپڑیوں سے نکل کر سڑکوں پر آتے ہیں اور خون تھوکتے ہیں یوں زمین پھر سے لالہ زار بن جاتی ہے''۔

تحریر: (لکھت لکھتی ہے لکھائی نہیں ص:91)

''آیئے عجائب خانہ (یعنی کشمیر) میں کوئی بات کوئی خیال کوئی نقطۂ نظر اپنے مرکز و محور کے ساتھ نبھا نہیں رہتا بلکہ انشائیہ کی طرح بات سے بات لیڈر سے لیڈر اور پارٹی سے پارٹی نکلتی پھیلتی اور بکھرتی رہتی ہے''۔ تحریر: (فکر آفریدی گپ آفرید)

منصور احمد منصور کی کتاب ''کشمیر خواب، سواب، گرداب کا دیباچہ پروفیسر قدوس جاوید ''کشمیر کا درد'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ ڈاکٹر منصور بے باک اور بے خوف لب و لہجے کے بارے میں ان کی رائے ہے

''منصور احمد نے گذشتہ کئی دہائیوں سے ''کشمیر'' کے نام ہونے والی بھانت بھانت کی سیاست اور تجارت کی بازیگری اور شعبدہ بازی کا صرف مشاہدہ نہیں کیا ہے بلکہ ان کے اندر رہ کر ذاتی طور پر تجربہ بھی کیا ہے اور یہ محسوس کیا ہے کہ کس طرح کشمیر خاک و خون اور خواب سراب کے محیر العقول حالات سے گذر کر ایک عجائب خانہ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ کشمیر کو عجائب خانہ سے تعبیر کرنا مصنف کی کشمیر کے ساتھ عقلی اور منطقی ہی نہیں شدید جذباتی اور قلبی وابستگی کی بھی مثال ہے۔ ہاں اس باب میں وہ اکثر اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پاتے۔ ان کی تحریریں پڑھتے ہوئے بعض مقامات ایسے بھی آئے جہاں رُک کر مجھے سوچنا پڑا کہ کہیں منصور احمد کو اپنے بعض جملوں کیلئے جواب دہ نہ ہونا پڑے۔ لیکن پھر ذرا طمینان یہ سوچ کر ہوا کہ جو قدم صدیوں سے مختلف النوع مسائل اور محرومیوں کا شکار رہی ہو اور عذابوں کے ختم نہ ہونے والے پلِ صراط پر چلتے رہنا جس کا مقدر بن چکا ہو۔ اس قوم کے دانشوروں میں بھی اگر بے خوف انتہا پسندی پیدا ہو تو اُسے غیر فطری نہیں کہیں گے''۔

کتاب کے فلیپ پر پروفیسر محمد زماں آزردہ اور پروفیسر ظہورالدین نے بھی اپنی توصیفی رائیں دی اور ڈاکٹر منصور کی ادبی صلاحیتوں کو اعتراف کیا۔

شفیع احمد انشائیے:

شفیع احمد سرینگر سے بیس کلومیٹر دور کھریو قصبے میں پیدا ہوئے۔ سرینگر کے ریجنل انجینئرنگ کالج سے سِول انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ اردو ادب سے دلچسپی کے سبب وادی کے اردو اخبارات کیلئے لکھتے رہے۔ کثیر الاشاعت اخبارات ''آفتاب'' میں اُنکے کئی انشائیے شایع ہوئے۔ ''وادی کی آواز'' کیلئے مزاحیہ خاکے متواتر دوسال تک لکھے۔

2002 عیسوی میں IGNOU سے (Post graduation diploma in jounalism & mass communication) کا امتحان پاس کیا۔ اسکے بعد انگریزی میں لکھنے کی طرف راغب ہوئے۔ چنانچہ سرینگر سے شائع ہونے والے انگریزی اخبار Greater Kashmir میں اُنکے مضامین مسلسل شائع ہورہے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی مقامی اخبارات و جرائد میں بھی انشائیہ اور افسانہ نگاری میں طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں ان کا کشمیری ڈراما ''مے تہٕ لوٗ ڈایلکشن'' ریڈیو کشمیر سرینگر سے نشر ہوا۔ شفیع احمد کے انشائیوں کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ عموماً اپنی ذات کے حوالے سے سامنے کی زندگی اور زمانہ کی کج رفتاری کو دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں سوچ، فکر اور بہاو، شگفتگی،

بذلہ سنجی، مسرت خیزی، اور بصیرت آموزی کے ساتھ اس طرح جاری رہتا ہے کہ قاری خود بھی لاشعوری طور پر اس بہاو کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ شفیع احمد کے انشائیوں میں جدید معاشرہ کے سماجی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی مظام کے کھوکھلے پن کی تہوں کو جس سادگی اور سلیقے سے اُدھیڑا گیا ہے اس کے تعمیر اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور دیکھا جائے تو ایک کامیاب انشائیہ نگار کا یہی اصلی منصب ہوتا ہے۔ شفیع احمد کے انشائیوں کے ان امتیازات کا اندازہ درج ذیل اقتباسات سے لگایا جاسکتا ہے:

ا) ''بچے کے قدم بڑھانے کی خوشی میں ہم سب شریک ہو گئے لیکن اس کے ہاتھوں نقصان اٹھانے کا غم شاید میرے علاوہ کسی اور کو نہ ہوا...... دھیرے دھیرے مجھ میں سب کچھ برداشت کرنے کی سکت پیدا ہونے لگی۔ میں بڑے شوق سے گھوڑا بنا، مجھے کُتے، گدھے، مرغوں وغیرہ کی آوازیں نکالنے کی پریکٹس کرنے کے مراحل سے گزرنا پڑا۔ لیکن اگلے مراحل اس وقت اور دشوار ہونے لگے جب ان صاحب کو ٹی وی پر دکھائی جانے والی فلمیں اور فلمی گانے سمجھ میں آنے لگے۔ اس سے مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ پردے پر آنے والے اداکاروں کے نام مجھے یاد کرنے پڑے جس کے سبب گھر پر فلمی رسائل کا چلن شروع ہوگیا۔ ہر ہفتے یہ فرمائشیں ہونے لگیں کہ مجھے وہ پینٹ چاہیے، بالوں کا اسٹائل یہ چاہیے،

قمیض ایسی چاہیے، جب ان صاحب نے اسکول جانا شروع کیا تو بہت عرصہ ایسا گزرا کہ ان کا دِل اسکول میں نہیں لگتا تھا اور ان کا ''دل لگانے'' کے لئے مجھے دفتر سے چھٹی لینی پڑتی تھی''۔

(من کے والد محترم)

۲) کہیں جانا تو بچوں سمیت بس میں سفر کرنا کس قدر مشکل ہوتا ہے وہ بھی آج کے بسوں میں کہ انسانوں کا کچومر نکل جاتا ہے۔ پھر اتنا اوورلوڈ لے کر یہ بسیں چلتی تو ہیں لیکن پہنچتی کہیں نہیں۔ یہ بیگم صاحبہ کے الفاظ تھے۔

ہمارے اسکول میں سب بچے نئی نئی گاڑیوں میں آتے ہیں ایک میں ہی ہوں کہ پیدل آنا جانا پڑتا ہے اور دوستوں میں میری بے عزتی ہوتی ہے۔ اگر آپ فوراً گاڑی نہ خریدینگے تو میں اسکول جانا بند کروں گا۔ یہ صاحب زادے کی دھمکی تھی، جن کے اسکول جانے یا نہ جانے سے کوئی خاص فرق شاید ہی پڑتا تھا کیونکہ ہوم ورک تو مجھے ہی کرنا پڑتا تھا، کہ میاں صاحب زادے ٹی وی دیکھنے میں مشغول رہتے تھے۔ (گاڑی، میری گاڑی)

۳) اگر پیسہ ہے تو اپنی جانیں نثار کرنے والے ورکروں کی ایک بڑی تعداد آپ کے گھر خود بخود جمع ہو جائیگی۔ آپ انہیں کھانا کھلائیں، گاڑی کا انتظام رکھیں اور الیکشن جیتنے کے بعد نوکری

یا دیگر مراعات فراہم کرنے جیسے وعدے کریں تو پھر یہ مسئلہ کوئی مسئلہ نہیں رہ جائے گا۔ (میں نے الیکشن لڑا)

مذکورہ بالا انشائیوں کے علاوہ بھی مجموعے میں شامل دیگر انشائیوں کا، انشائیہ کے صنفی امتیازات کی روشنی میں جائیزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ شفیع احمد کے انشائیوں میں طنز و مزاح، شگفتگی، چٹکی اور حماقت سے لیکر اصلاح، تعمیر، خود آگاہی اور دانشوری تک کے عناصر ملتے ہیں لیکن علمی اور فلسفیانہ انداز میں نہیں بلکہ فرد اور معاشرہ، زندگی اور زمانہ کے حوالے سے، جینے کی فطری اسلوب میں ابتداء میں ہی کسی انشائیہ نگار کے یہاں ان صفات کا موجود ہونا اس کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

کشمیر کے ادبی منظرنامے پر جو نئے نام ابھر رہے ہیں اور اپنی تخلیقات پس منظر میں اپنا مقام بنانے میں کامیابی حاصل کر رہے ہیں ان میں مشتاق احمد کینیؔ کا نام بھی شامل ہے۔ مشتاق احمد کینیؔ کی شخصیت میں دراصل کئی شخصیتیں پوشیدہ ہیں اور ایک ایڈوکیٹ ہیں۔ ایک ماہرِ تعلیم ہیں اور اس تعلق سے کینیؔ مشن اسکول کے سربراہ ہیں۔ وہ مختلف سماجی اور اصلاحی شخصیتوں سے وابستہ ہیں جن میں اردو اکادمی جموں وکشمیر، کینی ویلفیئر سوسائٹی قابل ذکر ہیں۔ وہ ایک افسانہ نگار بھی ہیں۔ اُن کے افسانوں پر مشتمل اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ ''غافل'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے اُن کے افسانے مختلف جرائد اور اخباروں میں باقاعدہ گی کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ کینیؔ صاحب کی کہانیوں میں مقامی رنگ ملتا ہے۔ مقامی کردار ملتے ہیں۔ اُن کے کردار ہم سب کی نگاہوں کے سامنے گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اُن کی

تحریریں پڑھ کر اکثر لگتا ہے کہ یہ واقعہ میرے ساتھ ہی ہوا ہے یا ہو سکتا ہے۔ وہ صاف ستھرے انداز میں اپنی بات کہنے کے عادی ہیں اس لئے وہ اپنی تحریروں میں خلوص اور سچا لہجہ اختیار کرتے ہیں۔ جن تجربات سے گذرتے ہیں اُن کو اپنی تحریروں میں قید کر لیتے ہیں۔ وہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں اور سچائیوں کو اپنے ڈھنگ سے طنزیہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان تحریروں میں موجود حالات کی کرواہٹ، زندگی کے نشیب و فراز، پستیاں اور بلندیوں مختلف روپ اپنا کر سامنے آتی ہیں ان تحریروں میں انشائیوں کا سا لطف ہے۔ فتح کو شکست، شہر بے پرسان ''مجبوری'' ٹینشن دلچسپ انشائیے ہیں۔ اُن کی تحریروں میں وطن اور اس کی مٹی سے اٹھنے والی خوشبوں اس طرح داخل ہے کہ ان کو الگ کرنا کارے دارد والا معاملہ ہے۔ اُن کے افسانوں اور انشائیوں میں زمینی حقیقتوں کا برملا بیان ملتا ہے۔

ان کے احساسات میں عدم اطمینان، جذبات میں ارضیت، خیالات میں خیر و شر کی کشمکش اور افکار میں ایک مخصوص منظر کے عناصر دستیاب ہیں۔ ''مجبوری''، ''شہر پرسان''، ''صلاح کار''، ''فتح کی شکست''، اور ''قاضی برشوت راضی'' ان کے وہ چند انشائیے ہیں جن سے ان کے وژن کے کئی گوشے بے نقاب ہوتے ہیں۔ کینی صاحب نے کشمیر کے موجودہ پرآشوب دور کے صورت حال میں بگڑنے والے انسانی وجود کی شناخت کا فریضہ انجام دیا ہے۔

اُن کے ایک انشائیہ ''مجبوری'' سے ایک اقتباس :

''حکومت بھی ''مجبور''...... ہو کر تعلیم عام کرو کے پروگرام کو

عملا نے کی دوڑ دھوپ کر رہی ہے...... لاکھوں کروڑوں روپے تعلیم پر خرچ کئے جا رہے ہیں...... پر حاصل ''مجبوری''۔

''ٹینشن'' سے ایک اقتباس:

'''دُلہا بھی ٹینشن میں ہے اور دُلہن بھی۔ دُلہا بارات کو دلہن کے گھر جلد از جلد پہنچانے کے لئے ٹینشن میں ہے۔ اور دُلہن رخصتی ہونے کی وجہ سے ٹینشن میں ہے۔ باراتی تو دیر سے کھانے ملنے کی وجہ سے ٹینشن میں ہیں۔ ٹینشن آشباز کو بھی ہے اور مہمان کو بھی، قصاب بھی ٹینشن میں ہے اور صاحب خانہ بھی، رشتہ دار بھی ٹینشن میں ہیں''۔ [1]

مشتاق احمد وانی کینیؔ اپنی سرزمین اور تہذیب سے جڑے تخلیق کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ ''مجبوری''، ''صلاح کار''، ''ٹینشن'' اور ''شہر بے پرسان'' اُن کے یادگار انشائیے ہیں۔

انشائیہ اُردو کی ایک نئی صنف نثر ہے جس کا فروغ وارتقا زیادہ تر پاکستان میں ہوا۔ اس ضمن میں سرِ فہرست ڈاکٹر وزیر آغا کا نام ہے جنہوں نے اپنی تنقیدی تحریروں اور انشائیوں کے علاوہ پہلے ''ادبی دنیا'' اور بعد ازاں ''اوراق'' میں انشائیہ کے لئے باقاعدہ تحریک شروع کی۔ جس طرح مثنوی کے ساتھ مولانا رومؔ یا پھر میر حسنؔ کا نام ذہن میں ابھرتا ہے اسی طرح انشائیہ کے ساتھ مونیتن جانسن یا پھر وزیر آغا کا نام ذہن میں آتا ہے۔

[1]: ''شہرِ بے پرسان'' (انشائے، افسانہ ''ٹینشن''، صفحہ 26، مشتاق احمد وانی کینیؔ

ریاست جموں وکشمیر میں ابھی اس نئی صنفِ نثر کے فروغ وارتقا میں رنگا رنگ شخصیت کا عکسِ جمیل زندگی کی اشیاء اور مظاہر کو نئے شخصی زاویوں سے دیکھنے اور تاثیر کو اسلوب کی زندگی اور آزادہ روی سے پیش کرنے کے عمل میں کمی دیکھنے کو ملتی ہے۔اس صنف میں نئی نسل ابھی پوری طرح وارد نہیں ہو چکی ہے۔

ریاست جموں وکشمیر کے سفرنامے

(1886عیسوی ......تاحال)

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب کی قریب قریب تمام اصناف کے نہایت عمدہ نموتے ملتے ہیں۔ یعنی شاعری، افسانہ، ناول، ڈراما، انشائیہ، خودنوشت، سوانح عمری اور سفرنامے وغیرہ۔ یہاں کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے اردو زبان وادب کے پودے کو اپنی بساط کے مطابق سینچنے کی کوشش کی ہے۔ عہد بہ عہد بدلتے سیاسی اور سماجی حالات نے بھی یہاں کے ذہنوں کو متاثر کیا اور انہوں نے ہر صنف ادب پر طبع آزمائی کرنے کی کوشش کی۔ ریاست میں اردو نثر کے فروغ اور ترویج واشاعت میں مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں نے بھرپور حصہ لیا۔ اس سلسلے میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے بعض اقدامات اٹھائے جن میں 'بدیا بلاس پریس'' اور ''بدیا بلاس اخبار'' کا اجراء خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے جموں میں ایک دارالترجمے کا قیام بھی عمل میں لایا۔ اس ادارے نے سنسکرت اور فارسی کی کتابیں شائع کیں اور بہت سے مسودے اردو میں بھی ترجمہ ہوئے۔ ان ابتدائی

کوششوں کے سبب ریاست میں اردو نثر کے پھلنے پھولنے اور برگ و بار لانے کے امکانات روشن ہوئے۔ ادبی اور شعری نشستوں کے اہتمام کے ساتھ ساتھ جموں سے ملک راج صراف اور سرینگر سے پریم ناتھ بزاز نے بالترتیب 1934,1964 عیسوی میں ''رنبیر'' اور ''وتستا'' کے نام سے اخبار جاری کئے۔ اس سے یہاں کی ادبی فضا کو ایک نئی زندگی ملی۔ اس دور میں یہاں کے ادبی اُفق پر منشی محمد دین فوقؔ، چراغ حسن حسرتؔ اور دیگر قلمکار ایک کہکشاں کی مانند جگمگ کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی زمانہ ہے جب یہاں افسانوی اور غیر افسانوی نثر کے عمدہ اور قابل ذکر نمونے سامنے آئے۔ پریم ناتھ پردیسی اور پریم ناتھ در نے افسانے کی دنیا میں اپنا لوہا منوایا۔ غیر افسانوی نثر میں چراغ حسن حسرت کے علاوہ تیرناتھ کاشمیریؔ اور گنگا دھر دیہاتی نے انشائیوں، خاکوں کی تحریروں سے اردو نثر میں رنگوں کی ایک قوس وقزح سی بکھیر دی لیکن تقسیم کے نتیجے میں بہت سے قلمکار بکھر گئے اور پھر تقسیم وطن کے بعد یہاں کے ادیبوں کو جس نئی ''سماجی'' معاشرتی، ذہنی اور جذباتی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا، اُسنے اُنہیں ناول اور افسانے کی طرف راغب کیا تا کہ گرد و پیش کی زندگی کے مسائل کی موثر عکاسی کی جاسکے۔ اس کے ساتھ ہی علاقائی زبانوں میں بھی شعر و ادب تخلیق ہونے لگا۔ چنانچہ یہاں اردو کے کئی سرکردہ ادیبوں نے اُردو سے مُنہ موڑ کر اپنی مادری زبان کشمیری کو ترجیح دی۔ اس بدلتی ہوئی صورت حال میں یہاں اگر چہ نثر میں عمدہ اور قابلِ قدر نمونے افسانوں اور ناولوں ہی کی صورت میں سامنے آئے تاہم وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ غیر افسانوی نثر بھی نئے رنگوں ذائقوں اور

ریاست جموں وکشمیر کے سفرنامے

(1886 عیسوی ......تاحال)

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب کی قریب قریب تمام اصناف کے نہایت عمدہ نموتے ملتے ہیں۔ یعنی شاعری، افسانہ، ناول، ڈراما، انشائیہ، خودنوشت، سوانح عمری اور سفرنامے وغیرہ۔ یہاں کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے اردو زبان وادب کے پودے کو اپنی بساط کے مطابق سینچنے کی کوشش کی ہے۔ عہد بہ عہد بدلتے سیاسی اورسماجی حالات نے بھی یہاں کے ذہنوں کومتاثر کیا اور انہوں نے ہر صنف ادب پرطبع آزمائی کرنے کی کوشش کی۔ ریاست میں اردو نثر کے فروغ اور ترویج واشاعت میں مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں نے بھرپور حصہ لیا۔ اس سلسلے میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے بعض اقدامات اٹھائے جن میں 'بدیا بلاس پریس'' اور ''بدیا بلاس اخبار'' کا اجراء خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے جموں میں ایک دارالترجمے کا قیام بھی عمل میں لایا۔ اس ادارے نے سنسکرت اور فارسی کی کتابیں شائع کیں اور بہت سے مسودے اردو میں بھی ترجمہ ہوئے۔ ان ابتدائی

کوششوں کے سبب ریاست میں اردو نثر کے پھلنے پھولنے اور برگ و بار لانے کے امکانات روشن ہوئے۔ ادبی اور شعری نشستوں کے اہتمام کے ساتھ ساتھ جموں سے ملک راج صراف اور سرینگر سے پریم ناتھ بزاز نے بالترتیب 1934,1964 عیسوی میں ''رنبیر'' اور ''وتستا'' کے نام سے اخبار جاری کئے۔ اس سے یہاں کی ادبی فضا کو ایک نئی زندگی ملی۔ اس دور میں یہاں کے ادبی اُفق پر منشی محمد دین فوقؔ، چراغ حسن حسرتؔ اور دیگر قلمکار ایک کہکشاں کی مانند جگمگ کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی زمانہ ہے جب یہاں افسانوی اور غیر افسانوی نثر کے عمدہ اور قابل ذکر نمونے سامنے آئے۔ پریم ناتھ پردیسی اور پریم ناتھ در نے افسانے کی دنیا میں اپنا لوہا منوایا۔ غیر افسانوی نثر میں چراغ حسن حسرت کے علاوہ تیرناتھ کاشمیریؔ اور گنگا دھر دیہاتی نے انشائیوں، خاکوں کی تحریروں سے اردو نثر میں رنگوں کی ایک قوس وقزح سی بکھیر دی لیکن تقسیم کے نتیجے میں بہت سے قلمکار بکھر گئے اور پھر تقسیم وطن کے بعد یہاں کے ادیبوں کو جس نئی ''سماجی'' معاشرتی، ذہنی اور جذباتی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا، اُسنے اُنہیں ناول اور افسانے کی طرف راغب کیا تاکہ گرد و پیش کی زندگی کے مسائل کی موثر عکاسی کی جاسکے۔ اس کے ساتھ ہی علاقائی زبانوں میں بھی شعروادب تخلیق ہونے لگا۔ چنانچہ یہاں اردو کے کئی سرکردہ ادیبوں نے اُردو سے مُنہ موڑ کر اپنی مادری زبان کشمیری کو ترجیح دی۔ اس بدلتی ہوئی صورت حال میں یہاں اگرچہ نثر میں عمدہ اور قابلِ قدر نمونے افسانوں اور ناولوں ہی کی صورت میں سامنے آئے تاہم وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ غیر افسانوی نثر بھی نئے رنگوں ذائقوں اور

خوشبوؤں کے ساتھ اُبھر کر سامنے آئی۔

کشمیر میں غیر انسانوی نثر پر تفصیلی نظر ڈالیں تو سفر ناموں کی صورت میں شکیل الرحمٰن، حامدی کشمیری، غلام نبی خیال، خواجہ ثناء اللہ بٹ اور غلام نبی شیدا کے پانچ سفر نامے ہمیں روس، عراق اور پاکستان کی فضاؤں میں پہنچا کر وہاں کی علمی، ادبی اور معاشرتی زندگی میں جھانکنے کا موقعہ فراہم کرتے ہیں۔ انشائیوں میں محمد زماں آزردہ کے سات مجموعے فکر وشعور کی پھلجڑیاں بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ خاکوں انشائیوں اور رپورتاژ میں شمیم احمد شمیمؔ، سوم ناتھ زُتشی، غ۔م۔ طاؤسؔ اور نثار شاہدؔ کی تحریریں ذہن وشعور کی کروٹیں اپنے اندر سموتے ہوئے ہیں۔ سرگزشتوں میں شیخ محمد عبداللہ (آتش چنار) میر قاسم (داستان حیات) اور سید علی گیلانی (قصہ درد) قابل ذکر ہیں۔

سفر نامے:

سفر نامے اردو میں تحریر کرنے کی روایت دیرینہ ہے۔ لیکن جس طرح مغربی ممالک نے اہم اور مشہور سفر ناموں سے استفادہ کیا ہم ویسا نہ کر سکے۔ اس کی اہم وجہ ہمارے ملک میں بے سواد لوگوں کی بڑی تعداد ہے جن تک سفر ناموں میں مندرجہ تفصیلات پہنچ نہیں پاتیں۔ ہماری اور ہر قوم کی قدیم تاریخ کا ایک اہم اور ضروری سرچشمہ سفر نامے ہی رہے ہیں۔ جن کی تاریخ نویسی کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم مانتے ہیں کہ یونان کے عظیم مورخ ہیروڈوٹس یا ابوریحان البیرونی کا سفر نامہ

''مالا الہند'' یا ہیونگ سانگ کا سفرنامہ ''ہند'' قدیم ممالک کی تاریخ کا بنیادی منبع اور سرچشمہ ہیں۔ چنانچہ آج کل ان سفرناموں کے حوالہ جات پر کوئی بھی اعتراض نہیں کرتا اسلئے کہ ان میں سیاسی اغراض و مقاصد نہیں جو تاریخ کو مسخ کر دیتے ہیں۔ اُس زمانے میں غیر ملکوں کا سفر علم حاصل کرنے کا ایک اہم ترین ذریعہ ہوا کرتا تھا۔ شاید اسی لئے مسلم دانشوروں نے سفر کو ایک نعمت، ایک ضروری عمل اور انسانی فکر میں بلندی اور وسعت حاصل کرنے کا ذریعہ بتایا۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ عرب سیاحوں نے بڑی محنت اور ایمانداری کے ساتھ اپنے سفرناموں میں مختلف اقوام کی زندگی اور عادات و رسوم کے بارے میں اہم تفصیلات سفرناموں کی شکل میں چھوڑ دی ہیں۔ اگر ہم ابتدائی عرب مصنفوں کی اہم تاریخوں پر نظر ڈالیں تو صاف معلوم ہوگا کہ ان میں سفرناموں کے خدوخال اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان میں ابنِ خلدون، بیہقی، ابنِ الندیم اور ابنِ بطوطہ جیسی ہستیاں شامل ہیں جن کو تاریخ اسلام اور تاریخ اقوام کے عظیم منابع بتایا گیا ہے۔ در حقیقت عربوں کی تاریخ اصولی طور پر ان کے سفرنامے ہی ہیں۔

جہاں تک ریاست جموں و کشمیر کا تعلق ہے۔ یہاں اُنیسویں صدی کے آغاز ہی سے کئی یورپی سیاح کشمیر کے دور دراز علاقوں میں گھومتے پھرتے رہے ان میں مورکرافت، بوگل، اسٹائن اور بوہلر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جنہوں نے بڑے اہم اور تفصیلی سفرنامے لکھ کر کشمیر کی تاریخ، تمدن اور معیشت کے بارے میں بیش قیمت اطلاعات چھوڑ دی ہیں۔ مثال کے طور پر اسٹائن کا سفرنامہ کشمیر و

ترکستان جموں وکشمیر کی ثقافتی تاریخ کا اہم سرچشمہ ہے۔ جس کو آج تک ہر مورخ اور صحافی کام میں لاتا ہے۔

ڈائیریاں:

سفرناموں میں ڈائیریاں بھی شامل ہیں۔ یہ چھاپنے کی غرض سے نہیں لکھی گئی تھیں لیکن ان کی بھی تاریخ اور ثقافتی اہمیت ہے۔ جموں میں رنبیر سنگھ کے عہدے حکومت میں مہتہ شیر سنگھ نے بیرون ممالک کا سفر کیا اور واپس آکر اپنے سفر کے حالات و واقعات کو قلم بند کیا جسے سرکاری طور پر ریاست جموں وکشمیر کی پہلی تحریر مانا جاتا ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی نے مہتہ شیر سنگھ کے اس سفرنامے کا حوالہ اس طرح دیا ہے۔

''چودھری مہتہ شیر سنگھ نے 1864-1865 عیسوی کے دوران بخارا کا سفر کیا۔ واپسی پر اُس نے اردو میں اپنا سفرنامہ قلم بند کیا ریاست میں سرکاری طور پر پہلی اردو تحریر تسلیم کی گئی۔ 150 صفحات پر مشتمل یہ سفرنامہ دلچسپ ہے''۔

یہ سفرنامہ دراصل پڑوسی ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات کو استوار کرنے کے پیش نظر لکھا گیا ہے۔ مہتہ شیر سنگھ جو کشمیر سے چل کر براستہ کابل، سمرقند اور بخارا پہنچا اور پھر واپسی پر خوقند، ختن اور کاشغر کے راستے سے ہوتا ہوا تبت اور لداخ چلا آیا اور واپس سرینگر پہنچا۔ اس سارے سفر میں ایک سال سے زیادہ وقت لگا اور واپسی پر اس نے اپنا سفرنامہ تحریر کر کے ڈوگرہ حکمران کو پیش کیا۔ اس زمانے کا ایک اور سفرنامہ عزت اللہ نے تحریر کیا تھا جس کو ''سفرنامہ عزت اللہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ابتدائی نقوش:

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب کی قریب قریب تمام اصناف کے نہایت عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ چنانچہ دوسری تمام اصناف کی روایات کے ساتھ ریاست جموں وکشمیر میں سفرنامے کی روایت بھی ملتی ہے۔

ریات جموں وکشمیر میں سفرنامے کے ابتدائی نقوش ہمیں پنڈت سالگرام سالکؔ کے سفرنامے ''تحفہ سالک'' میں بھی ملتے ہیں۔ بقول برج پریمی :

''تحفہ سالک اُن کا سفرنامہ ہے جس میں دوسرے ممالک کی تواریخ اور جغرافیہ کا سہارا لے کر وہاں کی ترقی کا حال لکھا گیا ہے۔ [1]

غیر افسانوی نثر پر اگر تفصیلی نظر ڈالیں تو سفرناموں کی صورت ملک راج صرافؔ، اوم پرکاش صرافؔ، جگن ناتھ آزادؔ، صوفی غلام محمد، شکیل الرحمٰن، پروفیسر حامدی کاشمیریؔ، خواجہ ثناء اللہ، وجیہ احمد اندرابی، غلام نبی شیداؔ، اور ایڈوکیٹ غلام نبی ہاگرو کے سفرنامے ہمیں روس، عراق، پاکستان، جنیوا کی فضاؤں میں پہنچا کر وہاں کی علمی، ادبی اور معاشرتی زندگی میں جھانکنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ ان حضرات نے جو سفرنامے لکھے اُن میں سے کچھ سفرناموں کو کتابی شکل دی گئی ہے اور کچھ اخبارات میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہے ہیں۔

ملک راج صراف کا سفرنامہ:

سفرنامہ ''میری پاکستان یاترا'' جموں کے مشہور صحافی اور دانشور ملک راج صرافؔ

سے یادگار ہے۔ صرافؔ صاحب 20 نومبر 1989 عیسوی کو پاکستان کے سفر کیلئے روانہ ہوئے۔ دو ہفتے اُنہوں نے وہاں قیام کیا۔ لاہور، سیال کوٹ اور فیصل آباد جیسے بڑے شہروں کو دیکھنا اُن کے اس سفر کا مقصد اپنے دوستوں سے ملنا تھا محض اُسی مقصد اور کامیابی کے ساتھ لوٹے۔ اس کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں محض اپنی انفرادی حیثیت میں ایک ہندوستانی ہونے کے ناطے اپنے ہمسایہ ملک پاکستان میں انسان کو دیکھنے گیا تھا اور مجھے اطمینان اور خوشی ہے کہ میرا یہ تجربہ ناکام نہیں رہا''۔[1]

''پاکستان کے لوگوں نے صرافؔ صاحب کا استقبال گرم جوشی سے کیا''۔

''محبت، خلوص اور عقیدت سے ان سے ملے''۔

''اُنہیں یقین ہوا کہ انسانیت ابھی بھی زندہ ہے''۔[2]

صرافؔ صاحب نے ایک صحافی کی نظر سے پاکستان کے سیاسی اور سماجی حالات کا جائزہ لیا ہے۔ وہاں کے مختلف بازاروں، تاریخی مقامات، مندروں اور گُردواروں کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے سیاسی سرگرمیوں، اخبارات، رسائل و جرائد اور چھپائی کے انتظامات کا جائزہ بھی لیا ہے مختصر یہ کہ اُن کے اس سفرنامے میں جو بات دہرائی گئی ہے وہ ہے وہاں کے لوگوں کا بے پناہ خلوص اور اپنائیت کا جذبہ۔

1: میری پاکستان یاترا، ملک راج صرافؔ۔ ص ۳ جلوۂ صد رنگ ۱۹۸۹۔

2: اوم پرکاش صرافؔ، ''پاکستان میں دو دِن'' مرتبہ ملک راج صرافؔ۔

اوم پرکاش صراف کا سفرنامہ:

سفرنامہ بہ عنوان ''پاکستان میں دو دِن'' اوم پرکاش صراف کا کارنامہ ہے۔
یہ سفرنامہ سیاسی نوعیت کا ہے تقسیم وطن کے بعد پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جموں و کشمیر مسئلہ تنازعے کا باعث بنا۔ درحقیقت انسانیت ناقابل تقسیم ہے اور عوام خواہ کسی بھی جگہ کے ہوں طبیعتاً معصوم ہوتے ہیں۔ یہ سیاست ہی ہے۔ جو کبھی رنگ و نسل اور کبھی مذہب کے نام پر اُن کا استحصال کرتی ہے۔ جس کا خمیازہ نسلوں کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ ملک راج صراف نے اس سفرنامے میں حُب الوطنی کے جذبے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ لطیف جذبہ انسانیت سبھی نفاستوں کے ساتھ اُبھر کر سامنے آجاتا ہے۔

بقولِ اوم پرکاش صراف:

مہاراجہ ہری سنگھ جموں و کشمیر کو آزاد رکھنا چاہتے تھے مگر بڑے پڑوسیوں کی خوشنودی کے بغیر آزادی خواب زیادہ اور حقیقت کم معلوم ہوتی ہے۔
چنانچہ ریاست کے دو حصے ہوگئے۔ یہاں حکومت کی باگ ڈور شیخ محمد عبداللہ نے سنبھالی۔ لیکن کئی وجوہات کی بنا پر اُنہیں 1953 عیسوی میں نظر بند کر دیا گیا۔ چند سالوں کی رہائی کے بعد اُنہیں پنڈت جواہر لال نہرو نے بات چیت کیلئے بلایا اور مشورہ دیا کہ ہندوستان اور پاکستان کو ذہنی طور پر ایک دوسرے کے قریب لائیں۔ شیخ صاحب نے پاکستان کا سفر کیا اوم پرکاش صراف بطورِ صحافی اُن

کے ہمراہ تھے۔ اس سفر کی روداد صراف صاحب نے بڑے دلچسپ انداز میں پیش کی ہے۔ اس سفرنامے کے پڑھنے کے بعد ہندوستان کی تقسیم کا سانحہ جس طرح ہماری آنکھوں کے سامنے آتا ہے اُسے ''شیرازہ'' میں اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

''یہ سفرنامہ سیاسی نوعیت کا ہونے کے باوجود اور پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتا ہے مثلاً: اِسے پڑھتے ہوئے ملک کی تقسیم کا المیہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے کیونکہ وہاں اُنہیں کئی مہاجرین جموں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو بے شک وہاں روزمرہ زندگی میں مصروف ہیں لیکن جن کی روح اپنے وطن میں رہ گئی ہے۔ اُنہوں نے اس جذباتی پہلو کو اُبھارا ہے بطورِ صحافی اُنہوں نے پاکستان کی روزمرہ زندگی کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کیں......''۔[1]

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے سفرنامے:

سفرنامہ لکھنے والوں میں تیسرا نام پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا ہے۔ اُنہوں نے جموں میں بیٹھے بیٹھے وہ کام کیا جو صرف ادبی خزانے میں اضافہ ہی نہ کر سکا بلکہ عالمی سطح پر جموں کا نام روشن کرنے میں معاون ثابت ہوا۔ آزاد صاحب کو اکثر و بیشتر بین الاقوامی سمیناروں میں شرکت کرنے، توسیعی خطبات دینے اور مشاعروں میں شرکت کرنے کے لئے کسی نہ کسی ملک کا سفر کرنا پڑا۔ اُنہیں مختلف ممالک کی سیر و

---

[1]: ماہنامہ ''شیرازہ'' (اردو) جموں و کشمیر میں اردو کے پچاس سال (ص ۲۰۹۔۲۱۰)

سیاحت سے جو تجربات ومشاہدات حاصل ہوئے ہیں اُنہوں نے اُنہیں سفرناموں کی شکل میں قلمبند کیا ہے۔ اور یہ سفرنامے جہاں ہمارے ادبی خزانے میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں وہیں آنے والی نسلوں کیلئے معلومات کا خزانہ بھی ہیں اور بصیرت کی شمع بھی روشن کرتے ہیں۔ ان کے سفرنامے کتابی صورت میں بھی شایع ہوچکے ہیں۔ اُن کا پہلا سفرنامہ ''جنوبی ہند میں دو ہفتے'' دوسرا سفرنامہ ''پشکن کے دیس میں'' اور تیسرا سفرنامہ ''کولمبس کے دیس میں''۔ یہ سفرنامے کتابی شکل میں منظر عام پر آچکے ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کے نامکمل سفرناموں کے بعض حصے مختلف جرائد میں چھپ چکے ہیں۔

صوفی غلام محمد کا روس کا سفر:

صوفی غلام محمد کا ''روس کا سفر'' کے نام سے سفرنامہ ''سرینگر ٹائمز'' اردو اخبار جو سرینگر سے چھپتا ہے میں قسط وار چھپتا رہا۔

شکیل الرحمٰن کا سفرنامہ روس:

جناب شکیل الرحمٰن نے ''قصہ میرے سفر کا'' کے عنوان سے ایک سفرنامہ تحریر کیا اُنہوں نے اپنے روس کے دورے کے تاثرات، مشاہدات اور تجربات قلمبند کئے ہیں۔ اُن کا یہ سفرنامہ روس کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں اور وہاں کے معاشرے کے رنگوں کو دلچسپ پیرائے میں پیش کرتا ہے۔

پروفیسر حامدی کاشمیری کا سفر نامہ پاکستان:

پروفیسر حامدی کاشمیری نے 1986 عیسوی میں ہندوستانی ادیبوں کے وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے پاکستان کا سفر کیا۔ اُن کا یہ دورہ ادبی نوعیت کا تھا۔ حامدی صاحب نے اپنے اس سفر کی دلچسپ روداد ''انجمن آرزو'' کے نام سے رقم کی ''انجمن آرزو'' حد درجہ تاثراتی کا نوعیت کا سفر نامہ ہے۔ اُن کا یہ سفر نامہ اختصار کے باوجود اپنے اندر رنگوں اور روشنیوں کی ایک دنیا سموئے ہوئے ہے۔ حامدی صاحب اس تاثر کو بھی چھپائے نہ چھپا سکے۔ جو ہر ایک کشمیری کے دِل میں چٹکیاں لیتا ہے۔ پاکستان کی اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور محسوس کرنے کی تمنا بہت سے دلوں کے کیلئے صرف ایک حسرت ہے یہ حسرت اور تمنا کن بے تابیوں اور بے قراریوں کو جنم دیتی ہے۔

غلام نبی خیالؔ کا سفر نامہ:

''غلام نبی خیالؔ نے جولائی 1989 عیسوی میں عراق کا دورہ کیا۔ اپنے عراق کے اس سفر کو ''سفر نامہ عراق'' کا عنوان دیا۔ اس سفر کی روداد انہوں نے اپنے اخبار روزنامہ ''اقبال'' میں جنوری تا اپریل 1980 عیسوی میں چوالیس اقساط میں شائع کیا۔ بعد میں اُنہوں نے اس شائع شدہ سفر نامے کی تلخیص اپنی کتاب ''کاروانِ خیال'' میں پیش کیا۔ اپنے اس سفر نامے کو اُنہوں نے افسانوی پیرائے میں پیش کر کے اس کے حُسن کو دوبالا کر دیا ہے اور عراق کی تاریخ، ثقافت،

معاشرت اور علم وادب کے بہت سے پہلو آئینہ ہو جاتے ہیں۔ شہر بغداد کے بار بار اُجڑنے اور دوبارہ بسنے کی داستان بھی اختصار سے پیش کرنے کی اُن کی سعی کامیاب رہی۔ یہ شہر جو نہ صرف تہذیب وتمدن کا قدیم گہوارہ ہے بلکہ یہ عظیم انبیاء کرام، صوفیائے عظیم اور قافلہ حسین کے عشق بلا خیز کی سرزمین ہے۔ اس ضمن میں خیالؔ صاحب نے کاروانِ خیال میں اس طرح ذکر کیا ہے۔

''بابل کے باغات معلقہ، بصرہ کے سندباد، بغداد کے الف لیلوی فسوں اور نجف اشرف کے مقام اقدس سے کاروانِ خیال گذرا تو یکایک میری نگاہوں کے سامنے لہریں مارتا ہوا رواں دواں دریائے فرات آ گیا۔ جس کے کنارے میدان کربلا میں شہدائے اعظم نے تشنہ لبی اور بے سروسامانی کے عالم کرب و بلا میں رضائے حق کی خاطر عظیم ترین قربانی دے کر ایمان اور انسانیت کی پیاسی دنیا کو اپنے خون سے سیراب کیا تھا'' [1]

خواجہ ثناء اللہ بٹ کا سفر نامہ:

خواجہ ثناء اللہ بٹ جو ایک صحافی، ادیب اور دانشور ہیں نے اپنے پاکستان کے سفر کے بعد ''سفر نامہ پاکستان'' کے عنوان سے اخبار آفتاب میں اس سفر کا حال

---

[1]: کاروان خیال۔ غلام نبی خیالؔ (ص ۲۵۳)

قسطوں میں شائع کیا ہے۔ اپنے اس سفرنامے میں اُنہوں نے پاکستان میں صرف اپنے حلقہٗ احباب سے ملاقاتوں اور مجلس آرائیوں کا ذکر کیا ہے۔ نومبر 2009 عیسوی میں ثناء اللہ بٹ کا انتقال ہو چکا ہے۔

غلام نبی شیداؔ (وادی کی آواز کے مدیر) نے بھی پاکستان کا دورہ کیا اور واپس آنے کے بعد اس سفر کی روداد کو اخبار میں بیس قسطوں میں شائع کیا۔ اُنہوں نے اپنے اس سفر کو ''سفرنامہ پاکستان'' کے عنوان سے شائع کیا۔ اپنے اس سفرنامے میں اُنہوں نے مکہ اور مدینہ کے بعد پاکستان ہی کو مقدس سرزمین ٹھہرایا ہے۔

غلام نبی ہاگرو کا سفرنامہ:

سفرناموں کے سلسلے میں ریاست کے معروف وکیل اور سیاسی وسماجی کارکن غلام نبی ہاگرو کا نام قابلِ ذکر ہے۔ ہاگرو صاحب 1993 عیسوی میں جنیوا میں منعقدہ انسانی حقوق سے متعلق سمینار میں شرکت کی اور جنیوا سے واپسی پر اُنہوں نے ''سفرنامہ جنیوا'' تحریر کیا۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں یوسف خان کمبل پوش کا سفرنامہ ''عجائبات فرنگ'' اس صنف کی ابتدا بھی تھا اور اسی سے سفرنامے کی ادبی روایت بھی مستحکم ہوئی تھی۔ بیسویں صدی میں آمدورفت کو بہت وسعت ملی، نتیجہ یہ ہوا کہ بیرونی ممالک میں سفر کرنے کا رجحان روز افزوں فروغ پانے لگا۔ اس دور میں بیشتر سفر کرنے والوں نے سفرنامے لکھے تو ان میں سفر کو آسان بنانے کی ترکیبیں غیرادبی

انداز میں بیان کردیں۔ لیکن چند ایسے سفر نامے بھی لکھے گئے جن میں سفر نامہ نگاروں نے نہ صرف دوسرے ممالک کو دیکھا بلکہ ان کے عجائبات اور تحریرات جمع کئے اور حاصل سفر کو تخلیق انداز میں سپرد تحریر بھی کیا۔

محمد دین فوقؔ کا سفر نامہ کشمیر: (اندرون ملک)

محمد دین فوقؔ کا "سفر نامہ کشمیر" اس خطہ جنت نظیر کو ایک صحافی کی نظر سے دیکھنے کی کاوش ہے۔ فوقؔ نے یہ سفر 1907 عیسوی میں کیا تھا۔ اس سفر نامے کی حیثیت معلوماتی ہے۔ فوقؔ صاحب نے کشمیر کی روح کو گرفت میں لینے کے بجائے اس خطے کے رسوم و رواج اور تہذیبی و سماجی نقوش جمع کرنے میں زیادہ محنت کی۔

ان سفر ناموں کا جائزہ لینے کے بعد اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں یہ صنف اپنی کم سنی کے باوجود ہیتی۔ موضوعاتی اور تکنیکی سطح پر اعلیٰ روایات قائم کر چکی ہے اور یہ سفر نامے ملکی اور بین الاقوامی سفر ناموں کے مقابلے میں رکھے جا سکتے ہیں۔

انسانی زندگی کے لئے سفر ایک ایسی حرارت بخش غذا ہے جو اعضائے جسمانی کو تحریک اور دِل و دماغ کو تازگی بخشتی ہے۔ سفر کے وسیلے سے مسافر کی شخصیت میں ہواؤں کی پاکیزگی اور لطافت، پھولوں کا حسن اور نزاکت، پرندوں کا حوصلہ اور بلند پروازی، پہاڑوں کی بلندی اور عظمت، سمندوں کی گہرائی اور وسعت

کے چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔ مسافر کے قلب پر فطرت اپنے راز آشکار کرتی ہے۔
سفر سے تعلقات میں اضافہ، تجربات میں وسعت اور مشاہدات میں گہرائی اور گیرائی
پیدا ہوتی ہے، اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو پرکھنے اور اصلاح کرنے کا موقعہ ملتا
ہے۔ عظیم شخصیات سے ملاقاتوں کا فخر حاصل ہوتا ہے۔ قدرتی مناظر کی دید سے
قلب ونظر میں کشادگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ سفر کرنے والے میں خود اعتمادی،
وسیع القلبی، کشادہ نظری اور اولوالعزمی کے وہ جوہر پیدا ہو جاتے ہیں جو کسی اور
ذریعے سے ممکن نہیں۔ ریاست جموں وکشمیر کے بہت سے ایسے مسافر ہیں جو ایک
سیاح کی طرح نئی دنیاؤں کی کھوج میں گھر سے نکلے ہیں اور ان گنت مشکلات کا
سامنا کرتے ہوئے اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ کامیابی اُن کے لئے
حیات جاودان بن گئی ہے۔

جموں و کشمیر میں صحافت

(ماضی اور حال)

1919 عیسوی میں جلیانوالہ باغ امرتسر کے سانحہ عظیم کے بعد انگریزی حکومت کی طرف سے پنجاب میں مارشل لا کے نفاذ کے نتیجہ کے طور پر وہاں عوام میں غیر ملکی حکومت کے خلاف جذبہ نفرت مزید زور پکڑ گیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی قیادت میں آزادی کی تحریک مضبوط تر ہوتی گئی۔ ان حالات و واقعات کا اثر ملک کے دوسرے حصوں کے ساتھ ساتھ پنجاب کی پڑوسی ریاست جموں و کشمیر پر بھی قدرتی طور پر پڑا۔ ریاستی عوام ان دنوں شخصی حکومت کے بوجھ تلے کچھ ایسے دبے ہوئے تھے کہ ان کے سوچنے کی قوت تقریباً سلب ہو چکی تھی۔ سیاسی، اقتصادی اور معاشی پسماندگی نے ریاستی عوام کو زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اِن دنوں جموں و کشمیر میں نہ کوئی اخبار چھپتا تھا نہ ہی اس سلسلے میں کسی کو پہل کرنے کی جُرات ہوتی تھی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ دورِ حکومت 1857-1885 عیسوی اور پرتاب سنگھ دورِ حکومت 1885-1925 عیسوی کے عہد میں ایک آزاد منصب اخبار

جاری کرنے کی اجازت طلب کی گئی تھی لیکن یہ اجازت نہیں ملی۔ مہاراجہ کا سخت رویہ دیکھ کر کئی سرکردہ دانشور بیرون ریاست ہجرت کر گئے اور لاہور، سیالکوٹ، امرتسر اور لکھنو سے اپنی صحافتی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کشمیر میں ہو رہے مظالم اور بنیادی حقوق کی خلاف ورزیوں کی ایک موہوم سی تصویر دنیا کے سامنے لانے میں کامیاب ہو گئے۔ مہاراجہ انتظامیہ کسی اخبار کے اجراء کے لئے حصولِ اجازت کی درخواست کو اپنے اقتدار اعلیٰ کے تئیں گستاخی سے کم تصور نہ کرتی تھی۔ اس جاگردارانہ نظام میں بے کاری و بے روزگاری اور بیگاری کی شکار کشمیری قوم قنوطیت کے دلدل میں پھنسی ہوئی تھی۔ تحریر تقریر کے بنیادی حق پر پابندی عائد تھی۔ کشمیر پر باور کرایا گیا تھا کہ وہ زرخرید ہیں جن کے کوئی حقوق نہیں ہیں۔ اُردو زبان کے محقق پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' میں اس حوالے سے رقم طراز ہیں۔

''ریاست میں پریس کے قیام اور اخبار کے اجراء کی اجازت ڈوگرہ حکمرانوں کی مطلق العنانی جاری رہنے تک نہ مل سکتی تھی۔ حالانکہ ہندوستان میں اخبار شائع ہوتے تھے۔ اہلِ ریاست میں بھی اخبار پڑھنے کا شوق ترقی کر چکا تھا اور خود ریاست میں اخبار نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر پنجاب اور لاہور سے شائع ہونے والے اردو اخبارات ریاست میں منگوائے جاتے تھے۔ خود ریاست کے بعض اصحاب نے اخبار جاری کرنے کی اجازت کے لئے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار میں درخواست پیش کی لیکن نامنظور ہوئی''۔

چونکہ برصغیر میں تیزی کے ساتھ تبدیلیاں وقوع پذیر ہو رہی تھیں لہٰذا یہ صورتحال زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکتی تھی۔ صوفی محی الدین لکھتے ہیں:

''ریاست سے باہر ایک نئی دنیا انگڑائی لے رہی تھی لیکن کشمیر ہنوز تاریکی کی ایک دبیز چادر کے نیچے ڈھکا ہوا تھا۔ اس اندھیرے میں ریاست سے باہر کے اخبار روشنی بن کر کشمیر میں داخل ہونے لگے جن سے کشمیر کی پرسکون فضا میں ہلچل پیدا ہوگئی اور صدیوں کا جمود ٹوٹنے لگا''۔

بیرون ریاست سے شائع ہونے والے اخبارات:

ہفت روزہ ''خیر خواہ کشمیر'' لاہور سے 1884 عیسوی میں کشمیر کے مایہ ناز سپوت پنڈت سالگرام سالک نے جاری کیا۔ بعض محققین کے مطابق ''خیر خواہ کشمیر'' 1882 عیسوی میں جاری ہوا اور اس کے مدیر پنڈت ہرگوپال خستہ تھے جو سالگرام سالک کے بڑے بھائی تھے۔ دونوں بھائیوں نے لاہور سے وقتاً فوقتاً کئی اخبار جاری کیے۔ ان کے آباو اجداد نے سکھوں کے عہد حکومت میں کشمیر سے ہجرت کی تھی۔ دونوں لاہور میں پیدا ہوئے۔ دونوں بھائی شعر و ادب کے علاوہ صحافت سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے۔ انیسویں صدی کے ساتویں دہے میں کشمیر لوٹ آئے۔ ''خیر خواہ کشمیر'' ایک معیاری اخبار تھا جس میں ہر طرح کے معاملات پر لکھا جاتا تھا۔ خستہؔ اور سالکؔ نے اور بھی کئی اخبار جاری کئے یا ان سے وابستہ رہے جن میں راوی،

بے نظیر، پبلک نیوز، دیش پکار اور ریفارمر قابلِ ذکر ہیں۔ اس دوران لاہور سے کئی دیگر کشمیریوں نے اخبارات نکالنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ بابو غلام محمد نے 1885 عیسوی میں ہفتہ روزہ ''آئینہ ہند'' لاہور سے جاری کیا۔ یہ سب سے پہلا اخبار تھا جو کسی مسلمان کشمیری نے بیرون ریاست سے جاری کیا تھا۔ اس اخبار میں انگریزی حکومت کے خلاف مضامین چھپتے تھے۔ اس سال پنڈت سرپ دیال کی ادارت میں لاہور سے ہفتہ روزہ ''ہمدرد ہند'' شائع ہوا۔ یہ اخبار مہاراجہ کا سخت مخالف تھا۔ یہ پہلا اخبار تھا جس کا ریاست میں داخلہ ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ الہٰ آباد سے 1898 عیسوی میں سر تیج بہادر سپرو نے ماہنامہ ''کشمیر درپن'' جاری کیا۔ یہ رسالہ اپنے اعلیٰ مضامین کے لئے مشہور تھا۔

محمد الدین فوقؔ کے اخبار:

منشی محمد الدین فوقؔ ریاست جموں و کشمیر کے ایک نامور ادیب، تاریخ دان اور اخبار نویس تھے، جنہوں نے تقریباً چالیس سال کے طویل عرصہ تک ریاست کے عوام کی بالعموم اور مسلمان کی بالخصوص قابلِ قدر قلمی خدمت کی۔ ہفتہ ''پنجہ فولاد'' محمد الدین فوقؔ نے 1901 عیسوی میں لاہور سے جاری کیا۔ یہ اخبار کشمیر میں مہاراجہ حکومت کی بدانتظامی کے حوالے سے خبریں شائع کرتا تھا۔

1906 عیسوی میں ''پنجہ فولاد'' بند ہو جانے کے بعد فوقؔ صاحب اور خواجہ کمال الدین کی مشترکہ ادارت میں ماہنامہ ''کشمیر میگزین'' جاری کیا گیا۔ یہ اخبار بھی

ڈوگرہ راج کا مخالف تھا اور کشمیر کی زبون حالی کا آئینہ دار بھی تھا۔ ماہنامہ کشمیر میگزین کو 1912 عیسوی میں ہفتہ روزہ میں تبدیل کر دیا گیا اور اس کا نام بدل کر ''اخبار کشمیر'' رکھ دیا گیا۔ یہ اخبار بھی کشمیر کے حوالے سے خبریں، تبصرے اور تجزیئے شائع کرتا تھا۔ ''اخبار کشمیر'' 1953 عیسوی تک جاری تھا۔ محمد الدین فوقؔ نے جہاں بیرون ریاست سے بہت سارے اخبارات نکالے وہیں کشمیر سے جاری کرنے کی کوشش بھی کی۔

محمد الدین فوقؔ کی درخواست بنام مہاراجہ پرتاب سنگھ:

11/جولائی 1904 عیسوی کو منشی محمد الدین فوقؔ نے مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو ایک درخواست پیش کی کہ اخبار ''کشمیر میگزین'' سرینگر سے شائع کرنے کی اجازت دی جائے۔ فوقؔ صاحب نے ادبی درخواست میں لکھا تھا۔

''اِس سوشل اور قومی رسالہ کو پولیٹکل اور ملکی معاملات سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور اس کے متعلق کبھی ایک حرف بھی نہ لکھا جائے گا''۔

مگر اس کے باوجود بھی مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے یہ درخواست نامنظور کرتے ہوئے لکھا۔

میں موجودہ وقت میں اِس اخبار کو کشمیر سے شائع کرنے کی اجازت دینے کے حق میں نہیں ہوں۔ دریں اثنا ہائی کورٹ کے جج کو خفیہ ہدایت دی جائے کہ وہ ریاست میں چھاپہ خانہ لگانے اور اخبار

جاری کرنے کے متعلق ایک قانون کا مسودہ وضع کرے جس میں تمام ایسی پابندیاں لگائی جائیں اور پیش بندیاں کی جائیں کہ آزادی تحریر کے ناجائز استعمال کا احتمال نہ رہے۔

(مورخہ 10 جون 1907 عیسوی)

فوقؔ صاحب کی درخواست اور مہاراجہ کا حکم جو اُس وقت کے پرائم منسٹر راجہ امر سنگھ کے نام ہے، محکمہ آرکیوز جموں کے فائل نمبر (1904/P-5) میں موجود ہے۔

ریاست کا پہلا اخبار ''بدیا بلاس'':

جموں و کشمیر میں اردو صحافت کا باضابطہ آغاز مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں ہوا۔ مہاراجہ نے بدیا بلاس سبھا نامی ادارے کو ''بدیا بلاس'' کے نام سے ایک ہفتہ روزہ جموں سے شائع کرنے کی اجازت دے دی۔ ''بدیا بلاس سبھا'' عربی، فارسی اور سنسکرت کے اُن علماء پر مشتمل تھی جس میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ملک کے مختلف کونوں سے بلا کر بدیا بلاس سبھا اور اپنے دربار سے منسلک کیا تھا۔ ''بدیا بلاس'' 1867 عیسوی میں شائع ہوا اور اس کے ایڈیٹر پنڈت گوپی ناتھ گرٹو تھے۔ چونکہ اس میں بدیا بلاس سبھا کی کارکردگی کے حوالے سے رپورٹس شائع ہوتی تھیں لہٰذا اس کی حیثیت ایک گزٹ سے زیادہ نہ تھی۔ '''' ''بدیا بلاس'' بیک وقت اردو اور دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوتا تھا۔ آٹھ صفحات پر مشتمل یہ اخبار ریاست جموں و کشمیر میں اردو صحافت کا اولین نقش تھا۔ پروفیسر عبدالقادر سروریؔ نے ''بدیا بلاس'' کا سن اشاعت

1766 عیسوی ذکر کرلیا ہے۔ محمد یوسف ٹینگ، صوفی محی الدین اور ڈاکٹر برج پریمی نے ہفتہ روزہ ''بدیا بلاس'' 1882 عیسوی لکھا ہے جو درست نہیں۔ رشید تاثیر کے مطابق یہ اخبار 1868 عیسوی میں شائع ہوا۔

ریاست کا اخبار ''رنبیر'' 24 جون 1924 عیسوی:

ایک نوجوان جرنلسٹ ملک راج صراف کے دِل میں اخبار جاری کرنے کا خیال انگڑایاں لینے لگا۔ شیر پنجاب لالہ لاجپت رائے نے اُنہی دنوں 1919 عیسوی میں امریکہ سے ہند واپس آنے کے بعد لاہور سے اردو روزنامہ ''بندے ماترم'' جاری کر دیا تھا۔ مسٹر ملک راج اخبار ''بندے ماترم'' میں اسٹنٹ ایڈیٹر کے طور پر کام کر کے اخبار نویسی کے نشیب و فراز سے روشناس ہو چکے تھے۔ لاہور سے جموں آ کر انہوں نے اپنے دوستوں، مہربانوں اور بہی خواہوں سے جموں سے اخبار جاری کرنے کے متعلق اپنے ارادہ کا اظہار کیا، پڑھے لکھے اور ترقی پسند طبقے نے اس خیال کی پُرزور حمایت کی۔ لیکن رجعت پسند اور مفاد خصوصی رکھنے والے لوگوں نے اس سلسلے میں پیش آنے والے خدشات کا اظہار کر کے اُنہیں اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن صرافؔ صاحب اخبار جاری کرنے کا پختہ ارادہ کر چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے مارچ 1920 عیسوی میں اخبار کے اجراءٗ کی درخواست دے دی۔ یہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کا دورِ حکومت تھا۔ ریاست کا نظم و نسق چلانے کیلئے مہاراجہ صاحب وقت کی قیادت میں تین منسٹروں پر مشتمل ایک کونسل تھی۔ مطبوعات سے متعلق وقت کے مروجہ قانون کے تحت خود حکمرانِ اعلیٰ ہی اخبار جاری کرنے کی

اجازت دے سکتا تھا۔ صرافؔ صاحب کی درخواست دربار میں پہنچی تو سرکار
افسروں نے اس کی پُر زور مخالفت کی۔ اور مہاراجہ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر
ریاست میں یہ ''بیماری'' پھیل گئی تو قدرتی طور پر رعایا دربار سے بدظن ہوکر خود سر
ہوجائے گی۔ صرافؔ نے دوسری درخواست پیش کی۔ مگر وہ بھی مسترد کردی گئی۔ ان
پے درپے ناکامیوں کے باوجود بھی صرافؔ صاحب نے ہمت نہ ہاری، اپنے مقصد
حصول کیلئے اب انہوں نے بیرونی پریس اور پلیٹ فارم کا سہارا لیا۔ لاہور اور دیگر
مقامات سے چھپنے والے اخبارات میں ریاستی سرکار کی اس عوام کش پالیسی کے
خلاف آواز اٹھائی گئی۔ آخر کار 18/مارچ 1924 عیسوی کو مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے
حکم کے مطابق اسٹیٹ کونسل آف منسٹری نے صرافؔ صاحب کو جموں سے اخبار اور
پرنٹنگ پریس چلانے کی اجازت دے دی۔ حکم کے مطابق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے
دفتر میں پانچ سو روپیہ بطورِ زرِ ضمانت جمع کرادیا گیا۔ اس طرح ریاست کا پہلا اخبار
24 جون 1924 عیسوی کو ''رنبیر'' کے نام سے زیور طبع سے آراستہ ہوکر سرکاری
راجدھانی جموں سے جاری ہوا اور عوام کے ہاتھوں میں پہنچا۔

صحافت کا نیا باب:

''رنبیر'' اخبار کے اجراء کے ساتھ ہی ریاست میں صحافت کا نیا باب شروع
ہوا۔ لالہ ملک راج صرافؔ کو اخبار جاری کرنے کیلئے جو جدوجہد کرنی پڑی اس کی
تفصیل اُنہوں نے خودنوشت سوانح "Fifty Years as a Jounalist" میں
درج کی ہے۔

اخبار جاری کرنے کی اجازت کے ساتھ ہی ملک راج صراف کو آگاہ کیا گیا کہ وہ ایسے سیاسی معاملات پر کچھ لکھنے سے احتراز کریں گے جن سے ریاست جموں وکشمیراور برطانوی حکومت یا دوسری ریاستوں کے درمیان تعلقات خراب ہوجائیں۔ 20 مئی 1924 عیسوی کو''رنبیر'' نے اپنی 5 مئی 1930 کی اشاعت میں جموں کے مظاہروں کی خبر کوشائع کرتے ہوئے ان نعروں کوبھی درج کیاجن میں برطانوی سامراج مردہ باد، مہاراجہ ہری سنگھ زندہ باد کا نعرہ شامل تھا۔ برطانوی ریذیڈنٹ ایل، سی، نیگ اور مسٹر وکفلیڈ نے ''رنبیر'' کی ایک کاپی مہاراجہ کو دکھائی اورخدشات کا اظہار کیا۔ برطانوی ریذیڈنٹ ایل سی نیگ نے 8 مئی 1930 عیسوی کوریاستی وزیر داخلہ وجج ہائی کورٹ مسٹر مہتا سے ایک خصوصی ملاقات کے دوران برطانوی حکومت سے مہاراجہ کی وفاداری کواپنا موضوع سخن بنایا۔

9 مئی 1930 عیسوی کومہاراجہ نے ایک حکم نامہ جاری کیاجس میں کہا گیا کہ لالہ ملک راج صراف نے ان شرائط کی خلاف ورزی کی ہے جو18/مارچ1924 کو طے پائے تھے۔ اس حکم نامہ میں ''رنبیر'' پر پابندی عائد کرتے ہوئے اس کی اشاعت بند کرنے کا حکم صادر کیا گیا۔ 9 مئی1930 عیسوی سے13 نومبر 1931 عیسوی تک ''رنبیر'' 18 مہینوں کیلئے بند رہا۔ 18 مہینوں کے نومبر 1931 عیسوی میں ''رنبیر'' پر سے پابندی ہٹائی گئی۔

اس پر صراف صاحب خود بھی حیران تھے۔ لیکن پابندی ہٹائے جانے کی وجوہات کیا تھیں، اس کا اظہار اُنہوں نے رشید تاثیر کے مطابق 9/اگست 1987

عیسوی کو لالہ ملک راج صرافؔ نے انہیں بتایا کہ جب 1931 عیسوی میں مسلمانوں نے زبردست شورش بپا کی اور پنجاب کے مسلم اخباروں نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ مہاراجہ کو مشورہ دیا گیا کہ ان اخباروں کا جواب دینے کیلئے ''رنبیر'' پر پابندی ہٹانی چاہیئے۔

نومبر 1931 عیسوی میں ''رنبیر'' کی پالیسی کے متعلق حبیب کیفویؔ اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' میں لکھتے ہیں۔

''ہفت روزہ رنبیر کی پالیسی حکومت نواز تھی البتہ حکومت پر بھی کبھی کبھی بڑی نرمی سے تنقید کر دیا کرتا تھا''۔

''رنبیر'' نے 1934 عیسوی میں بچوں کیلئے ''رتن'' کے نام سے ماہنامہ ''ضمیمہ'' جاری کیا۔ ماہنامہ ''رتن'' دسمبر 1934 عیسوی جاری ہوا اور اس کے پہلے مدیر، شانتی سروپ نشاطؔ مقرر ہوئے جو رنبیر کے معاون مدیر بھی تھے۔ ''رتن'' کو شمالی ہندوستان میں بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ ''رتن'' ''رنبیر'' سے بھی آگے نکل گیا۔ یہاں تک کہ بچوں کا یہ رسالہ جموں و کشمیر کی سرحدیں عبور کر کے حیدرآباد، بھوپال، رام پور، لاہور، وغیرہ میں پہنچ گیا۔ 1947 عیسوی تقسیم ریاست کے بعد ''رتن'' بند ہو گیا۔ 24 جون 1949 عیسوی کو ''رنبیر'' نے اپنی اشاعت کے پچیس سال مکمل کر لئے۔ لالہ ملک راج صرافؔ نے 18 مئی 1950 عیسوی کو اخبار بند کر دیا۔ ''رنبیر'' کے بند ہو جانے سے ریاستی صحافت کا ایک باب ختم ہو گیا۔

گلانسی کمیشن کی سفارشات ''پریس کی آزادی''

(25/اپریل 1932)

13/جولائی 1931 عیسوی تاریخ کشمیر کا ایک اہم موڑ ہے جس نے قوم کے اندر بیداری کی ایک نئی لہر دوڑائی۔ یہ دن کشمیر کے عزم و آزادی کا پہلا دِن تھا۔اس تحریک کو دبانے کیلئے جاگیردارانہ نظام کے اندر تمام ہتھکنڈے بے کار ثابت ہوئے تو مہاراجہ نے حالات پر قابو پانے کیلئے گلانسی کمیشن قائم کیا۔اس کمیشن کی سربراہی پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کے یورپین اہلکار بی۔بی گلانسی کر رہے تھے۔کمیشن کے دو ممبران غلام احمد عشائی اور پریم ناتھ بزاز کشمیر سے لئے گئے تھے جب کہ دو ممبران چودھری غلام عباس اور پنڈت لوک ناتھ شرما جموں سے مقرر کئے گئے تھے۔گلانسی کمیشن نے 25/اپریل 1932 عیسوی کو اپنی سفارشات پیش کی جن میں اعتراف کیا گیا تھا کہ فی الحقیقت شکایات موجود ہیں اور یہ کہ ان کے ازالہ کی اشد ضرورت ہے۔ گلانسی کمیشن کی سفارشات کے نتیجہ میں مسلمانوں کے مطالبات کسی حد تک تسلیم کئے گئے۔سرکاری ملازمتوں میں داخلہ کے علاوہ تحریر و تقریر کی آزادی حاصل ہوگئی۔ ریاست کے پریس ایکٹ میں ترمیم کی گئی اور اِسے برطانوی ہند میں نافذ پریس ایکٹ کے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کی گئی۔گلانسی کمیشن کی سفارشات کے نتیجے میں مسلمانوں کی نئی سیاسی جماعت مسلم کانفرنس وجود میں آئی۔ شیخ محمد عبداللہ مسلم

کانفرنس کے صدر اور چودھری غلام عباس خان سیکریٹری منتخب ہوئے۔

پاسبان اور وتستا یکم اکتوبر 1932 عیسوی:

یہ اخبار جموں سے منشی معراج الدین احمد نے شائع کیا۔ گلانسی کمیشن کی سفارشات کے بعد یہ پہلا اخبار تھا جو ریاست میں شائع ہوا۔ ''پاسبان'' مسلم کانفرنس کا حامی اخبار تھا۔ 1947 عیسوی تک جموں سے باقاعدگی سے جاری ہوتا رہا۔
وادیٔ کشمیر سے جاری ہونے والا پہلا روزنامہ ''وتستا'' ہے جو 31/ اکتوبر 1932 عیسوی کو سرینگر سے شائع ہوا۔ اس اخبار کے ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر پریم ناتھ بزاز تھے۔ یہ اخبار زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکا اور تقریباً ایک سال سے بھی کم مدت میں بند ہوگیا۔

روزنامہ ''مارتنڈ'' 1932 عیسوی:

روزنامہ ''مارتنڈ'' کشمیری پنڈتوں کی جماعت سناتن دھرم یووک سبھا کا آفیشل آرگن تھا جس سے سبھا نے پنڈت بندھو کی ادارت میں 1932 عیسوی میں جاری کیا۔ اس وقت اخبار کے پرنٹر اور پبلشر گواشہ لال کول تھے۔ پریم ناتھ بزاز کے روزنامہ ''وتستا'' کے بعد یہ کشمیر کا دوسرا روزنامہ تھا۔ یہ اخبار ہمیشہ کشمیری پنڈتوں کے مفادات کی نگہداشت کرتا رہا۔ ''مارتنڈ'' میں جو اہلِ قلم کشپ بندھوں کی ادارت کے دوران لکھتے رہے اُن میں پریم ناتھ پردیسیؔ، ماسٹر زندہ کولؔ، دینا ناتھ نادمؔ، مہجورؔ کشمیری، ارجن دیو مجبورؔ، تیرتھ کاشمیریؔ، پروفیسر نند لال کول طالبؔ، اور دینا ناتھ مستؔ وغیرہ شامل ہیں۔ ''مارتنڈ'' کئی بار حکومت کے عتاب کا بھی نشانہ بنا۔

1980 عیسوی میں ''مارتنڈ'' پنڈت سماج میں باہمی رقابت اور رسہ کشی کا شکار ہوا اور بند ہو گیا۔

ہفتہ روزہ ''خدمت'' 4 مارچ 1938 عیسوی:

ہفتہ روزہ ''خدمت'' کشمیر کی صحافت کا ایک زرین یاب ہے جس نے کشمیر کی صحافت کو اعلیٰ اقدار سے روشناس کیا۔ یہ ہفت روزہ اخبار 4 مارچ 1938 عیسوی کو غلام رسول عارفؔ اور احمد جان کے اشتراک سے سرینگر سے شائع ہوا۔ ''خدمت'' کو اس کی اشاعت کے روزِ اول ہی سے اچھے اہلِ قلم ملے جن کی تحریروں نے اس اخبار کو چار چاند لگائے۔ ''خدمت'' مختلف اوقات میں جن اہلِ حکم نامور صحافیوں کی ادارت میں شائع ہوتا رہا ان میں مولانا محمد سعید مسعودی، حکیم غلام محی الدین، پیر عبدالاحد شاہ، علامہ غلام احمد کشفی، پنڈت کشب بندو اور پنڈت نند لال واتل وغیرہ شامل ہیں۔ مولانا محمد سعید مسعودی کا شمار کشمیر کے نامور صحافیوں میں ہوتا ہے۔

1947 تا 1953 عیسوی تک کوئی ایسا اخبار منظر عام پر نہیں آسکا جس نے کشمیر کی اردو صحافت میں کوئی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اصل میں صحافت کیلئے یہ دور آزمائش کا دور تھا۔ سرحدوں پر تناؤ تھا، ہندوستان اور پاکستان پہلی جنگ لڑ رہے تھے جس کا محاذ کشمیر تھا۔ ریاست کے سرکردہ صحافی غلام نبی خیالؔ اپنے ایک مضمون جموں و کشمیر میں اُردو صحافت اس دور کے صحافتی رجحان کا احاطہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

> 1947 عیسوی کے بعد ریاست جموں و کشمیر میں صحافت مقصدیت کی راہ سے ہٹ کر مکمل طور پر ایک ایسی عامیانہ اور

بے رنگ سیاست میں ڈھل گئی جس میں حریفوں کی پگڑی اچھالنا،
ایک غیر مقبول حکومت کی قصیدہ خوانی اور ذاتی مفادات کی تکمیل
کیلئے ہر غلط اقدام کو صحیح قرار دینا شامل تھا''

(بازیافت جشن زرین نمبر 2007)

1966 عیسوی میں ریاست میں مرکزی پریس ایکٹ کے تحفظ سے صورتحال میں قدرے بہتری محسوس کی جانے لگی۔ اب صحافت کا سفر ایک نئے پڑاؤ پر تھا۔ یہاں قلم ہاتھ میں لئے ایک بندہ گستاخ کھڑا تھا جس نے برسوں کے منجمد لاوے کو پگھلا کر مضامینوں کے انبار لگا دیئے۔

شمیم احمد شمیمؔ نے ہفت روزہ ''آئینہ'' کو منظر عام پر لا کر وظیفہ خوار مدیروں اور شاطر سیاست دانوں کی نیندیں حرام کر کے رکھ دیں۔ ''آئینہ'' کے اجراء کے ساتھ شمیم احمد شمیمؔ نے جہاں وقت کے ساتھ ایک انتھک جنگ کا آغاز کیا وہیں اُس نے اُردو صحافت کو بازیچہ اطفال کے تماشوں سے بھی نجات دلائی۔ شمیمؔ کا لہجہ نشتر کی طرح کاٹتا ہے اُس کے لفظ کانٹوں کی طرح چبھتے ہیں۔ ان شوخ اور بے ساختہ تحریروں نے اخبار ''آئینہ'' کو قارین کے وسیع حلقوں میں اعتماد اور اعتبار بخشا۔ چنانچہ اسی بے پناہ مقبولیت کا نتیجہ تھا کہ 1975 عیسوی میں ''آئینہ'' روزنامے کی صورت میں سامنے آیا۔ اردو کے قدآور اور ناقد محمد یوسف ٹینگ لکھتے ہیں۔

''اُن کی تحریر کی خوشبو اس طرح آہستہ آہستہ کھلی تھی کہ جب صبح کو
اخبار طباعت کی بھٹی سے نکل کر میرے ہاتھوں میں آجاتا تو میں

حیران رہ جاتا تھا۔ یہ بات جیسے سچ لگتی ہی نہ تھی کہ یہ اخبار ہمارے دور اُفتادہ شہر سے نکلتا ہے۔ اس کی میٹھی اور کڑوی کراری اور برجستہ تحریریں پڑھ کر مجھے اپنے اوپر رشک آنے لگتا کہ برصغیر کے دوسرے شہروں کے اخبار بین اتنے تیز وطرار طوفان بدوش اور شرر بار اخبار سے اپنی آنکھوں اور ذہنوں کی ضیافت نہیں کر سکتے''۔

شمیم احمد شمیؔم اور محمد یوسف ٹینگ جیسے معتبر اور ادبی سورماؤں کی ادارت میں ماہنامہ ''تعمیر'' کی بازیافت ہوئی تھی۔ ان اصحاب کے افکار وعقائد نے اس رسالے کے وقار کو چار چاند لگائے اور اس کی نگارشات کو ملک کے اطراف واکناف میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

1970 عیسوی کے آس پاس جو دوسرے اخبارات جاری ہوئے۔ اُن میں غلام نبی خیاؔل کا ''اقبال''، رشید تاثیر کا ہفت روزہ ''محافظ''، عبدالرحمٰن آزاد کا ہفتہ روزہ ''چشمہ حیات''، طاہر ہمدانی کا ہفت روزہ ''نیا دور''، جی ایم ڈار کا ''ولر''، شیخ تجمل الاسلام کا ''شاہی ٹائمز''، فاروق اندرابی کا ''انڈین ٹائمز''، بشیر نوشاد کا ''مارنگ ٹائمز''، عبدالرحمٰن میر کا ''سرینگر ایکسپریس''، نذیر احمد کا ''جہلم'' اور عبدالعزیز کا ''روشنی'' قابلِ ذکر ہیں۔

سرینگر ٹائمز کا اجراء:

''سرینگر ٹائمز'' کا پہلا شمارہ 16رجون 1949 عیسوی کو سرینگر سے منظر عام پر آیا۔ ہفت روزہ ''سرینگر ٹائمز'' کا پہلا شمارہ پانچ سو پرچوں پر مشتمل تھا جو

ہاتھوں ہاتھ بِک گیا۔ چھ ہفتوں کے بعد ''سرینگر ٹائمنز'' کو روزنامہ بنا دیا گیا۔ ''سرینگر ٹائمنز'' کی مقبولیت میں کارٹون نویسی کا بنیادی کردار رہا ہے۔ بشیر احمد بشیرؔ نے اپنی جدت ہنر طبع سے کارٹون نویسی میں ایک بلند مقام حاصل کرلیا ہے۔ اُن کی صلاحیتوں کا اعتراف نہ صرف کشمیر بلکہ بیرون ریاست میں بھی کیا جاچکا ہے۔ بہت سے لوگ صرف کارٹون کی وجہ سے ''سرینگر ٹائمنز'' خریدتے ہیں۔ بشیر احمد بشیرؔ گذشتہ چار دہائیوں سے کارٹون بنا رہے ہیں۔ صوفی غلام محمد نے ''سرینگر ٹائمنز'' کو مقبول عام بنانے کیلئے ناموافق حوصلہ شکن حالات کے باوجود ہر قربانی دی۔ ان کا خمیر صحافت سے اٹھا تھا۔ صحافت ان کا پہلا اور آخری عشق تھا۔ آج ''سرینگر ٹائمنز'' ریاست کا ایک مقبول عام روزنامہ ہے۔

ہفت روزہ ''آفتاب'' یکم جنوری 1954 عیسوی:

ہفت روزہ ''آفتاب'' بہت جلد روزنامہ میں تبدیل ہوگیا۔ روزنامہ ''آفتاب'' کا پہلا شمارہ یکم جنوری 1957 عیسوی کو منظر عام پر آیا۔ اس اخبار نے اپنی گولڈن جوبلی کی خصوصی تقریب کا انعقاد 27/اگست 2006 عیسوی کو انٹرنیشنل کمپلکس میں کیا۔ ''آفتاب'' کی گولڈن جوبلی پر اخبار کے ساتھ دیرینہ وابستگی اور صحافی خدمات کے صلہ میں مرحوم عمر مجید، خواجہ محمد صدیق، شیخ عبدالرحیم، غلام نبی، ظہور ہاشمی اور عبدالرشید (ہاکر) کی دستار بندی بھی کی گئی۔

خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے:

مشہور صحافی ظہیر الدین خواجہ ثنا اللہ بٹ کے کالم کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''خواجہ ثنا اللہ بٹ نے اپنے مخصوص کالم ''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' کو اپنی مظلوم قوم کے مسائل اُجاگر کرنے اور قوم کی بیداری کیلئے استعمال کیا۔ اس کالم کے ذریعہ وہ کبھی معاشرے کی سدھار کیلئے آواز بلند کرتے ہیں اور کبھی زندان خانوں میں قید نوجوانوں کی زبان بن جاتے ہیں۔ کبھی یتیموں اور بیواؤں کی لاچاری پر آنسو بہاتے نظر آتے ہیں اور کبھی اہم سیاسی وسماجی معاملات کے حوالے سے خودساختہ دانشوروں کی بے حسی پر ماتم کرتے نظر آتے ہیں''۔

''خبر زینہ کدل'' روزنامہ آفتاب کا ایک مقبول ہفتہ وار کالم تھا۔ کالم شروع میں ستار شاہد لکھا کرتے تھے۔ ان کے بعد خواجہ ثنا اللہ بٹ ''جلیل جالکدوز'' کے فرضی نام سے کافی عرصہ تک کالم لکھتے رہے۔ ''میری دنیا میرے لوگ'' کالم بھی مختلف فرضی ناموں سے لکھا کرتے تھے۔

شیخ محمد عبداللہ اور شریمتی اندرا گاندھی

(ریاست میں ایکارڈ کے بعد ریاست میں صحافت)

''ایکارڈ'' کے بعد ریاست میں صحافت کا سفر ایک اور تجرباتی مرحلے سے دو چار ہوا۔ اس دور کے آس پاس جو اخبارات منظر عام پر آئے اُن میں ہفت روزہ کنواس، رائے، مادر کشمیر، میر کاروان، امر، سرینگر نیوز، کوہ ہمالیہ، پربت اور برگ سبز وغیرہ بھی شامل ہیں۔

روزنامہ ''نوائے صبح'' طارق عبداللہ اور غلام محمد شاہ نے سرینگر سے جاری کیا۔ یہ اخبار نیشنل کانفرنس کے موقف کی تبلیغ کرتا تھا۔ پہلے دور میں اس کی ادارت طاہر مظفر نے کی۔ بعد میں کچھ دیر تک غلام نبی رتن پوری بھی یہ فرائض انجام دینے کی کوشش کرتے رہے۔

جموں سے بعض نئے راہ روان صحافت میدان عمل میں کود پڑے، بے کفن، جنازہ، پسماندہ عوام، دیدار، لوگوں کے حقوق، لازوال، راجوری، ٹائمنر، ضمیر خلائق، مادر ہند، نوائے جموں اور پونچھ وادی، ایسے بعض اخبارات ہیں جو 1980 عیسوی کے آس پاس صوبہ جموں سے جاری ہوئے۔

کشمیر میں اردو صحافت نئی صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ایک نئے دور میں

داخل ہوچکی ہے۔ میدان صحافت میں پیشہ وارانہ صلاحیتوں کے مالک صحیفہ نگاروں کے آجانے سے پیش رفت کے امکانات زیادہ روشن ہو گئے ہیں۔ میڈیا سے منسلک باصلاحیت اور پیشہ ورنو جوانوں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہورہا ہے۔ کشمیر کا اردو پریس، ملک کے دوسرے بڑے اردو مراکز مثلاً دہلی اور حیدرآباد کے اردو پریس کے معیار پر پورا اترنے کیلئے ہمہ تن مصروف جہد ہے۔ ترقی اور پروفیشنلزم کی اس دوڑ میں وہی اخبار اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہوسکے گا جو صحافت میں رونما ہونے والے جدید رجحانات اور میلانات کا بھرپور ادراک رکھتا ہو۔

اگرچہ صحافت کو جمہوریت کا چوتھا ستون تصور کیا جارہا ہے مگر وادئ کشمیر کے صحافیوں کو کئی مشکلات درپیش ہیں۔

روزنامہ ''آفتاب'' سے ایک اقتباس: (12/نومبر 2013 عیسوی)

وادئ کشمیر میں صحافت مسلسل پریشانیوں اور مصائب کی شکار ہوگئی ہے۔ خوف کے سائے میں اپنے پیشہ وارانہ فرائض انجام دینے کے باوجود صحافیوں کو ہر طرح سے تنگ طلب کیا جارہا ہے۔ اگرچہ صحافت کو جمہوریت کا چوتھا ستون تصور کیا جارہا ہے۔ نامساعد حالات کے دوران انتظامیہ کی جانب سے صحافیوں کے شناختی کارڈ تسلیم کرنے سے انکار کیا جاتا ہے اور انہیں اپنے پیشہ وارانہ فرائض انجام دینے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے۔ دنیا میں صحافت کو معزز اور حساس پیشہ تصور کیا جاتا ہے اور صحافیوں کو لوگوں کے جذبات واحساسات کا ترجمان سمجھا جاتا ہے۔

ریاست خاص کر وادئ کشمیر میں اگرچہ حکومت اور دوسری سیاسی پارٹیاں

بار بار اِس بات کا دعویٰ کرتی ہیں کہ صحافت جمہوریت کا چوتھا ستون ہے اور صحافیوں کو آزادنہ طور پر اپنے پیشہ وارانہ فرائض انجام دینے کی اجازت ہونی چاہئے تاہم وادیٔ کشمیر میں صحافت سے وابستہ افراد کے خوف کے سائے میں رہتے ہوئے اپنے پیشہ وارانہ فرائض انجام دینے کی بھرپور کوشش کرر ہے ہیں۔ تاہم انہیں اپنے کام انجام دینے میں رکاوٹیں آتی ہیں جس کے نتیجے میں حقائق منظر عام پر نہیں آرہے ہیں اور عوام کے ساتھ ساتھ سرکاری اداروں کو بھی مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

موجودہ دور کے بابائے صحافت خواجہ ثناء اللہ بٹ اور دیگر صحافی:

خواجہ ثناء اللہ بٹ کشمیر کی صحافت کا درخشاں ستارہ تھا۔ جس کے ڈوب جانے کے ساتھ ہی ریاستی صحافت میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا جس سے پُر کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ اخبار بینی سے ناواقف تھے اور ان کے جذبات واحساسات کی کہیں پر نہ ترجمانی ہوتی تھی اور نہ ہی قدر، بے سروسامانگی میں وادیٔ کشمیر سے ''آفتاب اخبار'' کی بنیاد ڈالی اور اپنے جذبات واحساسات کا سامنا کرنا پڑا۔

اخبار آفتاب کو غیر جانبدارانہ رکھتے ہوئے اس کے معیار کو بلند کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑ دی بلکہ اخبار آفتاب نے ریاست میں جو مقام حاصل کیا وہ بہت کم اخباروں کو حاصل ہوا۔ خواجہ ثناء اللہ بٹ کو اگر بابائے صحافت کشمیر کا خطاب دیا جاتا تو شائد وہ بھی کم پڑتا۔ اخبار آفتاب شروع کرتے ہوئے اُنہوں نے خاص کر وادیٔ کشمیر میں ایک ایسی شمع روشن کی جو تا قیامت جلتی رہے گی اور اس کی روشنی سے کتنے چراغ روشن ہونگے۔ یہ بیان کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ بابائے

صحافت کشمیر کے لوگوں کے مزاج شناس تھے۔ یہاں کی سیاست، اقتصادیات، ثقافت پر ان کی گہری نظر تھی اور انہوں نے اپنے اداروں میں ایک نہیں سینکڑوں بار اس بات کا برملا اظہار کیا کہ کشمیر کے لوگوں کو ہمیشہ اپنوں نے دکھ دیئے ہیں۔ مصائب و مشکلات میں مبتلا کیا ہے۔ یہاں حقیقت کا اظہار کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ مرحوم نے اپنے 50 سالہ صحافت میں نہ صرف کشمیر کے لوگوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کا حق ادا کیا بلکہ یہاں کے سماجی و سیاسی حالت کو تبدیل کرنے کیلئے بھی اپنی خدمات انجام دیں۔ وادیٔ کشمیر میں صحافت کا جو خواب اُنہوں نے دیکھا تھا اُسے پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہاں کے مظلوم عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنے کیلئے وادیٔ کشمیر سے شائع ہونے والے اخبارات انہیں جگہ دیں تاکہ مظلوم قوم کی دادرسی ادا ہوسکے۔

صوفی محی الدین ایک معروف صحافی اور ادیب:

صوفی محی الدین نے کشمیر کی اردو صحافت کو پروان چڑھانے میں قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ اُن کا صحافی سفر ''نیا سنسار'' سے شروع ہوکر ''سرینگر ٹائمز'' پر ختم ہوتا ہے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ''کشمیر میں ثقافتی تبدیلیاں'' جیسی اہم کتاب ان کے قلم سے نکلی، یہ کتاب 1947 عیسوی کے بعد کشمیر کی تہذیب و ثقافت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی ایک جامع تاریخ ہے۔ کشمیری ثقافتی تبدیلیوں پر اُن کی دوسری کتاب ''کشمیر کی ثقافت کے بدلتے نقوش'' ہے۔ انہوں نے کشمیر کی صحافتی

تاریخ پر قلم اُٹھایا۔

یوسف جمیل:

خواجہ ثناء اللہ بٹ جیسے نبض شناس صحافی نے یوسف جمیل کی صلاحیتوں کا اندازہ پہلی ہی ملاقات میں کرلیا تھا۔ محمد یوسف شاہ سے یوسف جمیل بنانے میں خواجہ صاحب نے بنیادی کردار ادا کیا۔ خواجہ صاحب نے انہیں روزنامہ ''آفتاب'' کا اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر کیا اور یوسف جمیل قلمی نام دیا۔ یوسف جمیل نے ''آفتاب'' میں چار سال تک اپنی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد 1984 میں عالمی نیوز ایجنسی REUTERS اور بی بی سی لندن سے وابستہ ہوگئے۔ اُنہوں نے ''ٹائمز میگزین'' کے علاوہ وائس آف امریکہ اور وائس آف جرمنی کیلئے بھی رپورٹنگ کی۔ 1990 عیسوی میں جب کشمیر میں پر آشوب حالات نے وادی کو جہنم زار بنا دیا تھا، اس وقت یوسف جمیل کی رپورٹنگ نے کشمیریوں کی آواز کو بین الاقوامی سطح پر اُجاگر کیا۔ اپنے مشاہدات و تاثرات کو اُنہوں نے قسط وار ''سفرنامہ پاکستان و آزاد کشمیر'' کے عنوان سے ہفتہ روزہ ''کشمیر عظمیٰ'' میں شائع کیا۔ اس وقت Asian Age اور دکن کرانیکل کے خصوصی نامہ نگار ہیں۔

خالد بشیر:

خالد بشیر روزنامہ ''آفتاب'' سے 1979 عیسوی میں وابستہ ہوئے۔ اُنہوں نے اپنی ملازمت کا آغاز محکمہ اطلاعات میں بطورِ ایڈیٹر کیا۔ وہ مختلف محکموں میں کلیدی عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ وہ ڈائریکٹر محکمہ لائبراریز اینڈ ریسرچ،

ڈائریکٹر آرکائیوز، آرکیالوجی اینڈ میوزیم اور ناظم اطلاعات کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ وہ سابق وزیر اعلیٰ غلام نبی آزاد کے میڈیا آفیسر کے طور پر بھی کام کر چکے ہیں۔ 2012 عیسوی میں وہ جموں وکشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز کے سیکریٹری تعینات کیئے گئے۔

خالد بشیر کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اُن کی پہلی کتاب 1983 عیسوی میں ''صدائے نیم شب'' منظر عام پر آئی۔ 2008 عیسوی میں اُن کی دو تصانیف ''دیدہ آب رواں'' اور ''خواب پارہ'' منظر عام پر آئیں۔ اس وقت وہ انگریزی میں "Kashmir Revisited" کے عنوان سے ایک اور تحقیقی کتاب لکھ رہے ہیں۔ 1984 عیسوی میں کلچرل اکادمی کی جانب سے 2010 عیسوی میں ایک بار پھر اُن کی کتاب ''دیدہ آب رواں'' کو اکادمی نے بہترین کتاب قرار دیا۔

1989 عیسوی کے بعد کشمیر پریس:

1989 عیسوی کے بعد کشمیر پریس دباؤ اور بدترین حالات سے دوچار ہوگیا۔ یہ دور کشمیر پریس کیلئے زبردست چلینجز لے کر آیا۔ درجن بھر صحافی تشدد کا نشانہ بنے۔ ریاست پُر آشوب دور سے گذر رہی تھی۔ مخدوش حالات میں کشمیری قوم ہر گذرتے لمحے کے ساتھ بے یقینی اور انتشار کا شکار ہو رہی تھی۔ صحت مند اور مثبت میڈیا کا قیام کشمیر کی صحافتی تاریخ میں ہمیشہ ایک بڑا مسئلہ رہا ہے۔ خبروں کی ترسیل کے ساتھ ساتھ تہذیب وتمدن، ادب وشاعری اور املا وانشا کے حوالے سے بہت سی

باتیں اصلاح طلب اور بحث طلب ہیں۔ ریاست کے اخبار زبان و بیان کے معیار پر کھرے نہیں اُترتے ہیں دہلی اور حیدر آباد کے اخبارات سے وابستہ زیادہ صحافی علم و ادب اور شاعری سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اسلئے ان اخبارات پر علمی و ادبی چھاپ ہے جب کہ ریاست کے اخبارات میں عام بول چال کی زبان استعمال ہوتی ہے۔ زبان کے تین پہلو ہیں۔ علمی، ادبی اور مواصلاتی۔ ان تینوں پہلوؤں کی ترقی وترویج اور تحفظ کی ذمہ داری صحافت پر عائد ہوتی ہے۔

اردو صحافت کو درپیش مشکلات:

۱) اقتصادی طور اُردو اخبار نویسی کمزور ہے۔ جتنے بھی اردو اخبار شائع ہوتے ہیں ان کی مالی حالت بے حد کمزور ہے جس کی وجہ سے اخبار کا معیار صحیح نہیں ہوتا ہے۔ مالی حالت کی وجہ سے ہی تقریباً ہر اردو اخبار بہت جلد بند ہو جاتا ہے۔

۲) یہ اخبارات اور رسائل گیٹ اَپ کے لحاظ سے صحیح نہیں ہوتے۔ کیونکہ چھاپ خانہ ترقی یافتہ نہیں ہیں اس لئے پرنٹنگ کے اعتبار سے بھی معمولی ہوتے ہیں۔

۳) نیوز ایجنسی کی کمی بھی اردو صحافت کو درپیش ہے۔

۴) زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ اخبارات کافی کمزور ہیں۔

۵) ان میں خبروں کا معیار بھی بہت معمولی ہوتا ہے۔

۶) اُردو اخبارات اور رسائل کو اقتصادی طور پر تعاون کی ضرورت ہے۔ لیکن تقریباً کوئی بھی ادارہ ایجنسی اردو اخبارات کو اشتہارات چھپوانے کو نہیں دیتی اور اشتہارات کی کمی کی وجہ سے بھی اوردو صحافت کو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۷) اردو صحافت کو ٹکنیک کا مسئلہ بھی درپیش ہے۔

۸) صحافت کیلئے تربیت یافتہ ہونا بے حد ضروری ہے لیکن ریاست میں تربیت یافتہ صحافیوں کی بھی کمی ہے۔

۹) اُردو صحافت کی طرف لوگ اس وجہ سے بھی کم دلچسپی لے رہے ہیں کہ اِن کا جھکاؤ انگریزی کی طرف ہے 1947 عیسوی سے پہلے تقریباً دو سو اردو اخبارات شائع ہوتے تھے۔ لیکن اس وقت مشکل سے سو اخبار شائع ہوتے ہیں اور معیار کے اعتبار سے یہ بہت کمزور ہوتے ہیں۔

۱۰) ان اخبارات اور رسائل میں پرانی معلومات اور پرانا ادبی مواد ہوتا ہے نیا ان میں صفر کے برابر ہوتا ہے۔

۱۱) ان تمام خامیوں کے باوجود ان اخبارات اور رسائل کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ اس لئے بھی ان کی خرید و فروخت بہت کم پیمانے پر ہوتی ہے۔

۱۲) اردو صحافت کا مقصد زبان و ادب کو فروغ دینے سے کہیں زیادہ پیسہ کمانا ہے اس کے نتیجے میں بھی اردو صحافت کے معیار میں کمی آرہی ہے۔

۱۳) اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کرنے کی آزادی صحافیوں کو حاصل نہیں ہے اور اگر حاصل ہے بھی تو یہ صحافی حقیقت سے منہ موڑتے ہیں اسلئے ان اخبارات اور رسائل میں سچ بہت کم ہوتا ہے۔

ان تمام باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ امکانات سامنے آتے ہیں کہ اردو صحافت کا مستقبل ریاست جموں و کشمیر میں کوئی خاص روشن نہیں ہے۔ اس کے

مستقبل کو خطرہ لاحق ہے اب اردو زبان و ادب کو بھی کوئی خاص فروغ نہیں مل رہا ہے۔ اردو صحافت سرکار کی بے توجہی کا شکار ہونے کے باوجود اب بھی اس میں تھوڑا بہت دم باقی ہے۔ ریاست میں اعلیٰ اردو دان اور دانشور موجود ہیں جو نہ صرف ادب بلکہ صحافت پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ یہ تمام شخصیات اردو کی ترقی اور فروغ کیلئے اپنی آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں اردو پروفیشنل کورسز جاری کئے گئے ہیں اور انگریزی اخبارات کے ذریعے اردو زبان کو اس کا مقام دلانے کیلئے آواز اٹھاتے رہتے ہیں۔ اگر دوبارہ ریاستی حکومتیں اس زبان و ادب پر توجہ دیں تو ایک بار پھر اردو صحافت میں تیز رفتاری آسکتی ہے۔ اردو صحافت کو دوبارہ ترقی کے مراحل طے کرنے کے مواقع مل جائیں گے۔ یہاں یہ کہنا یکسر غلط ہوگا کہ ریاست جموں و کشمیر میں اردو کا مستقبل تاریک ہے البتہ اردو صحافت بے حد کمزور اور سُست رفتار ہے۔ اگر اردو دان، شاعر اور ادیب اپنی روش پر چلتے ہوئے اسے مزید وسعت بخشتے رہے تو پھر سے یہاں کی اردو صحافت عروج پر پہنچ سکتی ہے۔ اردو ادب و صحافت کیلئے یہ بات بھی خوش آئندہ ہے کہ موجودہ دور کی نئی نسل اسکی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہو رہی ہے۔ یہ لوگ اردو کی ترقی کے خواہاں ہیں۔ اس کے فروغ کیلئے اردو کے پروفیشنل کورسز بھی کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ چھوٹے شہروں، قصبوں اور تعلیمی اداروں میں مختلف ادبی پروگراموں کا انعقاد کراتے رہتے ہیں ان لوگوں کی اردو سے اتنی گہری دلچسپی اور جھکاؤ اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ ریاست میں ایک بار پھر اردو صحافت کی زبردست تیز رفتاری کے امکانات باقی ہیں۔

ادبی صحافت:

صحافت کی دوسری قسم ادبی صحافت ہے۔ اس میں ادب کی تمام اصناف شامل ہیں نظم، غزل، افسانہ، انشائیہ، ڈرامہ کو اخبارات اور رسائل کے ذریعے عوام تک پہنچانے کا نام ادبی صحافت ہے۔ صحافت عربی زبان کا لفظ ہے یہ صحف سے ماخوذ ہے اس کے معنی کتاب یا رسالے کے ہیں۔ صحافت کو انگریزی میں jounalism ہندی میں ''پتر کاری'' اور اردو میں اخبار نویسی کہتے ہیں۔ اس کے موضوعات بے حد وسیع اور عریض ہوتے ہیں۔ یہ شعبہ اپنے آپ میں ایک کائنات ہے۔ یہ زندگی کی تمام گوشوں سے جڑی ہوتی ہے۔ اس کا مقصد حقیقت سے متعارف کرانا ہوتا ہے۔ ادبی دنیا میں بھی صحافت کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ اس کے ذریعے ہی اردو ادب کا دامن بے حد وسیع ہو گیا۔ اس طرح اس بات کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ کہ ادب اور صحافت کا رشتہ کس قدر گہرا ہے۔ صحافت کے ذریعہ زبان کے اسلوب اور ماحول کی اس کے اوپر اثر انداز تبدیلیوں وغیرہ کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

فرانس اور انگلستان میں ادبی صحافت کا آغاز:

سترھویں صدی عیسوی میں روم، چین، جرمنی اور برطانیہ سے صحافت کا آغاز ہوا۔ اور ادبی صحافت کا باقاعدہ آغاز اٹھارہویں صدی میں انگلستان سے ہوا۔ اس زمانے میں الگ سے کوئی ادبی رسالہ نہیں تھا۔ اسلئے تمام ادبی مواد خاص طور سے انشائیہ اخبارات وغیرہ میں شائع ہوتے تھے۔ اس طرح کی صحافت کا آغاز فرانس سے ''مونٹین'' نے کیا۔ اور انگلستان میں، اربری، بین جانسن اور جان ارل نے

اسے عروج پر پہنچایا۔ ان لوگوں نے ٹیٹلر، جینٹلمین، اسپیکٹیٹر اور گارڈین جیسے ادبی رسائل، اخبار اور روزنامچے شائع کیے۔ ان ادیب وصحافیوں کا مقصد تمام دنیا کو نئے خیالات اور نئی روشنیوں سے متعارف کرانا تھا۔ اس طرح کی صحافت کو دنیا بھر میں مقبولیت ملی۔

انیسویں صدی میں ہندوستان اور ریاست جموں وکشمیر میں ادبی صحافت کا آغاز:

انیسوی صدی کے آغاز میں ہندوستان میں بھی ادبی صحافت وسیع پیمانے پر ہونے لگی۔ یہاں صحافت کا آغاز فارسی زبان میں ہوا۔ اس درمیان بہت سے اردو اخبار شائع ہوئے۔ ان میں سب سے اہم اخبار مولوی باقر کا ''دہلی اردو اخبار'' ہے مولوی باقر کا یہ اخبار مختلف ناموں سے شائع ہوتا رہا۔ اور مولانا محمد حسین آزاد کی ادارت نے اس اخبار کی عظمت، شہرت اور معیار کو عروج پر پہنچایا۔ یہ 1836 عیسوی میں شائع ہوا تھا۔ اس میں سیاسی، سماجی خبروں کے علاوہ اُس عہد کے شاعر اور ادیب چھپتے تھے۔ غالب،، بہادر شاہ ظفر،، زینت محل،، ذوقؔ اور مومن وغیرہ اس میں چھپتے رہتے تھے۔ 1857 عیسوی میں اخبار ہمیشہ کیلئے بند ہوا۔ مولانا محمد حسین آزاد کی نثر اور نظم بھی اس میں شائع ہوتی تھیں۔ 1857 عیسوی کے فسادات پر مبنی نظم ''تاریخ انقلاب عبرت افزا'' بھی پہلی بار اس میں چھپی اور عوام تک پہنچی۔ 1837 عیسوی میں سرسید احمد خان کے بھائی سید محمد خان نے سید الاخبار شائع کیا۔ 1947 عیسوی میں ماسٹر رام چندر نے ادبی ماہنامے ''محبّ ہند'' اور ''خیر خواہ ہند''

جاری کئے ماسٹر رام چندر نے اس سے پہلے 1964 عیسوی میں فوائد الناظرین جاری کیا تھا۔ 1952 عیسوی میں رسالہ ''آزاد'' بدری ناتھ کول نے سرینگر سے 1954 عیسوی میں محکمہ دیہات سدھار نے سرکاری رسالہ ''دیہات سدھار'' اس سے پہلے 1948 عیسوی میں محکمہ اطلاعات نے سرکاری رسالہ ''تعمیر'' اور 1956 عیسوی میں محکمہ تعلیم نے اہم رسالہ ''استاذ'' جاری کئے۔ 1959 عیسوی میں سرکاری ادارے کلچرل اکادمی نے ''ہمارا ادب'' اِسی اکادمی نے 1964 عیسوی میں رسالہ ''شیرازہ'' جاری کئے۔ 1952 عیسوی میں سرینگر سے ''ہما'' 1965 عیسوی ''خاتون'' فہمیدہ بیگم کی ادارت میں 1965 عیسوی جموں سے گوجر دیس 1966 عیسوی میں یہیں سے ادبی سنگم انجمن نے رسالہ ''جھرنا'' 1964 عیسوی میں جموں وکشمیر انسٹیٹیوٹ آف ایجوکیشن نے ''ابتدائی تعلیم 1967 عیسوی میں سعید وحشی ساحل نے ''نگینہ'' وغیرہ جیسے اہم رسائل جاری کئے گئے۔ اس کے بعد اُسی کے عشرے تک ان رسائل کی تعداد بڑھتی گئی۔ لیکن اُسی عشرے کے آخری سالوں میں ریاست کے بدترین اور بگڑتے ہوئے حالات نے ایک بار پھر سے پوری ریاست کے نظام کو تہس نہس کر کے رکھ دیا باقی تمام شعبوں کی طرح اس میں بھی سست رفتاری آ گئی۔ اس دوران بہت کم رسائل اور اخبارات جاری کیے گئے اور بہت جلد ان کو کسی نہ کسی بنیاد پر بند کرنا پڑا۔ 1996 عیسوی کے بعد ایک بار پھر حکومت بننے کے بعد اس شعبے میں جان آ گئی۔ فاروق حکومت کے دوران کئی اہم رسائل اور اخبار جاری ہوئے۔ اس زمانے میں شائع ہونے والے دو اہم رسائل سرینگر سے رسالہ ''جہات'' اور

جموں سے رسالہ ''تسلسل'' جاری کئے گئے۔ 1998 عیسوی میں رسالہ ''جہات'' [
حامدی کاشمیری نے شائع کیا۔ اور اِسے بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی۔ اِسی
سال 1998 عیسوی میں جموں سے رسالہ ''تسلسل'' شعبہ اردو جموں یونیورسٹی کے
مختلف شہروں کے ادیب وصحافی ان ادیبوں کے ساتھ نہ صرف شانہ بشانہ چلنے لگے
بلکہ یہ لوگ طویل عرصے تک جموں وکشمیر میں مقیم رہے ان لوگوں نے سمینار، اجلاس
اور مشاعروں کا انعقاد بھی کرایا اور ریاست میں اردو کو مزید جلا بخشی۔ یہ اہم شخصیات
منظر اعظمی، کمال احمد صدیقی وغیرہ ہیں۔ ان لوگوں نے بے شمار تخلیقات وجود میں
لائیں۔ ان کے ذریعے ریاست میں تمام ادبی اصناف کو از سر نو فروغ ملا۔

ان تمام رسائل اور شخصیات کی وجہ سے ریاست میں زبان وادب کو کافی
ترقی ملی۔ اردو ریاست جموں وکشمیر کے کسی علاقے کی زبان نہیں ہے لیکن اردو کے
خدوخال یہاں بہت پہلے سے موجود تھے خطہ جموں کی زیادہ تر علاقوں کی زبان
ڈوگری ہے یہ زبان پنجابی سے بے حد قریب ہے اس حوالے سے اردو کے نقوش
پہلے سے ہی یہاں موجود تھے۔ لیکن ریاست میں ادبی صحافت کا آغاز لاہور کے
اخبارات اور رسائل کے ذریعے ہوا۔ عوام نے اس زبان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور یہاں
نہ صرف زبان کو فروغ ہوا بلکہ تنقید، تحقیق، افسانہ، ڈرامہ، ناول، انشائیہ، طنز ومزاح،
نظم، غزل، قطعات، رباعیات غرض ادب کی ہر صنف عروج پر پہنچ گئی۔ دراصل اس
سے پہلے لوگوں کے پاس اظہار خیال اور اظہارِ بیان کا کوئی ایسا ذریعہ نہ تھا جسے سب
سمجھ سکیں کیونکہ ریاست کے کئی علاقوں کی اپنی علاقائی زبانیں ہیں اس لئے اس بات

کی اشد ضرورت تھی کہ کوئی ایک زبان ایسی ہو جسے سب سمجھ سکیں، پڑھیں، لکھیں اور بول سکیں۔ چنانچہ اردو زبان ہی ایک ذریعہ کے طور پر استعمال ہونے لگی اور ادبی صحافت نے اسے بام عروج پر پہنچایا کیوں کہ صحافت عوام کی خواہشات، خیالات اور بیانات کی بہترین ترجمان ہے صحافت نے گویا عوام کو زبان بخش دی، شیخ محمد عبداللہ کے دورِ حکومت میں ریاست میں اردو کی طرف سب سے زیادہ توجہ دی گئی۔ اردو کو ریاست جموں و کشمیر کے آئین میں پہلے درجے کی زبان قرار دیا گیا۔ اس کی مزید ترقی اور فروغ کیلئے کئی ادبی اور علمی ادارے قائم کئے گئے۔ شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں نے بے شمار اردو اخبارات اور رسائل کی اشاعت شروع کردی تھی۔ بیش قیمتی ترجمے کئے گئے۔ یہ ترجمے زیادہ تر ڈوگری اور کشمیری کتابوں سے کئے گئے تمام دفاتر کی سرکاری زبان اردو قرار دی گئی۔ لیکن شیخ عبداللہ کے بعد کسی بھی حکومت نے اس کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہ دی۔ ان لوگوں کا جھکاؤ اردو سے کہیں زیادہ انگریزی کی طرف رہا۔ جب کہ آزادی سے پہلے ہی یہاں اردو عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اس کا اعتراف خواجہ غلام الدین اور بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی بہت سی تحریروں اور تقریروں میں کیا ہے۔

اس وقت اردو ریاست کی سرکاری زبان ہوتے ہوئے بھی محکمہ پولیس اور عدالت کے علاوہ تقریباً سبھی دفاتر سے ہٹا دی گئی ہے۔ سرکاری زبان ہونے کے باوجود تمام سرکاری کام اس زبان میں نہیں ہوتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو یہ آئین کی خلاف ورزی ہے۔ سرکار کی اس بے رحمی اور لاپرواہی کی وجہ سے اس وقت بڑا مسئلہ

اردو زبان کے زندہ رہنے کا ہے۔ اردو صحافت بے حد کمزور ہے۔ اخبار نویس مالی اعتبار سے کمزور ہیں۔ اس لئے اخبارات گیٹ اَپ، معیار اور فن غرض ہر اعتبار سے کمزور ہیں۔ اعلیٰ اردو مضامین، انشائیہ، ڈرامہ، افسانہ، غزلیں، نظمیں، غرض ہر صنف میں لکھنے والوں کی کمی بھی درپیش ہے۔ یہاں تک کہ اداریہ لکھنے والوں کی کمی۔ اعلیٰ پیمانے کے مضامین لکھنے، تربیت یافتہ صحافیوں کی کمی غرض ہر لحاظ سے اردو صحافت کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن بھی اس کے فروغ میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کر رہا ہے۔ رسائل اور اخبارات کی تمام خامیوں کا ذمہ دار اصل میں پیسہ کمانے کا مزاج ہے۔ یہ اخبارات سچ بھی نہیں بولتے اور نہ ہی انہیں کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی خواہش اور نہ ہی اجازت ہے۔

ان تمام باتوں کے باجود اردو کی ترقی کے امکانات روشن ہیں کئی اردو کے شیدائی ادبی مجلسوں، مشاعروں اور سمیناروں کا انعقاد کراتے رہتے ہیں۔ جموں میں غیر سرکاری ادبی اکادمی قائم کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ پروفیشنل اُردو کورسز کرائے جارہے ہیں اور یہ نئی نسل بھی ادبی پروگرام کالجوں، سکولوں، چھوٹے شہروں، قصبوں وغیرہ میں کراتی رہتی ہے۔ یہ بھی روشن مستقبل کی طرف اشارہ ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی ادبی تنظیمیں اپنی ادبی کارکردگیوں اور تمام ادبی پروگرام کی رپورٹنگ اخبارات میں کالم اور مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔ ان مضامین کو شائع کرانے والوں میں ریاست کے اعلیٰ ادیب اور دانشور بھی شامل ہیں۔ ان باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں اردو کو نہ صرف زندہ رہنے بلکہ ترقی اور فروغ کے ابھی امکانات بھی باقی ہے۔

کلچرل اکادمی کے رسالوں نے بہت کم عرصے میں ملک بھر کے ادبی رسالوں میں اپنا مقام بنایا۔ سالانہ ''ہمارا ادب'' اور ماہنامہ ''شیرازہ'' عرصہ دراز سے اردو ادب کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ فن اور معیار دونوں کے اعتبار سے اعلیٰ ہیں اور ان میں لکھنے والے تمام ملک کی نامور ادبی شخصیات ہیں۔ ریاست کے ممتاز ادیب اور شاعر بھی اس میں چھپتے رہتے ہیں۔ ان رسائل نے جدید ذہن اور خیالات کو ابھارا ہے۔ ان میں جدیدیت کا رجحان سامنے آتا ہے۔ ان رسائل کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ریاست میں تمام نثری اور نظمی اصناف پر طبع آزمائی کی جارہی ہے اور ادیبوں کو ان اصناف پر زبردست عبور حاصل ہے۔ ان تحریریں میں کلاسیکی اسلوب کے علاوہ نئے نئے تجربات بھی پائے جاتے ہیں۔ نظمیں اور غزلیں بھی اعلیٰ پیمانے کی ہوتی ہیں۔ نامور شعرا کا کلام ان میں چھپتا ہے۔ ان رسائل کے مطالعہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ آزادی کے بعد اردو ادب میں شعری اصناف پر جتنی بھی نئی ہستیوں کا تجربہ ہوا ہے اور نظم گوئی کے جتنے بھی اسالیب منظر عام پر آئے یہ رسائل ان کی ترجمانی کرتے ہیں۔

محکمہ اطلاعات کا رسالہ ''تعمیر'' کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ صرف ریاست جموں وکشمیر کے ادیبوں اور شاعروں کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کا معیار کافی بلند ہے۔ اگر تمام ملک کے نامور ادیب وصحافی اس میں چھپتے تو اس کا معیار پہلے سے کہیں زیادہ بلند ہتا اور ''ہمارا ادب'' اور ''شیرازہ'' کی طرح یہ رسالہ بھی ملک بھر میں مقبول ہوجاتا۔ ان تمام رسائل کے علاوہ ادب کی ترجمانی کیلئے اس

وقت ریاست کے دو اہم رسائل ''جہات'' اور ''تسلسل'' شائع ہو رہے ہیں۔ موضوعات کے اعتبار سے ان رسائل میں شائع ہونے والی تخلیقات میں تنوع ملتا ہے ان کے موضوعات وسیع ہیں اور ان موضوعات میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں جدیدت کے اثرات بھی موجود ہیں۔ سماجی انتشار، مسائل اور مساوات وغیرہ ان کے موضوعات ہیں۔ ان کے علاوہ ان میں تاریخی، تنقیدی، تحقیقی، معلوماتی مضامین چھپتے ہیں۔ رسالہ جہات میں بہترین افسانے انشائیے شامل ہوتے ہیں۔ ان تخلیقوں میں اسلوب کے اعتبار سے کلاسیکی اور جدید دور کے ملے جُلے اثرات ملتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو اس رسالے میں نثر سے زیادہ شاعری چھپتی ہے۔ اگر نثر کی دوسری اصناف کو اس میں وسیع پیمانے پر جگہ دی جائے تو یہ رسالہ بہت جلد ریاست جموں و کشمیر کے بہترین ترجمان کی حیثیت حاصل کرے گا۔

رسالہ ''تسلسل'' تقریباً ادب کی تمام اصناف ک فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ ڈرامے، افسانے، انشائیے کے علاوہ اس میں تاریخ تنقیدی اور تحقیقی مضامین چھپتے ہیں اس کے کئی شماروں کے تنقیدی جائزے کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ طنز و مزاح کو اس کے ذریعہ کوئی بھی فروغ نہیں مل رہا ہے۔ کوئی بھی مزاحیہ کالم یا مزاحیہ مضمون ان میں شائع نہیں ہوتا ہے۔ جموں و کشمیر کی ادبی صحافت کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ طنز و مزاح کی طرف اب تک سنجیدگی سے توجہ نہیں دی گئی ہے۔

ریاست میں اُردو زبان وادب کی ترویج وترقی میں علمی وادبی اداروں کی خدمات

(1905 عیسوی ......تاحال)

ریاست جموں وکشمیر اردو زبان وادب کا گہوارہ رہی ہے۔ یہاں کے علم وادب، تہذیب تمدن اور کلچر کو فروغ دینے میں یہاں کے اخبارات کے ساتھ مختلف ادبی، ثقافتی اداروں کا بھی زبردست ہاتھ رہا ہے۔ ریاست میں گذشتہ صدی کے دوران، کئی ایسے ادارے وجود میں آئے جن سے ہمارے کلچر، تہذیب اور ادب کو بے پناہ وسعت اور ترقی ملی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادبی اور تمدنی ادارے تہذیبی قدروں کے پھیلاؤ، فن کاروں اور ادیبوں کو جمع کرنے اور اُن کو ایک ہی پلیٹ فارم پر لا کر اُن کی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرنے کے معاملے میں سرگرم رول ادا کرتے ہیں۔ ہمارے علمی و ادبی اور تہذیبی ادارے ریاست کے طول وعرض میں وقتاً فوقتاً مشاعروں، مذاکروں، مباحثوں، سمیناروں کا اہتمام کرتے ہیں لیکن ان اداروں اور انجمنوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں ریاست کے مختلف کالجوں کی طرف منعقد کئے گئے ادبی تقاریب کو صرف نظر نہیں کیا جاسکتا، جہاں

اساتذہ کے ساتھ ساتھ باذوق طلبا چھوٹے چھوٹے ادبی وثقافتی ادارے قائم کرتے رہے۔ یہ ادارے ''بزمِ ادب'' کے نام سے موسوم تھے۔اس کے ساتھ ساتھ ریاست میں اردو کوفروغ دینے میں محرم کی مجلسوں کا ہاتھ رہا ہے۔اس قسم کی محفلیں جموں اور سرینگر کے مختلف علاقوں میں آراستہ تھیں اوراب یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔

برصغیر کی ادبی تاریخ میں کشمیریوں کی دین اسقدر گرانقدر ہے کہ کوئی بھی شخص اس سے آنکھیں چُرا کر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ سنسکرت ادب سے اگر کشمیریوں کے تعلقات کوخارج کیا جائے تو وہاں فقط ڈھانچہ باقی رہتا ہے۔ فارسی کے میدان میں کشمیری قلمکاروں نے وہ جوہر دکھائے کہ وادئ گلپوش کوایرانِ صغیر کا رتبہ حاصل ہوا۔شواہد کی غیر موجودگی میں یہ بتانا ممکن ہے کہ ان زبانوں کے ادب کے فروغ میں مختلف اداروں کا رول کیا رہا ہے۔مگراُردو علاقائی زبان اور یہاں کی مادری زبان نہ ہونے کے باوجود گذشتہ ایک صدی سے ریاست پر چھائی ہوئی ہے اور اس سے ہمارے یہاں سرکاری زبان کا آئینی رتبہ حاصل ہے۔ یہاں وادئ کشمیر میں ادبی سرگرمیوں کی نشو ونما میں علامہ اقبالؔ کے دوست منشی سراج الدین اور چودھری خوشی محمد ناظر کا رول تاریخ ساز رہا۔ناظر صاحب اس صدی کے اوئل میں سرکاری افسر بن کر کشمیر آئے اور زندگی کے آخری ایام تک یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں گرم جوشی کے ساتھ حصہ لیتے رہے۔اس دوران وہ مختلف ممتاز سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔

منشی سراج الدین شعر وسخن کا ستھرا ہوا ذوق رکھتے ہے کہ ریذیڈنسی میں ملازمت کے دوران اُنہوں نے ایک ادبی حلقہ قائم کیا جس کا نام ''مفرج القلوب''

رکھا گیا۔ اس انجمن کے ساتھ ریذیڈنسی سے منسلک کچھ دوسرے لوگ بھی شامل ہو گئے، کیونکہ یہ لوگ بھی شعر وسخن کے دلدادہ تھے۔ آہستہ آہستہ انجمن کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور باہر کے لوگ بھی انجمن ''مفرج القلوب'' کی محفلوں میں شریک ہونے لگے۔ انجمن کے اجلاس اب ریذیڈنسی تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ اجلاس منشی سراج الدین کے گھر پر بھی ہونے لگے۔ انجمن کا دائرہ وسیع ہونے سے مقامی شعراء اور ادباءاس کی محفلوں میں شامل ہونے لگے اور اس طرح یہ انجمن ایک جاندار اور باا ثر ثقافتی ادارے میں تبدیل ہوگئی۔ منشی صاحب کی شخصیت ایسی شمع بن گئی جس اردگرد پروانے منڈلانے اور رقص کرنے لگے۔ اس انجمن کے باقاعدہ شرکاء میں چودھری خوشی محمد ناظرؔ شامل تھے۔ جن کو بلاشبہ انجمن کی جان کہا جاسکتا تھا۔ اس انجمن کو ''مفرج الارواح'' کا نام بھی دیا گیا ہے۔ انجمن کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی محفلوں میں دوسرے لوگوں کے علاوہ ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبالؔ، سر شیخ عبدالقادر، سر محمد شفیع اور جسٹس شاہ دین ہمایوں بھی شریک ہوئے تھے۔ انجمن بہار میں محفلوں کا اہتمام، نسیم باغ، نشاط اور شالیمار کے مغل باغات میں ہوتی تھی۔ کبھی کبھی مشاعروں کا اہتمام ڈونگوں اور شکاروں میں کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے مشاعروں کو تیرتے مشاعروں کا نام دیا گیا ہے۔ ملک نصر اللہ نے انجمن کی سرگرمیوں کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔

''میں جاتے ہی اس انجمن کا عارضی ممبر بن گیا۔ مجھے غالبؔ، حسرتؔ، اور اقبالؔ کی غزلیں ترنم کے ساتھ پڑھنے کا شوق تھا اور اس انجمن کے ارکان ان کے

دلدادہ تھے''۔ انجمن کی گلہار محفلوں کا ذکر کرتے ہوئے ملک عزیز نے لکھا ہے۔

''عید کی نماز ہم نے اس عید گاہ میں پڑھی، جو بعد میں تحریک آزادی کشمیر کی جلسہ گاہ بن گئی اور نماز کے بعد ''انجمن مفرج القلوب'' کا اجلاس منشی سراج الدین خان کے مکان پر منعقد ہوا۔ تفریح اور مسرت کا ہنگامہ برپا تھا، غمِ عشق تھا نہ غمِ روزگار، لطائف اور قہقہے جاری تھے''۔

انجمن نصرت الاسلام:

اس انجمن کا مقصد اگرچہ تعلیمی اور سماجی تھا مگر اس کے قیام سے اردو کی ترویج اور ترقی میں خاصا فائدہ ہوا۔ اس انجمن کا قیام 1905 عیسوی میں عمل میں آیا۔ اس انجمن کے روح رواں میر واعظ غلام رسول شاہ صاحب تھے۔ آپ بلا مبالغہ کشمیر کے سر سید تھے۔ لاہور میں قائم انجمن حمایت الاسلام کی طرح انجمن نصرت الاسلام کی سالانہ تقریب یادگار ہوا کرتی تھی۔ اردو کے کچھ جانے پہچانے شعرا چونکہ اس انجمن سے وابستہ تھے اس لئے سالانہ اجلاس میں نظمیں سنانا پروگرام کا حصہ قرار پایا تھا۔ انجمن کے سالانہ اجلاس کے موقع پر منشی امیر الدین آمیرؔ اور صادق علیؔ خان اپنی پُر جوش نظمیں سنا کر داد تحسین حاصل کرتے تھے۔ کئی جلسوں میں محمد الدین فوقؔ بھی شامل رہتے تھے۔ انجمن کی تقریبات میں کشمیری پنڈتوں کے علاوہ انگریز افسران بھی شامل ہوتے تھے۔ ''انجمن نصرت الاسلام'' کے اراکین سر سید کی تحریک سے متاثر ہوئے تھے اور ان کا نصب العین کشمیر کے مسلمانوں کی مغربی تعلیم

سے آراستہ کرانا اور اس قوم کی فلاح و بہبود کیلئے کام کرنا تھا۔

بزمِ سخن:

1904 عیسوی کے آس پاس شعر و ادب سے شغب رکھنے والے جموں کے کچھ نوجوانوں نے اس انجمن کو وجود بخشا۔ بزم کی ہفتہ وار میٹنگوں میں اکثر طرحی کلام پیش کیا جاتا تھا۔ اس انجمن کا الگ سے کوئی دفتر تو تھا نہیں۔ ابتداء میں اس کا مرکز چراغ شاہ کا مکان تھا مگر بعد میں مجالس کا اہتمام غلام حیدر خان کے مکان پر ہوتا تھا۔ بزمِ سخن کے قیام نے جموں میں لوگوں کا ذوقِ ادب نکھارنے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ انجمن ہفتہ وار جلسوں کے علاوہ سالانہ مشاعروں کا اہتمام بھی کرتی تھی۔ انجمن کے مشاعروں اور جلسوں میں جن ادبی شخصیات نے حصہ لیا ہے اُن میں حفیظ جالندھریؔ، سیمابؔ اکبر آبادی، تاجورؔ غیب آبادی، دیوانِ جوالا سہائے، مولانا علیم الدین سالک، سوہن لال ساحرؔ، عرش صہبائیؔ اور عابد علی عابدؔ شامل ہیں۔

ابتداء میں انجمن کی سرگرمیاں صرف جموں تک محدود تھیں مگر بعد میں اس کا دائیرہ کشمیر تک بڑھایا گیا اور اس کا نام بزمِ سخن کی جگہ "بزمِ اردو جموں و کشمیر" رکھا گیا۔ انجمن کے اہتمام سے بہار میں مشاعروں کا انعقاد سرینگر میں کیا جاتا تھا اور سرما میں جموں، سالانہ صنعتی نمائش کے موقع پر سرینگر میں یہی انجمن مشاعرہ منظّم کرتی تھی۔ انجمن 1947 عیسوی تک قائم تھی۔ ان کے پہلے کشمیری صدر پنڈت دینا ناتھ مستؔ منتخب ہوئے تھے اور مشن سکول سرینگر کے احاطے میں ایک شاندار مشاعرہ انجمن کی کوششوں سے منعقد ہوا تھا۔

بزمِ مشاعرہ:

بزمِ سخن کی طرح ''بزمِ مشاعرہ'' کا قیام بھی جموں کے اہلِ ذوق حضرات کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ یہ انجمن 1914 عیسوی کے آس پاس جموں میں قائم ہوئی۔ اس کے اراکین میں سردار وزیر محمد خان، صاحب زادہ محمد عمر، منشی غلام علی حسرتؔ اور غلام حیدر خان غوریؔ شامل تھے۔ انجمن کی تقاریب میں جو کلام پیش کیا جاتا تھا اس کو کتابی صورت سے شائع کرنا اس ادارے کی خاص کارکردگی رہی ہے۔ حبیب کیفویؔ اس انجمن کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی کتاب میں رقمطراز ہیں:

''یہ بزم ہفتہ وار مشاعروں کے بجائے پندرہ روزہ مشاعرے جموں کے عجائب گھر میں منعقد کرتی رہی۔ اس میں بڑی کثرت سے صاحبِ ذوق حضرات شرکت کرتے تھے۔ حکومت کے اعلیٰ عہدیدار بھی شامل ہوتے اور گھنٹوں شعر اور سخن کا دور چلتا رہتا۔ بزم کبھی کبھی اپنے مشاعروں میں پڑھا جانے والا کلام کتابچوں میں بھی شائع کرتی جس پر بزم سخن کے اراکین کتابچوں پر تنقیدی پمفلٹ شائع کرتے۔ اس طرح بڑی دلچسپ ادبی بحثیں شروع ہو جاتیں''۔

یہ انجمن چند برسوں تک علمی و ادبی خدمات انجام دیتی رہی۔ جموں کے اس انجمن کے ساتھ بیشتر سرکاری ملازمین وابستہ تھے۔ اس لئے اس کا شیرازہ اس وقت بکھر گیا جب ان کا تبادلہ ریاست کے دوسرے مقامات پر ہو گیا۔

انجمن اخوان الصفا:

بیسوی صدی کے تیسرے دہے کے آس پاس مولانا مبارک شاہ فطرت نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک انجمن ''اخوان الصفا'' کی بنیاد ڈالی۔ بعد میں حیرت کاملی اور محمد امین دراب، عبدالحق برق جیسے علما اس انجمن کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ اور اس میں نئی جان پھونک دی۔ یہ لوگ اردو کے علاوہ فارسی زبان وادب پر بھی دسترس رکھتے تھے۔

کشمیر رائیٹرز لیگ:

اس انجمن کا کوئی خاص دفتر نہیں تھا بلکہ اس کے اجلاس مختلف اُدبا کے گھر پر ہوتے تھے۔ شیام لال ولی، تیرتھ کاشمیری کی کوششوں سے عمل میں آیا۔ انجمن کے جلسوں میں شمولیت کرنے والوں میں غلام احمد مہجور، پریم ناتھ پردیسی، سومناتھ زتشی، رادھا کرشن جنوں، گنگا دھر بٹ دیہاتی وغیرہ شامل تھے۔ اس بات کا پتہ نہیں چل سکا ہے کہ انجمن کا شیرازہ کب بکھر گیا۔ غلام محمد مہجور نے اپنی ذاتی ڈائری میں انجمن کی سرگرمیوں کا مختصراً ذکر کیا ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین:

ریاست جموں وکشمیر میں ادبی انجمنوں اور علمی اداروں کی روایت برقرار رکھنے میں یہاں کے اہلِ علم حضرات پیش پیش رہے ہیں۔ انہوں نے اس روایت کو آگے بڑھانے میں ہر دور میں سرگرم حصہ لیا اور اردو کے کاز کو آگے بڑھایا۔ 1936 عیسوی میں ملک کے دوسرے حصوں میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخیں

بزمِ مشاعرہ:

بزمِ سخن کی طرح ''بزمِ مشاعرہ'' کا قیام بھی جموں کے اہلِ ذوق حضرات کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ یہ انجمن 1914 عیسوی کے آس پاس جموں میں قائم ہوئی۔ اس کے اراکین میں سردار وزیر محمد خان، صاحب زادہ محمد عمر، منشی غلام علی حسرتؔ اور غلام حیدر خان غوریؔ شامل تھے۔ انجمن کی تقاریب میں جو کلام پیش کیا جاتا تھا اس کی کتابی صورت سے شائع کرنا اس ادارے کی خاص کارکردگی رہی ہے۔ حبیب کیفویؔ اس انجمن کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی کتاب میں رقمطراز ہیں:

> ''یہ بزم ہفتہ وار مشاعروں کے بجائے پندرہ روزہ مشاعرے جموں کے عجائب گھر میں منعقد کرتی رہی۔ اس میں بڑی کثرت سے صاحبِ ذوق حضرات شرکت کرتے تھے۔ حکومت کے اعلیٰ عہدیدار بھی شامل ہوتے اور گھنٹوں شعر اور سخن کا دور چلتا رہتا۔ بزم کبھی کبھی اپنے مشاعروں میں پڑھا جانے والا کلام کتابچوں میں بھی شائع کرتی جس پر بزم سخن کے اراکین کتابچوں پر تنقیدی پمفلٹ شائع کرتے۔ اس طرح بڑی دلچسپ ادبی بحثیں شروع ہو جاتیں''۔

یہ انجمن چند برسوں تک علمی وادبی خدمات انجام دیتی رہی۔ جموں کے اس انجمن کے ساتھ بیشتر سرکاری ملازمین وابستہ تھے۔ اس لئے اس کا شیرازہ اس وقت بکھر گیا جب ان کا تبادلہ ریاست کے دوسرے مقامات پر ہو گیا۔

انجمن اخوان الصفا:

بیسوی صدی کے تیسرے دہے کے آس پاس مولانا مبارک شاہ فطرت نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک انجمن ''اخوان الصفا'' کی بنیاد ڈالی۔ بعد میں حیرت کاملی اور محمد امین دراب، عبدالحق برق جیسے علما اس انجمن کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ اور اس میں نئی جان پھونک دی۔ یہ لوگ اردو کے علاوہ فارسی زبان وادب پر بھی دسترس رکھتے تھے۔

کشمیر رائیٹرز لیگ:

اس انجمن کا کوئی خاص دفتر نہیں تھا بلکہ اس کے اجلاس مختلف اُدبا کے گھر پر ہوتے تھے۔ شیام لال ولی، تیرتھ کاشمیری کی کوششوں سے عمل میں آیا۔ انجمن کے جلسوں میں شمولیت کرنے والوں میں غلام احمد مہجور، پریم ناتھ پردیسی، سومناتھ زتشی، رادھا کرشن جنوں، گنگا دھر بٹ دیہاتی وغیرہ شامل تھے۔ اس بات کا پتہ نہیں چل سکا ہے کہ انجمن کا شیرازہ کب بکھر گیا۔ غلام محمد مہجور نے اپنی ذاتی ڈائری میں انجمن کی سرگرمیوں کا مختصراً ذکر کیا ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین:

ریاست جموں وکشمیر میں ادبی انجمنوں اور علمی اداروں کی روایت برقرار رکھنے میں یہاں کے اہلِ علم حضرات پیش پیش رہے ہیں۔ انہوں نے اس روایت کو آگے بڑھانے میں ہر دور میں سرگرم حصہ لیا اور اردو کے کاز کو آگے بڑھایا۔ 1936 عیسوی میں ملک کے دوسرے حصوں میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخیں

قائم کی گئیں۔ کشمیر میں اس کی بنیاد کا پہلا پتھر کشمیر کے پہلے افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسیؔ مرحوم نے 1942 میں رکھا۔ اس انجمن کے پروگرام آگے بڑھانے میں پردیسیؔ کے ساتھ ساتھ اُنکے ہم عصر رامانند ساگر بھی پیش پیش رہے۔

ابتداء میں اس کی نشستیں پریم ناتھ پردیسی کے گھر پر ہوا کرتی تھیں۔ لیکن بعد میں جب اس کا دائرہ وسیع ہو گیا تو یہ نشستیں سری پرتاب کالج سرینگر کے ہال میں ہونے لگیں۔ انجمن کی تقاریب میں مقامی ادباء کے ساتھ ساتھ ریاست سے باہر سے تعلق رکھنے والے قلم کار اور شعراء بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ جن میں خواجہ احمد عباس، بلراج ساہنیؔ، دیویندر ستیارتھیؔ، راجندر سنگھ بیدیؔ، محمود ہاشمیؔ، عبدالستار عاصیؔ، پروفیسر محمود ہاشمی، کنول نین پروازؔ، قیصر قلندر بھی بڑے شوق سے جایا کرتے تھے اور اپنی تخلیقات پیش کرتے تھے۔ انجمن نے کشمیر میں اردو شعر و ادب کی فضا سازگار بنانے میں اہم رول ادا کیا۔

اُردو سبھا:

یہ انجمن پہلے ایس پی کالج میں بزمِ ادب کے نام سے قائم تھی مگر محمد الدین تاثیرؔ کے پرنسپل مقرر ہونے پر اُن کے ایما پر انجمن کا نام بزمِ ادب سے اُردو سبھا رکھا گیا۔ یہ بزم باقاعدگی کے ساتھ محفلوں کا اہتمام کرنے کے علاوہ مشاعروں کا انتظام بھی کرتی تھی۔ اس انجمن کا بنیادی مقصد ریاست میں علم و ادب کو فروغ دینا تھا۔ محی الدین تاثیر خود بھی ایک جانے پہچانے شاعر اور ادیب تھے۔ وہ کشمیر سے تعلق رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کی صلاحیتوں سے واقف تھے اور ساتھ ہی ساتھ

ادبی محفلوں اور مجالس کے دِلدادہ تھے۔ ایس پی کالج کی یہ محفلیں ہمیشہ یاد کی جائیں گی جہاں اردو سبھا کی وساطت سے بہت سے یادگار جلسے منعقد کئے گئے۔

بزمِ ادب:

1944 عیسوی میں سرینگر کے اندرونی علاقے فتح کدل میں کشمیری زبان کے قد آور شاعر غلام حسن بیگ عارفؔ نے ''بزمِ ادب'' کے نام سے ایک اور انجمن کا قیام عمل میں لایا۔ اس انجمن نے بھی اُردو کے ساتھ ساتھ کشمیری زبان و ادب کو فروغ دینے کیلئے کام کیا۔ اس انجمن نے بھی مشاعروں اور مباحثوں کے ساتھ ساتھ اشاعت کا کام عمل میں لایا۔

چنانچہ ''گلریز'' کے نام کے رسالے کے ساتھ ساتھ کئی کتابیں ادارے کی طرف سے شائع ہوئیں جن میں ''حبہ خاتون''، ''رباعیاتِ عارف'' قابلِ ذکر ہیں۔ ''گلریز'' نام کا رسالہ کئی سال تک ایک ماہنامہ کی صورت میں شائع ہوتا رہا۔ ابتدا میں رسالے کے مدیر امین کاملؔ صاحب رہے مگر بعد میں یہ کام پروفیسر محی الدین حاجنیؔ کی سرپرستی میں کئی سال تک رہا۔ ''گلریز'' اس لحاظ سے اپنی قسم کا متنوع رسالہ تھا۔ اس میں اردو فارسی اور کشمیری تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ تخلیق سے لے کر تحقیق تک ہر قسم کے مضامین رسالے میں جگہ پاتے تھے۔ رسالے میں خطاطی کے مختلف نمونوں کو نمایاں طور پر جگہ ملتی تھی۔ ''بزمِ ادب'' کی سرپرستی میں کئی کتابیں بھی شائع ہوئیں جن میں امین کاملؔ صاحب کی حبہ خاتون اور ''رباعیات عارفؔ قابلِ ذکر ہیں۔ 1956 عیسوی کے بعد ''گلریز'' کو عارفؔ صاحب نے از سرِ نو جاری کرنے

کی سعی کی۔ اور اس کی ادارت کے فرائض غلام نبی خیالؔ کے سپرد کیے مگر دوسری بار گلریز کے جو بھی شمارے شائع ہوئے۔ اُن میں اُردو تخلیقات کو جگہ نہیں دی گئی۔

قومی کلچرل فرنٹ:

1947 عیسوی کے آخر میں قبائلی حملے کے پیشِ نظر سرینگر میں ایک ہنگامی تنظیم قومی کلچرل محاذ کا قیام عمل میں آیا۔ یہ انجمن ادبی سیاسی نوعیت کی تھی۔ مگر اس کے تواریخی رول سے کوئی بھی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ انجمن کم و بیش ایک نیم سرکاری ادارہ تھی۔ ابتداء میں اس ادارے نے ''تعمیر'' نام کا ایک رسالہ شائع کیا جس میں اُردو کے ساتھ کشمیری تخلیقات میں بھی جگہ پائی تھی۔ ابتدائی دور میں اس رسالے کا مدیر مشہور صحافی دیوان برندر وظفر پیامی تھا۔ ادارے کے کام میں تال میل پیدا کرنے کیلئے ہندی کے مشہور ادیب شودان سنگھ چوہان اور اداکارہ شیلا بھاٹیہ بھی اس کے ساتھ منسلک تھی۔ 1947 عیسوی میں ادارے ''گائے جا کشمیر'' نام کی قومی گیتوں پر مشتمل ایک کتاب شائع کی یہ کتاب اُردو اور کشمیری کے انقلابی نغموں کا مجموعہ ہے جس میں مولانا محمد سید مسعودی، پریم ناتھ پردیسی، مخدوم محی الدین، پریم دھون، وشوا ناتھ ماہ، کے اُردو نغموں کے علاوہ نادمؔ، روشنؔ مہجور، ماسٹر زندہ کولؔ، بہارؔ وغیرہ کے کشمیری نغمے بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس کی اشاعت سے کشمیری میں ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا جس نے بعد میں کشمیری شاعری کے مزاج کو بدل کے رکھ دیا۔

''قومی کلچرل محاذ'' کا دفتر نمائش گاہ واقع جہانگیر چوک سرینگر میں تھا اور

بعد میں اس کا نام کلچرل کانگریس رکھا گیا جس کے مختلف شعبے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین اسی انجمن کا حصہ تھی۔ انجمن سے وابستہ قلم کار رحمٰن راہیؔ، امین کاملؔ، نادمؔ، محی الدین اخترؔ کشمیری کے ساتھ ساتھ اُردو لکھتے تھے۔ ادارے کی طرف سے ''کونگ پوش'' نام کا ایک رسالہ بھی شائع ہوتا تھا۔ اس رسالہ ''کونگ پوش'' جو کہ بنیادی طور پر کشمیری کے لئے مخصوص تھا، میں اُردو تخلیقات بھی جگہ پائی تھیں۔

کلچرل کانفرنس:

1954 عیسوی میں یہاں کلچرل کانفرنس نام کی ایک اور انجمن بنی جس کا دفتر ریگل چوک میں واقع رائل ہوٹل سرینگر نزدیک گھنٹہ گھر کی اوپری منزل میں تھا۔ انجمن کے ارکان میں نئے لکھنے والوں کے علاوہ سب لوگ شامل تھے جو پہلے انجمن ترقی پسند مفنین کے ساتھ وابستہ تھے۔ ایک اعتبار سے یہ انجمن کلچرل کانگریس کا ہی نیا روپ تھا۔ دوسری دفعہ قائم ہونے پر کلچرل کانفرنس نے اُردو اور کشمیری میں ''کونگ پوش'' کا الگ الگ اجراء کیا۔ مگر اس میں ''اردو کونگ پوش'' کا صرف ایک ہی شمارہ شائع ہوسکا۔

کلچرل فورم:

کلچرل کانفرنس کے ساتھ ہی کلچرل فورم کے نام کی ایک اور انجمن شمیم احمد شمیمؔ نے قائم کی۔ اس انجمن کا دفتر بھی ریگل چوک سرینگر میں واقع تھا۔ اس کے ہفتہ وار جلسوں میں اُردو اور کشمیری کے ادیب باقاعدگی کے ساتھ حصہ لیتے تھے۔

خانیار سرینگر کا حلقہ:

خانیار کے حلقہ علم وادب کے ساتھ کشمیری ادیب اور قد آور اردو ادیب منسلک تھے۔ اس ادارے کے ہنگامہ خیز اجلاس اب بھی یادگار ہیں۔ جو کہنہ مشق اردو ادیب اس انجمن کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے اُن میں ''پشکر ناتھ، برج پریمی، وجیہ احمد وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ حلقہ علم وادب کے زمانے میں مخمور حسین بدخشی اور مرحوم حکیم منظور وغیرہ نے مل کر ''حلقہ ارباب ذوق'' کی بنیاد ڈالی۔ مگر یہ انجمن کچھ دیر قائم رہی اور بہت کارآمد کام کیا مگر کافی دیر تک اپنے وجود کو قائم نہیں رکھ سکی۔

سقوطِ ہند کے بعد ہی ریاست میں علمی اداروں کی طرف زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ نہ صرف پرائیویٹ طور پر کئی انجمنیں اور علمی ادارے اُبھرے بلکہ سرکاری سطح پر بھی کئی اہم ادارے قائم کئے گئے اور اس طرح سے اردو شعر وادب کو زیادہ فروغ ملا۔ سرکاری اداروں میں جموں اور کشمیر کے ریڈیو اسٹیشن، ٹیلی ویژن سینٹر، جموں اور کشمیر یونیورسٹیوں کے اُردو شعبے، کلچرل اکادمی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہ ادارے ہیں جو اردو زبان وادب کی بے لوث خدمت کرتے آئے ہیں۔

ریڈیو کشمیر سرینگر:

1949 عیسوی میں ریڈیو کشمیر سرینگر قائم ہوا۔ اس کی نشریات کا آغاز باضابطہ طور پر اُردو زبان سے ہوا۔ آل انڈیا ریڈیو کی اُردو سروس کے بعد ریڈیو کشمیر سرینگر ہی ایک ایسا اسٹیشن ہے جو زیادہ سے زیادہ پروگرام اُردو زبان میں نشر کرتا

ہے۔ ریڈیو کے اردو پروگراموں کی ترتیب دینے میں ابتدا میں جن اہم شخصیات کا ہاتھ رہا ہے اُن میں خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سہیل عظیم آبادی، کمال احمد صدیقی اور کے، کے، نیر کے نام خاص طور سے لئے جاسکتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ پریم ناتھ پردیسی، ٹھاکر پونچھی، مکیش کاشمیری، عبدالحق برق، پران کشور، پشکر بھان، قیصر قلندر، سوم ناتھ سادھو جیسے قلم کاروں نے ڈراموں، موسیقی، خبروں، فیچروں، مباحثوں کا اہتمام کر کے ریڈیائی پروگراموں میں نئی روح پھونک ڈالی اور اپنی بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ ریڈیو کشمیر سرینگر سے سب سے پہلا اُردو ڈرامہ ''چودہ گولیاں'' کے نام سے نشر ہوا۔ یہ ڈرامہ خواجہ احمد عباس نے لکھا۔ اس کے بعد بے شمار اردو ڈرامے پیش کئے گئے۔ ان میں بعض ڈرامے قومی ایوارڈ کے لئے منتخب ہوئے۔ ڈراموں کے علاوہ ریڈیو کشمیر سرینگر وقتاً فوقتاً کشمیری اور اردو میں مشاعروں، لٹراری میگزین جیسے ''سنگر مال، بزمِ سخن اور داستان'' کا بھی باقاعدی سے اہتمام کرتا رہا۔ اور یہ روایت تادم جاری وساری ہے۔ 1949 عیسوی میں ریڈیو کشمیر کی طرف سے ایک عظیم الشان مشاعرے کا انعقاد کیا گیا، جس میں مقامی شعراء کے ساتھ ساتھ باہر سے آئے ہوئے بعض نامور شعرا نے حصہ لیا۔ ریڈیو سے سامعین کی دلچسپی کیلئے اُردو کے مختلف ادبی، ثقافتی پروگرام بھی نشر ہوتے ہیں۔ اس طرح سے ریڈیو اُردو زبان کی توسیع کے لئے بہت ہی اہم رول ادا کرتا ہے۔ نہ صرف ریڈیو کشمیر سرینگر بلکہ ریڈیو کشمیر جموں اور ریڈیو آل انڈیا ریڈیو لہہ (لداخ) بھی مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ اُردو کی فلاح وبقا کیلئے بڑا مفید کام کر رہے ہیں

اور اُردو کے معیاری پروگرام نشر کرتے ہیں۔

دوردرشن کیندر:

دور درشن کیندر بھی ایک اور ثقافتی ادارہ ہے جو گوجری، ڈوگری، پنجابی، بھدرواہی، کشمیری وغیرہ جیسی زبانوں میں خبریں، فیچر، ڈرامے، نظمیں، بحث و مباحثے گانے وغیرہ شروع سے ہی پیش کرتا رہا ہے۔ ان تمام زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں مختلف نوعیت کے پروگرام بھی پیش کئے جا رہے ہیں۔ سرکاری زبان ہونے کے ناطے دوردرشن کیندر کی نشریات میں کشمیری کے بعد اردو کو ہی فوقیت حاصل ہے، چنانچہ ہر ماہ ''دھنک'' کے نام سے ماہانہ اردو پروگرام دوردرشن سے ٹیلی کاسٹ ہوتا ہے جو خالص علمی و ادبی نوعیت کا ہوتا ہے۔ نوجوانوں کیلئے ''نئے چراغ'' اور ریسرچ اسکالر کیلئے ''عکس و آہنگ'' جیسے اردو کے پروگرام ایک زمانے سے ٹیلی کاسٹ ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈرامے، فیچر، مشاعرے اور قومی یکجہتی کے موضوع پر بہت سے پروگرام وقتاً فوقتاً دوردرشن کیندر سے پیش ہوتے ہیں۔ جو خاص علمی وادبی نوعیت کے پروگرام ہوتے ہیں۔ گذشتہ چند برسوں سے یہ پروگرام کافی مقبول ہو رہے ہیں اور اُردو پروگراموں کے ناظرین کا حلقہ وسیع تر وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اب صوبہ جموں میں بھی ایک الگ اسٹیشن قائم کیا گیا۔ اس کیندر کی طرف سے اردو کے بعض معیاری اور قابل تعریف پروگرام پیش ہوتے ہیں۔

سرینگر کشمیر اور جموں یونیورسٹیوں کے پوسٹ گریجویٹ اردو کے شعبہ جات بھی ریاست میں علم و ادب کے بڑے مراکز میں شمار ہوتے ہیں۔

شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی:

اس شعبے نے 1958 عیسوی سے کام کرنا شروع کیا ہے۔اس طرح سے آج تک ہزاروں کی تعداد میں طلبا اور طالبات اردو کی تعلیم سے مستفید ہوئے۔ان طلباء اور طالبات میں بہت سے شاعر، افسانہ نگار، ادیب اور فنکار ابھرے۔یہ اس زبان کے ساتھ محبت اور عقیدت کا جذبہ ہی ہے کہ طلبا اور طالبات میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہاہے۔ تحقیق کے میدان میں بڑی تیزی آئی ہےاور اردوزبان وادب کے مختلف موضوعات پر سالہا سال سے تحقیق کا کام ہوتا رہاہے۔

''اردو نظم پر یورپی اثرات''، ''سعادت حسن منٹو، حیات اور کارنامے''، ''اردوشاعری میں رومانیت''، ''اردو ناول میں کردار نگاری، ''اردو تنقید میں غالؔب شناسی'' ''اردو تنقید میں اقبال شناسی''، ''اردوشاعری میں میؔر کی روایت''، ''اُنیسویں صدی کی اردو نثر میں سماجی طنز''، ''مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر نگاری''، ''عصمت چغتائی شخصیت اور فن''، ''کشمیری غزل پر اُردو غزل کے اثرات'' وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

شعبے کی طرف سے ''بازیافت'' کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع ہوتا ہے جس میں ملک کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ پایہ کے محققوں، شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ ریاست کے نامور ادیبوں کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں۔شعبے کی طرف سے ''آ گہی'' کے نام سے ایک خبر نامہ بھی شائع ہوتا ہے۔

شعبہ اردو جموں یونیورسٹی:

یہ بھی ایک پُر وقار اور باوقار شعبہ ہے۔ یہ بھی علم وادب کا ایک نمائندہ مرکز

ہے۔اس کی عمر اگر چہ شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے مقابلے میں کم ہے لیکن اس علمی و ادبی ادارے کی کارکردگی صرف نظر نہیں کی جاسکتی ۔ یہ اردو زبان وادب سے محبت اور عقیدت کا جذبہ ہی ہے کہ شعبے میں طلبا وطالبات کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا ہے۔

شعبہ اقبالیات کشمیر یونیورسٹی:

ریاست جموں وکشمیر میں علم وادب کے پھیلاؤ اور توسیع کیلئے کشمیر یونیورسٹی کا اقبالیات سے متعلق شعبہ اقبال انسٹیچوٹ علمی وادبی خدمات انجام دے رہا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور کی رہنمائی میں اس شعبہ نے اقبالیات سے متعلق بہترین لائبریری کا قیام عمل میں لایا۔اس لائبریری میں اقبال کے فن اوران کے فلسفے کو سمجھنے کیلئے کتابوں کا ایک نادر خزانہ ہے۔اس کے علاوہ اقبالیات کے نام سے ہر سال ایک مجلد شائع ہوتا ہے۔اس مجلد میں اقبال سے متعلق مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں، جن میں اقبال کے فکر وفن کا احاطہ کیا جاتا ہے۔اس مجلد نے نہ صرف ملک میں بلکہ برصغیر ہندوپاک کے علمی وادبی حلقوں میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی ہے۔ اقبال کے مختلف پہلوؤں پر سمینار کرانا اور کتابیں شائع کرنا اس علمی وادبی ادارے کی خاص کارکردگی رہی ہے۔اقبال کے فکر وفن پر اب تک تقریباً دو درجن سے زائد طلبا اور طالبات تحقیق کر چکے ہیں۔

محکمہ اطلاعات کی کارکردگی:

ریاست جموں وکشمیر کے اطلاعات کے محکمے کی کارکردگی اگرچہ اردو

زبان وادب تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ ایک وسیع محکمہ ہے لیکن پھر اردو زبان وادب کی ترقی وترویج میں اس محکمہ کے رول کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ محکمہ کی طرف سے سالہا سال سے ایک جریدہ ''ماہنامہ تعمیر'' شائع ہوتا رہا۔ آج تک اس جریدے کے کئی شاندار نمبر بھی نکالے گئے جن میں مہجور نمبر، آزاد نمبر، پریم چند نمبر، جموں وکشمیر میں اردو ادب نمبر قابلِ ذکر ہیں۔ ''ماہنامہ تعمیر'' سب سے پہلے 1954 عیسوی میں معروف سیاست دان، دانشور اور ادیب مرحوم شمیم احمد شمیمؔ کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اُن کے بعد ادارت کے فرائض نامور ادیب محمد یوسف ٹینگ انجام دیتے رہے۔ سب سے پہلے اس رسالے کی ادارت دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامؔی کو سونپ دی گئی تھی۔

ان کی ادارت میں ''تعمیر'' کے ایک یا دو شمارے ہی شائع ہوتے رہے۔ چند برسوں تک اس کی ادارت غلام نبی بابا اور خالد بشیر بھی کرتے رہے۔ انگریزی اور ہندی زبانوں میں ''کشمیر ٹوڈے'' اور ''یوجنا'' جیسے رسائل بھی اس ادارے کی طرف سے شائع ہوتے ہیں۔ یہ ادارہ اطلاعات کے نام سے ایک خبر نامہ بھی شائع کرتا رہا ہے اور ایک ہفتہ وار اخبار مکتوب شائع کرتا ہے۔

ریاست کے عجائب گھر اور ڈوگرہ آرٹ گیلری:

ان اداروں میں ہندو عہد کے علاوہ افغانوں، مغلوں، سکھوں اور ڈوگروں کے عہد کے قدیم ترین آثار دیکھنے میں آتے ہیں۔ مجسمہ سازی اور مصوری کے اعلیٰ نمونے بھی ملتے ہیں۔ مختلف آلہ جات اور مورتیاں وغیرہ بھی کچھ اس طرح سے سجائی

گئی ہیں کہ قدیم تہذیب سے متعلق بے شمار معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

موجودہ دور میں اقبال اکادمی سرینگر، اردو اکادمی سرینگر، انجمن فورغ اردو جموں، آل انڈیا ہندی اردو سنگم سرینگر، بزمِ شعرا سرینگر، ادبی کنج جموں، برج پریمی میموریل کمیٹی جموں، رسا جاودانی میموریل لٹریری سوسائٹی جموں، بزم فرید بھدرواہ، بزمِ ادب کشتواڑ، تلاش ادب سرینگر، اقبالؔ، بزمِ ادب بھدوارہ وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

آل انڈیا ہندی اردو سنگم شاخ سرینگر:

اس انجمن کا صدر دفتر لکھنو (یوپی) میں ہے۔ سنگم نے سرینگر کے گردونواح میں چند یادگار ادبی محفلیں منعقد کی ہے۔ اس انجمن کی طرف سے 1976 عیسوی میں ایک شاندار آل انڈیا مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں مقامی شعراء کے علاوہ ملک کے دوسرے حصوں سے آئے ہوئے بعض اہم شاعروں نے حصہ لیا۔ اس تاریخی تقریب میں ریاست سے تعلق رکھنے والے بعض اردو اور ہندی ادیبوں میں ایوارڈ تقسیم کئے گئے۔ سنگم کے سرپرست اعلیٰ اُس وقت کے وزیر اعلیٰ مرحوم شیخ محمد عبداللہ تھے۔

برج پریمی میموریل کمیٹی جموں:

ریاست کے معروف ادیب اور نامور نقاد ڈاکٹر برج پریمی کے انتقال کے بعد وجود میں آئی۔ اس ادارے کی بنیاد پروفیسر ظہور الدین، پشکر ناتھ، عرش صہبائی، آنند لہر اور پریمی رومانی نے رکھی۔ چنانچہ اس ادبی اور علمی تنظیم کی طرف سے پہلی ادبی تقریب جموں کے جاگرتی نکیتن اسکول میں منعقد ہوئی جس میں برج پریمی کی

پہلی برسی کے موقعہ پر اُن کی شخصیت اور فن سے متعلق مقالات پیش کئے گئے۔ یہ مقالات بعد میں کتابی صورت میں منظرِ عام پر آئے۔ اس کے علاوہ کمیٹی نے برج پریمی کے غیر مطبوعہ مسودات کی کتابی شکل میں شائع کیا جو قابلِ مطالعہ ہے۔

ریاستی اردو اکادمیوں کی کُل ہند کانفرنس 22,23 جون 1998:

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیرِ اہتمام ریاستی اردو اکادمیوں کی دوسری دو روزہ سالانہ کانفرنس سرینگر کشمیر میں 22,23 جون 1998 عیسوی کو منعقد ہوئی۔ کانفرنس میں جموں و کشمیر کلچرل اکیڈیمی کے علاوہ مختلف اکادمیوں نے حصہ لیا۔ کانفرنس شیرِ کشمیر انٹرنیشنل کمپلیکس میں منعقد ہوئی۔ یہ چار اجلاسوں پر مشتمل تھی۔ پروفیسر سیف الدین سوز نے اردو کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی اور کہا اردو ہمارے کلچر کی شناخت اور رابطے کی زبان ہے۔ کشمیری اور اردو کے درمیان کوئی تصادم نہیں ہے۔ کشمیر میں اردو کے ساتھ کشمیری کی بھی ترقی کیلئے کوشش ہونی چاہیئے۔ سابقہ وزیرِ اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے ملک میں اردو کے زوال کے مختلف اسباب کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس سے خواہ مخواہ مسلمانوں کی زبان کہا جا رہا ہے۔

سابقہ ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حمید اللہ بھٹ نے کہا ریاست جموں و کشمیر واحد ریاست ہے جس نے اردو کو سرکاری زبان کی قانونی اور آئینی حیثیت عطا کی ہے۔ ہماری اپنی زبانیں بھی ہیں۔ لداخی، ڈوگری اور کشمیری جن کا حُسن، جن کا ادب کسی طرح کم نہیں۔ مگر ریاست کے مجموعی تشخص کا اظہار صرف اردو زبان میں ہو سکتا ہے۔ ہم نے اپنا medium of instruction اردو مقرر

گئی ہیں کہ قدیم تہذیب سے متعلق بے شمار معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

موجودہ دور میں اقبال اکادمی سرینگر، اردو اکادمی سرینگر، انجمن فورغ اردو جموں، آل انڈیا ہندی اردو سنگم سرینگر، بزمِ شعرا سرینگر، ادبی کنج جموں، برج پریمی میموریل کمیٹی جموں، رسا جاودانی میموریل لٹریری سوسائٹی جموں، بزم فرید بھدرواہ، بزمِ ادب کشتواڑ، تلاش ادب سرینگر، اقبالؔ، بزمِ ادب بھدوارہ وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

آل انڈیا ہندی اردو سنگم شاخ سرینگر:

اس انجمن کا صدر دفتر لکھنو (یوپی) میں ہے۔ سنگم نے سرینگر کے گردونواح میں چند یادگار ادبی محفلیں منعقد کی ہے۔ اس انجمن کی طرف سے 1976 عیسوی میں ایک شاندار آل انڈیا مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں مقامی شعراء کے علاوہ ملک کے دوسرے حصوں سے آئے ہوئے بعض اہم شاعروں نے حصہ لیا۔ اس تاریخی تقریب میں ریاست سے تعلق رکھنے والے بعض اردو اور ہندی ادیبوں میں ایوارڈ تقسیم کئے گئے۔ سنگم کے سرپرست اعلیٰ اُس وقت کے وزیر اعلیٰ مرحوم شیخ محمد عبداللہ تھے۔

برج پریمی میموریل کمیٹی جموں:

ریاست کے معروف ادیب اور نامور نقاد ڈاکٹر برج پریمی کے انتقال کے بعد وجود میں آئی۔ اس ادارے کی بنیاد پروفیسر ظہور الدین، پشکر ناتھ، عرش صہبائی، آنند لہر اور پریمی رومانی نے رکھی۔ چنانچہ اس ادبی اور علمی تنظیم کی طرف سے پہلی ادبی تقریب جموں کے جاگرتی نکیتن اسکول میں منعقد ہوئی جس میں برج پریمی کی

پہلی برسی کے موقعہ پر اُن کی شخصیت اور فن سے متعلق مقالات پیش کیئے گئے۔ یہ مقالات بعد میں کتابی صورت میں منظر عام پر آئے۔ اس کے علاوہ کمیٹی نے برج پریمی کے غیر مطبوعہ مسودات کی کتابی شکل میں شائع کیا جو قابلِ مطالعہ ہے۔

ریاستی اردو اکادمیوں کی کُل ہند کانفرنس 22,23 جون 1998:

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیرِ اہتمام ریاستی اردو اکادمیوں کی دوسری دوروزہ سالانہ کانفرنس سرینگر کشمیر میں 22,23 جون 1998 عیسوی کو منعقد ہوئی۔ کانفرنس میں جموں و کشمیر کلچرل اکیڈیمی کے علاوہ مختلف اکادمیوں نے حصہ لیا۔ کانفرنس شیرِ کشمیر انٹرنیشنل کمپلیکس میں منعقد ہوئی۔ یہ چار اجلاسوں پر مشتمل تھی۔ پروفیسر سیف الدین سوز نے اردو کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی اور کہا اردو ہمارے کلچر کی شناخت اور رابطے کی زبان ہے۔ کشمیری اور اردو کے درمیان کوئی تصادم نہیں ہے۔ کشمیر میں اردو کے ساتھ کشمیری کی بھی ترقی کیلئے کوشش ہونی چاہیئے۔ سابقہ وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے ملک میں اردو کے زوال کے مختلف اسباب کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس سے خواہ مخواہ مسلمانوں کی زبان کہا جا رہا ہے۔

سابقہ ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حمید اللہ بھٹ نے کہا ریاست جموں و کشمیر واحد ریاست ہے جس نے اردو کو سرکاری زبان کی قانونی اور آئینی حیثیت عطا کی ہے۔ ہماری اپنی زبانیں بھی ہیں۔ لداخی، ڈوگری اور کشمیری جن کا حُسن، جن کا ادب کسی طرح کم نہیں۔ مگر ریاست کے مجموعی تشخص کا اظہار صرف اردو زبان میں ہوسکتا ہے۔ ہم نے اپنا medium of instruction اردو مقرر

کیا ہے۔ اردو زبان کو اس میڈیم سے جو استحکام ملا اِس پر ملک کے اردو دان حضرات کی نظر نہیں گئی ہے۔ (Non language) مضامین فزیکس، کمسٹر ی، سوشل سائینس پر کافی کام ہوا ہے۔ کشمیر کا سب سے بڑا عطیہ یہ ہے کہ ہم نے اس زبان کو تہذیبی بہاؤ کے اظہار کو وسیلہ سمجھا۔ اس کو نہ مشرف بہ اسلام کیا اور نہ مندر کی پوتر تا سے جوڑ دیا۔ نہ آیاتِ الٰہی کا تعویز شریف گلے میں ڈالا اور نہ ماتھے پر تلک لگا کر اسے زنار پہنایا۔

ریاستی اکادمیوں کی سرینگر کانفرنس (چند اخبارات کی نظر میں)

روزنامہ سرینگر ٹائمز کا اداریہ مورخہ 23 جون 1998:

سرینگر کشمیر میں یہ اردو کانفرنس 23 جون 1998 عیسوی کو شیرِ کشمیر کنونشن کمپلیکس میں شروع ہوئی۔ جموں و کشمیر کلچر اکیڈیمی نے کانفرنس کا اہتمام کیا۔ کشمیر کے ادیب، شاعر اور انشا پردازوں کے علاوہ اہلِ دانش کو دعوت دی گئی۔ یہ کانفرنس اس لحاظ سے اہم تھی کہ کشمیر میں آٹھ نو سال کے دوران ادب پر پورا جمود چھایا ہوا تھا۔ ادبی مجلسیں منعقد ہونے کا سلسلہ بند ہو گیا تھا۔ ادیب خاموش تھے۔ وہ اپنے قلم کو جنبش بھی نہیں دے رہے تھے۔ کشمیر ایک انقلاب سے گذر رہا تھا۔ کشمیر میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ ہر کسی کو دعوت فکر دے رہا تھا۔ ادیب سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ سُن رہے تھے لیکن کوئی ادیب اور قلمکار اپنے قلم کو جنبش نہیں دے رہا تھا۔

ایک طویل مدت کے بعد سرینگر کے کنونشن ہال میں فروغ اردو پر جو کانفرنس ہوئی۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ کشمیر کے ادیبوں اور قلمکاروں کو ایک یکجا جمع

ہونے کا موقع ملا۔ جو ادیب مدت سے ایک دوسرے سے دور ہو گئے تھے۔ ان کو یکجا ہونے کا موقع ملا تھا اور ایک مختصر وقفہ میں چند لمحوں تک محو کلام ہونے کی فرصت حاصل ہو گئی۔ ادیب، شاعر اور قلمکار ایک دوسرے سے ملے اور مل کر اپنی پرانی یاد تازہ کی۔ رحمٰن راہیؔ، محمد زماں آزردہؔ، موتی لال ساقیؔ، ش۔م۔احمد، معراج الدین سیکریٹری کلچرل اکیڈیمی، محمد یوسف تسکینؔ، اور مرحوم فرید پربتیؔ کے علاوہ دوسرے کئی ادب نواز حضرات اس کانفرنس میں موجود تھے۔

فروغ اردو کی اس کانفرنس میں باہر سے کئی شاعر اور ادیب آئے تھے۔ ان میں شری جگن ناتھ آزادؔ بھی شامل تھے۔ اردو کانفرنس اس لحاظ سے ایک کامیاب کانفرنس قرار دی جاسکتی ہے کہ اس نے ادیبوں میں لکھنے کی نئی اُمنگ پیدا کی۔ کشمیر میں کئی سالوں تک ادب پر جو جمود چھایا رہا وہ کشمیر کی تمدنی زندگی کا ایک المیہ ہے۔ ادب اپنے زمانے کے رجحانات اور احساس کا عکاس ہوتا ہے۔ ہر ادب میں اپنے دور کے فکری رجحانات کا پتہ ملتا ہے۔ کشمیر میں آٹھ سال کے دوران کوئی ادبی تخلیق سامنے نہیں آئی۔

روزنامہ تسکین (جموں) کا اداریہ مورخہ 26 جون 1998:

روزنامہ تسکین اس اردو کانفرنس کے بارے میں لکھتا ہے کہ خود وزیر اعلیٰ اور دیگر وزراء کے دفاتر میں انگریزی کا بول بالا ہے۔ جو سائل اردو میں درخواست گزاری کرتا ہے اُسے بھی انگریزی میں جواب دیا جاتا ہے۔ لہٰذا ریاست کے وزیر اعلیٰ کو اردو کی وکالت اپنی اس ریاست سے شروع کرنی چاہیے جہاں صاحب اقتدار

اور اعلیٰ حکام ہی اردو کے نام سے پھر جاتے ہیں اور غیر اردو رُخ اختیار کر کے اس کے فروغ میں رخنے ڈالتے ہیں۔ اُمید ہے حکام اس جانب خصوصی توجہ دیں گے اور اُردو کے حق میں ایک سازگار فضا پیدا کرنے کیلئے موثر اور مفید نوعیت کے اقدام اٹھائیں گے"۔

شعبہ اُردو سنٹرل یونیورسٹی آف سرینگر کشمیر:

مرکزی جامعہ کشمیر بھارتی پارلیمانی ایکٹ 2009 عیسوی کے تحت قائم ایک مرکزی ادارہ ہے۔ جس کا عارضی دفتر سونوار سرینگر میں قائم ہے۔ یونیورسٹی کا قیام مارچ 2009 عیسوی میں ہی عمل میں آ گیا تھا لیکن داخلے متفرق مضامین میں 2010 عیسوی سے شروع ہوئے۔ تب سے لے کر اب تک ہر سال یونیورسٹی کی فہرست میں کچھ نئے اسکول اور شعبوں کا بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ شعبہ اردو کا قیام بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس کا قیام 2012 عیسوی میں عمل میں آیا۔ یونیورسٹی میں درس وتدریس کے ساتھ ساتھ طلباء کیلئے دیگر ادبی سرگرمیوں کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ ان کی بہترین ذہن سازی ہو سکے۔

اردو ادب کی تواریخ اس بات کی گواہ ہے کہ کشمیریوں نے اردو نظم ونثر کی تدریج وترقی میں یادگار خدمات انجام دی ہیں۔ شعر ادب کے جو چراغ یہاں جلتے رہے ہندوستان کے گوشے گوشے نے ان سے روشنی لی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ کشمیر کی خدمات کا ذکر کئے بغیر اردو ادب کی تواریخ کو مکمل تصوّر کرنا ناانصافی ہوگی۔ کشمیر کے ادبی فنکاروں کی اسی نوع کی خدمات کے اعتراف میں شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی

آف کشمیر نے دوروزہ قومی سمینار ''اردو زبان وادب کی ترویج میں کشمیریوں کا حصہ''
بتاریخ 9,10/اکتوبر 2013 عیسوی کو منعقد کیا۔ جس میں ملک کے سرکردہ ادیبوں
نے حصہ لیا۔ یہ سمینار طلبا و طالبات کیلئے علمی اعتبار سے سودمند ثابت ہوا۔ شعبہ اردو
کی طرف سے سالانہ ادبی رسالہ ''دریافت'' بھی شائع ہونے والا ہے۔ یہاں کا
شعبہ اردو اپنی علمی وادبی کاوشوں کی بدولت ساری اردو دنیا میں اہم شناخت کا حامل
ثابت ہو رہا ہے۔

اردو اکادمی جموں وکشمیر جنوری 2013 عیسوی کے اغراض ومقاصد:

ا) اکادمی ایک غیر سیاسی تنظیم ہوگی۔

ب) اکادمی کو جمہوری آئینی اور سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے، سرکاری
اور غیر سرکاری سطح پر اپنا جائز مقام دلانے کی کوشش کرے گی۔

پ) اردو زبان کی ترقی و ترویج اور فروغ کیلئے اکادمی مندرجہ ذیل طریقہ
اختیار کرے گی۔

ا۔ وادی میں بین الاقوامی سطح کے ایک اردو مرکز کا قیام جس میں اردو کے
تعلق سے تحقیق کی سہولیات کے علاوہ ایک ترجمہ گھر (ٹرانسلیشن ہاؤس) تاکہ مختلف
زبانوں سے مواد کو اردو میں منتقل کرایا جا سکے۔

۲۔ ریاست جموں وکشمیر میں موجود مقامی و بیرونی، سرکاری، نیم سرکاری اور
نجی دفاتر میں اردو کو بطورِ ذریعہ اختیار کرانے کی کوشش کی جائے گی۔

۳۔ ریاست کی تمام عدالتوں میں اردو کو بطورِ ذریعہ اختیار کرنے کی

جدو جہد کی جائے گی۔

۴۔تمام سرکاری اورنجی تعلیمی اداروں میں اردو کو شامل نصاب کرانے کی کوشش کی جائے گی۔ پوری ریاست میں سبھی سرکاری نجی اسکولوں میں سوشل سائنس اول تا دسویں جماعت تک اردو میں پڑھائے جانے کی جدو جہد۔

۵۔نوجوان نسل کو اردو بولنے لکھنے اور پڑھنے کی ترغیب دی جائے گی۔

۶۔اردو سے وابستہ ہر طبقہ اور مکتبہ فکر کو اردو اکادمی سے مربوط کیا جائے گا۔ تاکہ بہتر علمی وادبی نتائج برآمد ہوسکیں۔

۷۔اردو کے فروغ کے لئے علمی مذاکرات، ادبی مجالس، مشاعرے، نمائش اور مختلف ثقافتی پروگرام ترتیب دئے جائینگے۔

۸۔اردو پڑھنے والوں، پڑھانے والوں، کتاب یا کمپوزنگ کرنے والوں، اردو کتابیں، اخبارات اور لٹریچر کی اشاعت اور فروخت سے وابستہ سبھی لوگوں اور کسی بھی طرح اردو سے وابستگی رکھنے والوں کو ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے گا۔

۹۔ اردو کے قلمکاروں، مصنفین، محققین، صحافیوں، شعرا، اساتذہ، اسکالروں اور جملہ محبان کی عزت افزائی کیلئے ایوارڈ اور توصیفی اسناد جاری کئے جائینگے۔

۱۰۔ ایسے ہونہار طلبہ و طالبات جنہوں نے دسویں جماعت سے لے کر ایم اے تک اردو میں متاثر کن کارکردگی دکھائی ہوگی حوصلہ افزائی کی جائیگی۔

۱۱۔اُدبا، قلمکاروں اور شاعروں کی معیاری تخلیقات کی اشاعت کو یقینی بنانے

کیلئے حتی الامکان، مالی امداد فراہم کی جائیگی۔

۱۲۔ نادار اور مفلوک الحال اردو ادیبوں اور شاعروں یا ان کے مستحق پسماندہ گانکی ممکنہ مالی امداد کی جائیگی۔

۱۳۔ اُردو زبان و ادب پر تحقیق کرنے والے اسکالروں اور مفاد عامہ کیلئے ایک معیاری اُردو کتب خانہ قائم کیا جائیگا۔ رسالے کی اشاعت کے ضمن میں جناب جسٹس بشیر احمد کرمانیؔ صاحب اور محترم غلام نبی خیالؔ صاحب نے اپنے مخلصانہ مشوروں سے لیکر، مالی معاونت تک اپنا بھرپور تعاون اُردو زبان و ادب کی بقا اور ترقی و ترویج کیلئے میسر رکھنے کا وعدہ فرمایا۔ خیالؔ صاحب نے اُردو اکادمی کی جانب سے منعقد ایک حالیہ اجلاس میں انتخابات کی تکمیل پر اپنی بصیرت افروز تقریر میں یہاں تک کہہ دیا کہ وہ اُردو اکادمی کی جانب سے نکلنے والے ادبی رسالے کا سالانہ خرچہ تن تنہا برداشت کرنے کیلئے بھی تیار ہیں۔ ٹینگ صاحب اردو اکادمی کی ترقی و تعمیر میں جو دلچسپی لے رہے ہیں وہ قابلِ تحسین ہے۔ اردو اکادمی کی مالی معاونت کرنے میں وہ پیش پیش رہتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں اُردو اکادمی نے کئی ادبی اور علمی محفلوں اور مجلسوں کا اہتمام کامیابی کے ساتھ کیا۔ اکادمی کا اردو سہ ماہی رسالہ پہلا شمارہ جنوری، فروری، مارچ 2013 عیسوی کو شائع ہوا۔ اس کا دفتر جموں و کشمیر کینی ہاؤس کورٹ روڈ سرینگر میں ہے۔

۱۴۔ اُردو زبان کے ریاستی شعراء اور ادیبوں اور ناشرین پر مشتمل ایک ڈائریکٹری شائع کی جائے گی۔

۱۵۔اُردو زبان و ادب کے فروغ میں مشغول بیرون ریاست ادبی انجمنوں سے دست تعاون بڑھایا جانے لگا۔

چند گنے چُنے قلم کاروں پر خصوصی نمبر گوشے یا ضمیمے نکال کر ان کی اردو زبان کے تئیں خدمات کے برملا اعتراف کا حق ادا نہیں ہوسکتا اور نہ چند قلم کاروں کے ورثاء کی طرف سے ہر سال ان کی برسی پر کسی ہوٹل میں کسی مختصر سی تقریب کے انعقاد سے ہی ہماری آنے والی نسل ہمارے ادبی علمی اور ثقافتی ورثے سے بھرپور ڈھنگ سے روشناس ہوسکتی ہے۔ضرورت ہے کہ ان افکار و خیالات اور ان کے ادبی تعاون پر کھل کر بحث ہو اور نئے سرے سے ان کی دریافت ہو اور نہ صرف مقامی یا ملکی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی ان کے مشاہدات، مطالعات کو دوسری زبانوں کے ادب پاروں کے ساتھ تقابلی مطالعے کا بندوبست ممکن بن سکے۔

ہم بجا طور پر ایسا کرسکتے ہیں۔ للہ عارفہؔ، حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ، حضرت یعقوب صرفی، غنی کاشمیری، خواجہ حبیب اللہ نوشہری جیسے بزرگوں کے علاوہ اخترؔ محی الدین، رحمٰن راہیؔ، علی محمد لون، پروفیسر حامدی کاشمیریؔ، پشکر ناتھ، غلام نبی خیالؔ، محمد فاروق نازکیؔ، محمد زماں آزردہؔ، مرغوب بانہالیؔ اور ٹھاکر پونچھی کا ادبی سرمایہ ہم کسی بھی ترقی یافتہ زبان میں تخلیق ہونے والے ادب کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں اور کسی احساس کمتری کے بغیر ہی رکھ سکتے ہیں۔

اردو کی موجودہ صورتحال اور دورِ حاضر کی اردو کے تئیں قومی اور ریاستی ادبی اداروں کا رول:

اُردو زبان آج ہمیں پکار رہی ہے کہ اُردو والو ذرا آؤ مجھے سنبھالو کہ میں تمہاری شناخت کا حوالہ ہوں۔

آزادی کے بعد جب ہندوستان کا نیا آئین بنا اور ملک کی زبانوں کو اُن کے علاقوں کے ساتھ تقسیم کیا گیا تو اُردو زبان کیلئے ملک کے طور وعرض میں سوائے جموں وکشمیر کے اور کوئی جگہ نہ مل سکی۔ جس علاقے میں زبان پلی بڑھی تھی، جن لوگوں نے اِسے اپنے خونِ جگر سے پالا اور پروان چڑھایا تھا۔ اُنہوں نے اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ ماں کو اپنے ہی بیٹوں نے قبول کرنے اور پہچاننے سے انکار کر دیا۔ تقسیمِ ملک ہماری تاریخ کا سب سے المناک حادثہ ہے کیونکہ ایک ناعاقبت اندیش نسل نے ملک کے سینے پر لکیر کھینچ کر لاکھوں انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ لاکھوں گھر ویران ہوئے اگر یہ سلسلہ یہیں تک آکر رُک جاتا تو کوئی بات نہ تھی۔ ہم شائد اس حادثے کو دوسرا مہابھارت سمجھ کر بھول جاتے۔ لیکن بات یہیں پر ختم نہ ہوئی۔ ہمارے اس شغل نے کروڑوں انسانوں کے دِلوں میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نفرت کا بیج بو دیا۔ اس فصل کو ہم کاٹتے ہی چلے آرہے ہیں۔ آنے والی نسلیں نہ جانے کب تک اسے کاٹتی رہیں گی۔ اس سے بڑا ایک اور حادثہ ہوا اور وہ یہ کہ ہم نے ایک ایسی زبان کو جس نے تاریخ کے طویل سفر کے موڑ پر ہمارا ساتھ دیا تھا اور جو ہماری مشترکہ تہذیب کا ایک عظیم ورثہ ہے ہم نے اسے قتل کرنے کی سازش کی اور

اس کو آج بھی تڑپا کر مارنے کی کوشش میں لگے ہیں۔

تقسیمِ ملک کی سب سے زیادہ قیمت اِسی زبان نے ادا کی ہے۔ آزادی کے بعد اسے مسلمانوں کی زبان قرار دے کر نظر انداز کیا جاتا رہا۔ دستورِ ہند نے اُردو زبان کو ریاست جموں و کشمیر کی سرکاری زبان کے طور پر تسلیم تو کیا لیکن ریاست میں اس کا جو حشر ہوا، وہ بھی ایک سبق آموز سانحہ ہے۔ کسی زبان کو کوئی علاقہ دینے کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ وہاں سرکاری اداروں میں تو کام اُس کے ذریعہ ہوتا ہی ہے۔ غیر سرکاری اداروں میں بھی اُس کے چلن کو عام کرنے کیلئے حکومت کوشش کرتی ہے۔ ہماری ریاست میں اس سلسلے میں جو کچھ ہوا اُس پر کف افسوس ملنے کے سوائے کوئی چارہ نہیں۔ ریاست کی سرکاری زبان تو اُردو سہی لیکن سرکاری دفاتر میں کام انگریزی میں ہوتا رہا۔

اُردو کو راج گدی سے اُتار کر بغلیں بجانے والوں کو غالباً اس حقیقت کا علم نہیں کہ اُردو اپنی طاقت، نفاست، شرینی، رنگینی، رعنائی، دلربائی، اور ہر دلعزیزی کی بنا پر یہ زبان دلوں میں بس جانے کا وصف اپنے اندر رکھتی ہے۔ لہٰذا اس کے نادان دشمنوں نے جب اس پر خود اس کے وطن کی زمین تنگ کر دی تو اس نے اپنے پر پھڑ پھڑاتے اور آسمان کی بلندیوں اور زمین کی وسعتیں ناپتے ہوئے ایران، بلکہ بنگلہ دیش، سعودی عربیہ، انگلینڈ، امریکہ، جرمنی، روس، چین، انڈونیشا، برما، ملیشیا، سنگاپور، کویت، مسقط، اور ابوظہبی جیسے دور دراز کے ممالک پر اپنا تسلط جما لیا اور دن بدن اپنی مقبولیت کے دائرُوں کو وسیع سے وسیع تر کر رہی ہے جسے دیکھتے ہوئے یہ کہا

جاسکتا ہے کہ مستقبل قریب میں یہ زبان دنیا کی سب سے بڑی زبان کی حیثیت حاصل کر لے گی۔ یونیسف کی حالیہ رپورٹ کے مطابق اُردو اس وقت چینی زبان کے بعد دنیا کی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔

اس لئے ضروری ہے اُردو کو حیات ابدی عطا کرنے یا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے موت کی تاریکیوں میں گُم کر دینے کا انحصار دنیا بھر میں پھیلے اُن کروڑ یا کروڑ ارباب اُردو کے رویے پر ہے جنہیں اُردو کیلئے اپنے موجودہ طرزِ عمل کو بدلنا ہوگا۔ اپنے دلوں میں اس کیلئے بے پناہ اثاثہ پیدا کرنا ہوگا۔ خدمت اُردو کو اپنے فرائض منصبی میں سب پر مقدم رکھنا ہوگا۔ اپنے اور متعلقین کے بچوں کو پرائیمری سے کالج تک اُردو تعلیم دلوانے کی ترغیب دلانی ہوگی تاکہ ہماری آنے والی نسلیں اُردو سے نابلد نہ رہیں۔ منزل پانے کیلئے صرف خواب دیکھنا کافی نہیں ہے بلکہ اس کی تعبیر پانے کیلئے جاگنا ضروری ہے۔ اگر موجودہ دور میں اُردو کی حالت خاصی خراب بھی ہے اور مایوس کُن بھی مگر بات اتنی بگڑی نہیں ہے کہ اس سے لاعلاج مرض قرار دیا جاسکے۔

موجودہ دور میں قومی اور ریاستی ادبی اداروں کے حوصلہ افزا اقدامات:

پریس اور پرنٹ میڈیا میں حال ہی میں اس خبر نے جگہ پائی ہے کہ اُردو زبان کو فروغ دینے کیلئے اور اس کے کھوئے ہوئے مقام کو دوبارہ بازیافت کیلئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ایک تاریخی فیصلہ لیا ہے کہ جس میں یونیورسٹی میں داخلے کیلئے اُردو زبان کو تمام طلباء کیلئے لازمی قرار دیا گیا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہر سال

ملکی اور غیر ملکی طالبِ علموں کی ایک اچھی خاصی تعداد داخلہ لیتی ہے۔اب ہر داخلہ لینے والے طالبِ علم کیلئے ضروری ہوگا کہ وہ اُردو کو بھی ایک مضمون کی حیثیت سے لے لے۔ یہ ایک مثبت قدم ہے اور اس کی اُردو دان طبقے کی طرف سے خوب پذیرائی ہورہی ہے کہ اقدام سے حکومتی اداروں کی طرف سے عدم توجہی کی شکار اُردو زبان کو فروغ ملے گا۔ملکی پیمانے پر اور خاص طور پر وادیٔ کشمیر میں بھی ادبی اور علمی حلقوں نے اس کا زبردست خیر مقدم کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اس ایسے اقدام کی کافی ستائش کی گئی۔

ملک میں اور بہت سے ادارے ہیں جہاں اس طرح کے اقدامات کو لاگو کیا جاسکتا ہے۔مثلاً'' جامعہ ملیہ اسلامیہ، عثمانیہ یونیورسٹی، مولانا آزاد یونیورسٹی وغیرہ۔

اس ضمن میں ان خدشات کا اظہار بھی کیا جارہا ہے کہ یہاں اعلانات کو توشدومد سے اخبارات کو زینت بنادیا جاتا ہے لیکن ان پر عمل آوری کے ضمن میں کوئی پیش رفت نہیں ہوتی ہے۔احکامات جاری ہوتے ہی عمل آوری کے اقدامات ہونے چاہئیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اس طرح کے معاملات میں اکثر ناقابلِ برداشت اور غیر ضروری تاخیر سے کام لیا جاتا ہے۔

جولائی 2013 عیسوی کا پریس ریلیز:

حکومت جموں وکشمیر نے بھی جولائی 2013 عیسوی کے مہینے میں ایک پریس ریلیز جاری کردیا جس میں کہا گیا کہ حکومت نے ریاست کی سرکاری زبان کو فروغ دینے کیلئے متعدد معاملات کو زیرِ بحث لائے اور سیاحت وتمدن کے

کمشنر سیکریٹری کے تحت سب کمیٹی نے ریاست میں اُردو اکادمی کا قیام کا جائزہ لیا اور ایک اعلیٰ سطحی میٹنگ میں گفت شنید کی اور فروغِ اُردو کونسل کے نام سے ایک خودمختار تنظیم کے قیام پر غور وخوض بھی کیا گیا جس کی سربراہی وزیراعلیٰ کریں گے اور دیگر ممبران کا انتخاب بھی عمل میں لایا جائے گا۔

اردو کو تعلیم کا بنیادی حصہ بنانا ضروری، گورنر 2013 عیسوی:

ریاست کے گورنر جناب این۔این ووہرا نے اس بات زور دیا کہ اُردو زبان کو بنیادی سطح پر نظامِ تعلیم کا حصہ بنانا ضروری ہے تاکہ اس عظیم زبان کو فروغ مل سکے۔اس کا اظہار اُنہوں نے سرینگر کے ایک عظیم تعلیمی ادارہ ایس۔پی۔کالج میں ایک تقریب میں کیا۔سابقہ وزیر تعلیم پیرزادہ محمد سعید نے اس بات کی اہمیت اُجاگر کی کہ ملازمتوں میں سرکاری زبان اُردو کی جانکاری بنیادی شرط ہونی چاہیے جبکہ ریاست کے چیف انفارمیشن آفیسر، جے۔اے۔صوفی نے اُردو کو ریاست اور ملک کی یکجہتی کیلئے ایک ستون قرار دیا۔گورنر جناب ووہرا نے اپنی تقریر میں اُردو زبان کی ترقی اور بروقت کوششوں پر زور دیا۔انہوں نے کہا کہ اُردو کی ترقی کیلئے ضروری ہے کہ اس زبان کو تعلیم میں بنیادی سطح پر پُراثر طریقے پر رائج کرایا جائے۔اُنہوں نے اُردو کو روزگار کے ساتھ جوڑنے کی بھرپور وکالت کی۔

اُردو کے فروغ کیلئے کشمیر یونیورسٹی میں کارڈی نیشن کمیٹی کا قیام 2013 عیسوی:

کشمیر یونیورسٹی نے ریاست میں اُردو زبان کو فروغ دینے کیلئے ایک

کارڈینیشن کمیٹی کا قیام عمل میں لایا ہے۔ یہ فیصلہ ایک اعلیٰ سطحی میٹنگ میں لیا گیا جس کی صدارت یونیورسٹی کے سابقہ وائس چانسلر پروفیسر ریاض پنجابی نے کی جب کہ اُردو اکادمی کے صدر نور شاہ اور یونیورسٹی کے سینئر افسران بھی میٹنگ میں موجود تھے۔ وائس چانسلر نے عصری تعلیمی تناظر میں اُردو کو تکنالوجی سے آراستہ کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ موجودہ تکنالوجی کی ہر سطح پر فروغ دینے کی ضرورت ہے اور خاص کر اُردو کے شعبے میں اس کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔ اُنہوں نے یونیورسٹی کے متعلق حکام کے ساتھ ورکشاپ کر کے اُردو زبان کے نئے سافٹ وئیر متعارف کرنے پر زور دیا۔ یونیورسٹی ریاست میں اُردو کے احیائے نو کیلئے آنے والے برسوں میں کانفرنسوں اور ورکشاپوں کا اہتمام بھی کرے گی۔ یونیورسٹی کے تمام شعبہ جات میں بہت جلد انگریزی کے ساتھ ساتھ اُردو زبان میں بھی سائن بورڈ ہوں گے۔

ایس۔پی۔کالج میں کتابوں کی آٹھ روزہ نمائش:

نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کے ڈاریکٹر ایم۔اے۔مسکزر نے وادیٔ کشمیر میں ایک کتابی مرکز قائم کرنے کیلئے سرکار سے تعاون طلب کیا ہے۔ اُنہوں نے اس کتابی مرکز میں آنے کی لوگوں کو کھلی دعوت دیتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا کہ کتابوں کے مطالعہ کے بغیر کسی بھی سماج کا مستقبل محفوظ نہیں ہے۔ اُنہوں نے مزید کہا کہ کچھ لوگ نامعلوم کن وجوہات کی بنا پر اُردو کی بیخ کنی کرنے پر تُلے ہوئے ہیں اور اس کے خلاف در پردہ سازشوں میں مصروف ہیں۔ معروف ادیب اور سابق

بیروکریٹ قاضی محمد امین نے اپنے مقالے میں کہا کہ اگرچہ انفرادی سطح پر اُردو کے فروغ کیلئے کوشش جاری ہے لیکن سرکاری سطح پر صورتحال مایوس کُن ہے۔ حال ہی میں شائع شدہ نائب تحصیل دار کی منتخب لسٹ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ 29/ایسے اُمیدواروں کو منتخب کیا گیا ہے جو اُردو سے نا آشنا ہیں جو سراسر ناانصافی ہے۔

قانون سازیہ میں سرکاری زبان ''اردو'' کی زبون حالی کی گونج 2013 عیسوی:

جموں وکشمیر کی سرکاری زبان ''اُردو'' کو انتظامی وحکومتی سطح پر نظر انداز کئے جانے کی گونج قانون سازیہ کے دونوں ایوانوں میں سنائی دی جہاں اراکین قانون سازیہ نے پارٹی وابستگی سے بالاتر ہوکر اپنی تشویش ظاہر کی۔ اس بات پر زور دیا کہ تحصیل دار، گرداوار اور پٹواری کا اُردو خواندہ ہونا ضروری ہے۔ لیکن اس زبان کی طرف توجہ نہ دینے کے باعث آج حالات یہ ہیں کہ ایسے افسران اور ملازمین کی تعداد بہت زیادہ ہے جنہیں اُردو زبان بالکل نہیں آتی اور اُنہوں نے اپنا کام کاج چلانے کیلئے اُردو خواندہ منشی رکھے ہوئے ہیں۔ کانگریس کے جہانگیر حسین میر نے کہا کہ ریاست میں کئی اسکول ایسے ہیں جہاں پر اُردو جاننے والے طلبا وطالبات کی تعداد زیادہ ہیں مگر وہاں پنجابی ٹیچر تعینات ہیں۔ اسلئے اس باقاعدگی کو ختم کیا جانا چاہیئے۔ چیرمین امرت ملہوترہ نے کہا اُردو اساتذہ کی اگر کمی ہے تو یہ زبان کیسے ترقی پائیگی۔ اُنہوں نے کہا کہ اُردو سرکاری زبان ہے اور اس کو اسکولوں میں پڑھایا جانا لازمی ہے۔ راجندر سنگھ رانا نے کہا کہ جموں اور سرینگر میں ایک ایک اُردو اکیڈیمی

کھولنے کی تجویز بھی کمیٹی میں شامل ہونی چاہیئے۔ حکیم محمد یاسین نے اسپیکر سے مخاطب ہوتے کہا کہ اُردو جموں وکشمیر کی سرکاری زبان ہے، لیکن سرکار کی طرف اس زبان کے ساتھ امتیاز برتا جارہا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ پہلے اسمبلی میں سوالنامہ کا کتابچہ تفصیلی تحریری جواب، دن کی کاروائی کی فہرست، قراردادیں وغیرہ سب کچھ اُردو میں اراکین کو دیا جاتا تھا لیکن اب یہ سب کچھ انگریزی میں ہورہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ حالیہ دنوں میں اخبارات میں اس بات کا معنی خیز انکشاف ہوا ہے کہ سابق وزیر مال نے ایک تحریری حکم نامہ زیرِ نمبر 873/PS/HRM/21 تاریخ 8/ اکتوبر 2012 عیسوی فائینشل کمشنر ریونیو کے نام جاری کیا ہے جس میں ان سے کہا گیا کہ محکمہ مال اور بندوبست ریکارڈ جو اُردو زبان میں تحریر کیا جاتا ہے، کو انگریزی میں ترجمہ کیا جائے۔ مذکورہ حکم نامے میں کہا گیا ہے کہ نوجوان کے۔ اے۔ ایس افسران کی سمجھ میں یہ زبان بہت کم آتی ہے جبکہ کچھ افسران نے مذکورہ زبان کو اسکول کی سطح پر ہی حاصل کیا تھا۔ اُردو زبان کا اسمبلی کی کاروائی سے غائب ہونا واقعی تشویش ناک بات ہے۔

رسم الخط بدلنے کی کوششوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا عزم 2013 عیسوی:

جموں وکشمیر میں سرکاری زبان اُردو کو قرار دیتے ہوئے محبان اُردو نے حکومت کو خبردار کیا ہے کہ کسی بھی سازش اور کوششوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائیگا۔ اکادمی کی یہاں خالصہ ہائی اسکول سرینگر میں اُردو اکادمی کے اہتمام سے

''اُردو کا مستقبل'' کے موضوع پر ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں اکادمی کے سرمائی رسالہ ''اردو اکادمی'' کی رسم رونمائی انجام دی گئی۔ مقررین نے ریاست میں اردو کی حالت اور مسائل پر اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کیا۔ تقریب کی صدارت معروف شاعر و ادیب اور کشمیر یونیورسٹی کے سابقہ وائس چانسلر پروفیسر حامدی کاشمیریؔ نے کی۔ جبکہ قانون ساز کونسل کے سابق ڈپٹی چیرمین اور محقق محمد یوسف ٹینگ، جسٹس بشیر احمد کرمانیؔ، غلام نبی خیالؔ، فاروق نازکیؔ، سلطان الحق شہیدیؔ اور اکادمی کے صدر نور شاہ بھی موجود تھے۔ مقررین نے ریاست میں اُردو کی حالتِ زار پر زبردست تشویش کا اظہار کیا گیا۔ مقررین نے کہا کہ کئی حلقوں کی طرف سے اُردو کے رسم الخط کو دیوناگری میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جارہی ہیں اور اگر ایسا ہوا تو اس زبان کا وجود ہی ختم ہو جائیگا۔ اُردو کے تحفظ کیلئے اجتماعی اور انفرادی سطح پر کوششیں کرنے کی ضرورت ہے۔ جن میں دنیا میں نمایاں زبانوں میں شائع ہونے والی مطبوعات کو اُردو منتقل کرنے کی کوشش بھی شامل ہونی چاہیئے۔ جس کیلئے ریاست کے اُدباء اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ مقررین نے حکومت کو آڑھے ہاتھوں لیتے ہوئے کہا اُردو آئینی طور پر سرکاری زبان کے باوجود بھی ابھی تک وہ حق حاصل نہیں کر پائی جس کی یہ مستحق ہے۔ اس بات پر سخت افسوس کا اظہار کیا کہ سیکریٹریٹ میں اگر کوئی شخص اُردو میں لکھی ہوئی درخواست پیش کرتا ہے تو کوئی بھی (IAS) آئے۔ اے۔ ایس، (KAS) کے۔ اے۔ ایس افسران پڑھ نہیں سکتا۔ یہاں اسمبلی میں چند ایک وزراء کو چھوڑ کر کوئی اُردو پڑھ نہیں سکتا۔ حکمرانوں کو ریاست میں حکومت کرنے کیلئے اُردو سیکھنی چاہیئے۔

ورنہ اُنہیں حکومت کرنے کا حق نہیں ہے۔ حیران کُن امر یہ ہے کہ محکمہ مال میں اعلیٰ عہدوں پر فائض اُن افراد کی تقرری عمل میں لائی گئی جو اُردو سے بالکل نابلد ہیں۔اور اس کے لئے حکومت نے تمام قواعد وضوابط کو پامال کر کے رکھ دیا۔

اردو کی ترقی اور ترویج کیلئے مولانا آزاد یونیورسٹی کے حوصلہ افزا اقدامات:

ریاست جموں وکشمیر کی سرکاری زبان ہوتے ہوئے بھی اُردو کو اپنا درجہ حاصل نہیں ہے اور تقریباً تمام دفاتر میں نہ صرف انگریزی بولی جاتی ہے بلکہ اُردو کا کہیں نام ونشان نہیں ہے۔ اُردو کو زندہ رکھنے میں اگرچہ شعرا حضرات، ادیب، قلمکار، فلم انڈسٹری کے علاوہ اُردو اخبارات نے کلیدی رول ادا کیا ہے تاہم اس زبان کو فروغ دینا نہ صرف ریاستی سرکار بلکہ ریاست کے باشندوں کی بھی ذمہ داری بنتی ہے۔ ملک میں اُردو زندہ رکھنے میں مولانا آزاد اُردو یونیورسٹی نے بھی کلیدی رول ادا کیا ہے اور مذکورہ یونیورسٹی کے ریجنل دفتر سرینگر میں بھی رواں سال کے دوران 2500 طالب علموں نے مختلف مضامین میں داخلہ حاصل کرلیا جو خوش آیند بات ہے اور ان کو حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ آج کل کوئی بھی طالبِ علم یا سرکاری ملازم بھی نظامت فاصلاتی تعلیم کے تحت اُردو زبان میں ایم۔اے (اُردو) ایم۔اے (ہسٹری) بے۔اے، بی۔کام، بی ایڈ، پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما اِن ٹوُرِزم، ایم۔اے ر(ریاضی) کی ڈگریاں حاصل کرسکتا ہے۔ اس کے علاوہ آنیربل ہائیکورٹ کا حکم نامہ حوصلہ افزا ہے جس میں MANU کی فاصلاتی

ڈگریاں اور کورس کو ہری جھنڈی دکھائی گئی اور طالبِ علموں کا ڈر ختم ہوا اور اس سے بھی حوصلہ افزا نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔

اُردو کی ترقی و ترویج اور بقا کیلئے ایک موثر پالیسی اپنانے کی ضرورت ہے اور بحیثیت سرکاری زبان کے اس کو جو آئینی تحفظ حاصل ہے اس کے عین مطابق اس کی ترویج اور سرکاری کام کاج میں اس کے استعمال کیلئے مناسب اقدامات اٹھائیں جائیں۔ یہاں اس ریاست میں دفتروں میں عرض داشت، انگریزی میں موثر سمجھی جاتی ہے اور ہمارے حکمران ان سب پر صرف انگریزی زبان میں ہی دستخط ثبت کرنا جانتے ہیں۔ اُردو میں لکھی ہوئی عرضیاں کوئی افسر پڑھ سکتا ہے اور درخواست دہند سے پوچھ کر ان پر مناسب ہدایت انگریزی میں لکھ دیتے ہیں۔ یہ سلسلہ ہمارے یہاں کے سرکاری محکموں میں اوپر سے نیچے تک چلتا ہے اور زیادہ تر سرکاری روزمرہ کا کام انگریزی میں ہی ہوتا ہے۔ اس وقت یہاں کے سرکاری شعبوں کے سبھی زمروں بالخصوص انجینئرنگ، تکنالوجی، صحت عامہ اور باقی دیگر شعبہ جات میں تقریباً 70 فیصد اُردو کے استعمال و تعلق سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ ریاستی ملازموں کے سارے زمروں کیلئے اُردو کی جانکاری کی کوئی پابندی نہیں رکھی گئی ہے۔ اُردو کے استاتذہ کی فراہمی اور اُن کی تربیت کیلئے باضابطہ طور پر کوئی نظام نہیں ہے۔

ریاست جموں و کشمیر میں اُردو کو بہت سارے مسائل درپیش ہیں۔ اگر حکومت، عوام اور اُردو دان طبقہ تینوں مل کر صدقِ دِلی سے یہ کوشش کریں گے کہ اُردو اس ریاست میں پھلے پھولے اور اِسے اس کا حق ملے تو اس ہدف کو پورا کرنا کوئی

مشکل کام نہیں۔ اس کیلئے عمل پیہم، نیک نیتی و معقول حکمتِ عملی درکار ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ سرکاری زبان کے تحفظ کیلئے سیکریٹریٹ میں ایک الگ شعبہ قائم کیا جائے۔ جموں وکشمیر لداخ کیلئے ایک ریڈیو اور ایک ٹی۔وی۔ چینل اُردو کی قائم کی جائے۔ ریاستی سرکار کے ہر شعبے سے ماہانہ ایک ایک رسالہ اُردو میں شائع ہونا چاہیے جس میں وہ اپنی کارکردگی دکھا سکیں گے۔ پرائیمری سطح سے ہی اُردو اساتذہ کی تربیت کا کوئی خاص انتظام کیا جائے۔ سرکاری نوکریوں میں اُردو امیدواروں کو ترجیح دی جائے۔ اُردو کمپیوٹر اور دیگر ٹیکنالوجی کو عام کیا جائے۔ سرکاری دفتروں محکمہ مال، محکمہ عدلیہ اور محکمہ پولیس میں تمام دفتری کاروائی اُردو میں ہی کی جائے۔ اگر کوئی شخص نجی طور پر یہاں اُردو کیلئے اپنا ''اشاعتی گھر'' کھولنا چاہے گا تو اس سے باضابطہ سے سرکار سے قرضہ سبسڈی کے ساتھ ملنا چاہیے۔ اُردو قلم کاروں اور صحافیوں کے مسائل کو حل کیا جائے۔ انہیں حسبِ موافق مالی معاونت سرکاری طور پر فراہم کی جائے۔

خود مختار ادبی ادارے:

ہماری کامیابی اُسی وقت ممکن ہو سکے گی جب ہم ہر عمر کے بچوں کیلئے اچھے مواد فراہم کر سکیں۔ اطمینان بخش بات یہ ہے کہ ساہتیہ اکادمی، نیشنل بک ٹرسٹ اور قومی کونسل برائے اُردو زبان کا اس سمت میں کلیدی رول رہا ہے۔ یہ تینوں ہی سرکار کے خود مختار ادارے ہیں۔ ان اداروں میں مختلف اسکیموں اور پروگراموں کے ساتھ اشاعتی پروگرام بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اشاعتی کے تحت ان اداروں میں ایک

طرف جہاں ادب میں سماج اور کلچر پر بہت سی کتابیں بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان اداروں میں اسکول کی سطح پر ادبی و علمی اور تعلیمی شعبے سے تعلق رکھنے والے جو ممتاز ادباء، شعرا، ناقدین، محقق اور دوسرے تخلیق کار نصاب میں شامل ہیں۔ اس ادارے سے ریاست جموں و کشمیر کے طلباء و طالبات مختلف اسکیموں اور پروگراموں سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

ساہتیہ اکادمی:

ساہتیہ اکادمی کا قیام 1954 عیسوی میں عمل میں آیا تھا۔ یہ ہندوستان کا عظیم ادارہ ہے۔ اور اس ادارے کے تحت ہندوستان کی 24 زبانوں میں کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ جن میں ناول، کہانیاں، شاعری، ڈرامے، تاریخی ادب، ہندوستانی ادب کے معمار اور بچوں کا ادب سے متعلق بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ کچھ اہم تعلیمی و علمی شخصیات پر بھی کتابیں دستیاب ہیں۔ ساہتیہ اکادمی نے اردو کی جو کتابیں شائع کی ہیں یوں تو اس کا خاص مقصد ہندوستانی ادب کے ارتقاء اور ان کے مختلف رجحانات کے عام قارئین کو متعارف کرانا ہوتا ہے، لیکن اس سیریز کے تحت ہندوستانی ادب کے معروف ادیبوں اور شاعروں کی جو سوانح اور ان کی ادبی خدمات پیش کی جاتی ہیں وہ ایک طالب علم کیلئے بھر پور معلومات ہوتی ہیں۔ ان میں ہر طرح کے تخلیق کار اور فن کار قدیم و جدید شامل ہوتے ہیں۔ اُردو کی کئی ریاستوں میں پہلی یا دوسری سرکاری زبان قرار دیا جانا اس بات کا دستاویزی ثبوت ہے کہ حکومت نے اس سلسلے میں اردو کے فروغ کے لئے برابر دلچسپی لی ہے اور یہ کام تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔

اس وقت ریاست جموں وکشمیر کے اُردو طلباء و طالبات کو بھی ادارے کی کتابوں سے برابر فائدہ ملتا ہے۔ اب اس ریاست میں اُردو میڈیم کی طرف طلبا برابر دلچسپی لے رہے ہیں۔ کیونکہ اُمیدواراب ''IAS آے۔اے۔ایس'' امتحان اردو میڈیم میں دے سکتے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان:

ایک قومی ادارہ ہے جس کا اولین مقصد اُردو کتابوں کی نشر واشاعت اور مالی امداد بہم پہچانا ہے۔ قومی اُردو کونسل نے دہلی میں اپریل 1996 عیسوی سے فروغِ اردو کے کام کاج کا آغاز کیا تھا۔ یہ ادارہ حکومت ہند کی نوڈل ایجنسی کے طور پر کام کرتا ہے۔ حالیہ برسوں میں اس ادارے کی سرگرمیوں کا دائرہ کافی وسیع ہوا ہے۔ کمپیوٹر ایجوکیشن کو اردو سے جوڑنا، اردو کتابوں کو انٹرنیٹ پر مہیا کرانا اور اُردو کی تعلیم کو آن لائن کرانا، اس کی حالیہ اہم سرگرمیوں میں شامل ہے۔ اس ادارے نے ایک طرف یہاں بہت سے قلم کاروں کی کتابوں کی اشاعت کیلئے مالی امداد فراہم کی ہے وہیں دوسری طرف بے شمار کتابیں بھی شائع کی ہیں۔ اس نے ادبیات، انسئیکلو پیڈیا و تاریخ، مختلف ادیبوں کی حیات و خدمت، زبان ولسانیات، سائنس، جغرافیہ، صحافت، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کُتب خانہ داری، کتابیات، محاشیات وتجارت اور نفسیات کے ساتھ بچوں کا ادب تعلیم و تدریس پر متعدد کتابیں چھاپی ہیں۔ ادارہ خصوصاً این۔سی۔ای۔آر۔ٹی ومکتبہ جامعہ کی بھی کتابیں چھاپ چکا ہے۔ علاوہ ازیں قومی اردو کونسل کے پاس بچوں کا ادب کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ ادارہ

بچوں کیلئے 300 سے زائد کتابیں شائع کرنے کا فریضہ انجام دے چکا ہے اور یہ کام برابر جاری ہے۔

قومی اُردو کونسل تعلیم وتدریس کے حوالے سے بھی اب تک بہت سی کتابیں شائع کر چکی ہے۔ تعلیم وتدریس سے متعلق ان میں کئی کتابیں ایسی ہیں جو کسی نہ کسی سطح پر تعلیم وتدریس کے مسائل بھی حل کرتی ہیں اور نصابی سطح پر معاون بھی ثابت ہوتی ہیں۔ قومی کونسل نے حیات وخدمات اور زبان ولسانیت کے حوالے سے بہے اہم کتابیں شائع کی ہیں جن میں اُردو صرف ونحو، ابتدائی اُردو املا نامہ، انتخاب نثر اردو، آہنگ اور عروض درس و بلاغت، صحت الفاظ'' قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کونسل نے نیشنل بک ٹرسٹ کی بہت سی اہم کتابوں کا اُردو میں ترجمہ رنگین تصاویر کے ساتھ شائع کیا ہے۔ تقریباً 470 کتابوں میں سے ایک سو پچیس کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کونسل نے شائع کیا ہے اور یہ کام شدومد کے ساتھ جاری ہے۔ کونسل ادبِ اطفال پر ہر سال لاکھوں روپے خرچ کرتی ہے اور معیاری اور سستی کتابیں چھاپ کر بچوں کیلئے کتابیں مہیا کراتی ہے۔ حکومت تو اُردو کیلئے اپنی سطح پر کچھ نہ کچھ کر رہی ہے۔

وادیٔ کشمیر کے (IAS) آئی۔ اے۔ ایس آفیسر، شاہ فیصل:

یہاں وادیٔ کشمیر میں اب اردو کے طلبا اُردو زبان وادب میں سنجیدگی سے دلچسپی لے رہے ہیں۔ قومی اُردو کونسل نے جو کتابیں شائع کی ہیں ان سے برابر فائدہ لے رہے ہیں۔ تازہ ترین مثال کشمیر کے شاہ فیصل کی ہے جنھوں نے اُردو سے

''آئی۔اے۔ایس'' کا امتحان دیا اور کامیابی حاصل کر کے آئی۔اے۔ایس آفیسر بن کر اردو والوں کیلئے ایک روشن مثال بن کر سامنے آئے۔

(IAS) آئی۔اے۔ایس آفیسر، ایس۔ایم۔اشرف:

ایس۔ایم۔اشرف نے اُردو زبان میں امتحان دیکر آئی۔اے۔ایس میں کامیابی حاصل کی۔اُردو میں کیا نہیں ہے اور پھر اگر اردو سے ملازمت IAS نہ ملے تو کیا ہم اردو کو خیر باد کہ دیں گے ہمیں اردو کیلئے قربانی دینے کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرنا ہوگا۔

اُردو زبان وادب کی ترویج میں کشمیریوں کا حصہ:

سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر کے شعبۂ اردو کی طرف سے 9/ا اکتوبر 2013 عیسوی کو ''اُردو زبان وادب کی ترقی وترویج میں کشمیریوں کا حصہ'' کے عنوان سے دو روزہ سمینار کا اہتمام کیا گیا۔ یہ سمینار کشمیر یونیورسٹی کے گاندھی بھون میں ہوا اور اس میں ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے اُردو کے سرکردہ ادیبوں اور قلمکاروں نے شرکت کی۔سمینار کے افتتاحی سیشن کی صدارت سینٹرل یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب عبدالواحد قریشی نے کی جب کہ کشمیر یونیورسٹی کے ایک سابق وائس چانسلر حامدی کاشمیری نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔تقریب میں سرکردہ ادیب اور محقق محمد یوسف ٹینگ۔سابقہ ڈائریکٹر نیشنل برائے فروغ اردو خواجہ محمد اکرم الدین، رجسٹرار سینٹرل یونیورسٹی پروفیسر افضل زرگر اور سینٹرل یونیورسٹی کے شعبہ اُردو کے سابقہ کوارڈینٹر پروفیسر قدوس جاوید بھی موجود تھے۔

اُردو زبان، محبت بھائی چارے اور امن کی زبان ہے جس نے پورے ہندوستان کو ایک لڑی میں پروئے کر رکھا ہے۔ یہ وہ زبان ہے جس نے پورے ہندوستان جس کی آبیاری ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے ادیبوں نے اپنے خونِ جگر سے کی ہے۔ یہ زبان ہندوستان کی اپنی زبان ہے جس سے کسی ایک مذہب یا فرقے سے جوڑنا اس کے سیکولر کردار کو مجروح کرنے کے مترادف ہوگا۔

اس زبان کے شاعروں اور ادیبوں نے تحریک آزادی میں کارنامے انجام دئے ہیں جو سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ یہی وہ زبان ہے جو محبت واخوت کا پیغام دیتی ہے۔ اُردو مشترکہ تہذیب کی علامت ہے اور اس سے فروغ نہ دینا صدیوں پرانی تہذیب کو ختم کرنا ہوگا۔

ریاست جموں وکشمیر جہاں اُردو سرکاری زبان کا درجہ رکھتی ہے اور اردو چونکہ پورے ملک اور ریاست کی رابطے کی زبان ہے اس لئے اس کو تمام اسکولوں اور کالجوں میں ضروری مضمون کے تحت رائج کیا جائے۔ اُردو اکیڈیمیوں کو زیادہ سے زیادہ مالی امداد دی جائے۔ حکومت اس تہذیبی زبان کو فرقہ پرست طاقتوں سے محفوظ رکھنے کیلئے موثر اقدامات اُٹھائے اور ریاست میں جو لوگ اردو رسم الخط بدلنے کی بات کرتے ہیں، حکومت کا فرض ہے کہ وہ اُن لوگوں کے خلاف سخت کاروائی کریں۔

چیف سیکریٹری کی قیادت میں خصوصی کمیٹی تشکیل:

روزنامہ آفتاب 24 فروری 2014 عیسوی:

ریاست جموں وکشمیر میں زبون حالی کی شکار اردو زبان کو اس کا کھویا ہوا

مقام دلانے اور اِسے عام زبان کے طور متعارف کروانے کیلئے حکومت کی طرف سے چیف سیکریٹری کی قیادت میں جو خصوصی کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔ اس نے اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کر دی۔ بیس صفات پر مشتمل اس رپورٹ میں اردو کی ترقی و ترویج کیلئے جو سفارشات پیش کی گئی۔ اگر ان پر عمل کیا جائے گا تو اس ریاست میں اردو کو صحیح معنوں میں اس کا کھویا ہوا مقام مل سکتا ہے۔ اگر اردو اس ریاست کی سرکاری زبان ہے لیکن اس کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک کیا جاتا رہا ہے اور اب تک اس میٹھی اور شرین زبان کو وہ مقام نہیں دیا گیا، جس کی یہ مستحق ہے۔

''سرسری طور پر رپورٹ کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا، اس کے مطابق بھرتی قوانین میں تبدیلی، اردو اساتذہ کی تقرری، سٹیٹ کونسل فار پروموشن آف اردو اور کلچرل اکیڈیمی کو استحکام بخشنے کی سفارش کی گئی اور اس کے ساتھ ہی محکمہ مال اور محکمہ تعلیم میں خاص طور پر اُردو اسامیاں معرضِ وجود میں لانے پر زور دیا گیا ہے۔ محکمہ قانون اور پارلیمانی امور میں کے۔ اے۔ ایس طرز پر بھرتی عمل کیلئے اردو زبان میں امتحانات لینے کی بھی سفارش کی گئی ہے''۔

(بحوالہ روزنامہ آفتاب۔24 فروری 2014 عیسوی)

یہ خوش آیندہ بات ہے کہ حکومت نے اردو کو اس کا اصل مقام دلانے کیلئے آخر کار کوشش شروع کی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس رپورٹ پر کب عمل درآمد ہوگا جو اس حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ زبان و ادب کی ترقی و ترویج کیلئے بنیادی سطح پر اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ بھارت کی متعدد ریاستوں اور خاص

طور پر دہلی، اتر پردیش، راجستھان، ہریانہ اور ہماچل پردیش میں سرکاری زبان ہندی ہے اور ان ریاستوں کی حکومتوں کو معلوم ہے کہ کس طرح اس زبان کو نہ صرف زندہ رکھنا ہے بلکہ اس کو آگے بھی لے جانا ہے تا کہ یہ زبان نسل در نسل منتقل ہو سکے اس کے لئے ان ریاستوں میں ایک تو پہلی جماعت سے ہندی پڑھائی اور سکھائی جارہی ہے اور دوسری سب سے اہم بات یہ ہے کہ سارا سرکاری کام کاج ہندی میں ہوتا ہے۔ اسکول کی رجسٹری سے لے کر ایڈمیشن فارم تک ہندی میں ہوتے ہیں۔ سول سیکریٹریٹ میں سارے سرکاری کاغذات ہندی میں ہوتے ہیں۔ عدالتوں کے علاوہ محکمہ مال وغیرہ میں بھی ہندی ہی چلتی ہے۔

شیریں اردو زبان برصغیر میں رابطے کی زبان ہے

اُردو کونسل 23 مارچ 2014:

اردو کونسل نے جموں وکشمیر اردو زبان کی ترویج وفروغ کے حوالے سے کشمیر یونیورسٹی کے سابقہ وائس چانسلر ڈاکٹر طلعت احمد کی خدمات کو سراہتے ہوئے اعزازی تقریب کا اہتمام کیا۔ جس میں یونیورسٹی حکام کے علاوہ مختلف ادبی، علمی، ثقافتی، ملازم انجمنوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اس تقریب میں کشمیر نیوز سروس کے سربراہ محمد اسلم مہمان خصوصی تھے جبکہ پروفیسر مرغوب بانہالی اعزازی مہمان کی حیثیت سے موجود تھے۔ کشمیر یونیورسٹی نے حال ہی میں یونیورسٹی کے جنوبی کیمپس میں ایم۔اے سطح کا اردو مضمون متعارف کرانے کا تاریخی اعلان کیا۔ اس اقدام کو سراہتے ہوئے اردو کونسل نے یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر طلعت احمد نے

کہا کہ ساوتھ کیمپس میں رواں سال کے دوران ہی اردو کا مضمون شامل کیا جائے گا۔اوراس میں 50 طلبہ کو داخلہ دیا جائے گا۔انہوں نے مزید کہا کہ یونیورسٹی کے شمالی اور باقی کیمپوں میں بھی مرحلہ وار طریقے پر اردو مضمون کو شامل کیا جائے گا۔ اردو کونسل کے جنرل سیکرٹری جاوید ماٹجی نے کہا کہ اردو ہماری سرکاری، تہذیبی اور ثقافتی زبان ہے۔اس زبان کی ترویج وفروغ کیلئے کام کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔اس موقعہ پر اورلوگوں کے علاوہ یونیورسٹی کے رجسٹرار ظفر ریشی، ڈین آرٹس ساوتھ کیمپس پروفیسر بشیر احمد نحوی، ڈائریکٹر اقبال انسٹیچوٹ ڈاکٹر سکینہ فاضلی، شعبہ اردو کے سربراہ ڈاکٹر منصور احمد اور کشمیر بک پرموشن ٹرسٹ کے شبیر احمد موجود تھے۔

سرکاری زبان اردو کی آئینی حیثیت بحال کرنے کی کوشش:

اردو محاذ...... 21 دسمبر 2015 عیسوی:

سرکاری زبان کی آئینی حیثیت کی بحالی کیلئے محبانِ اردو کے سرگرام پلیٹ فارم ''اردو محاذ'' نے سرکار سے اردو زبان کی وقار اور جائیز مقام کی بحالی کا مطالبہ کیا گیا۔اس دوران وزیر اعلیٰ کی طرف سے پٹواریوں کے امتحانات میں اردو کو نظر انداز کرنے کے معاملے میں مداخلت اور بعدازاں امتحانات ملتوی کرنے کے فیصلے کو بھی سراہا گیا۔اردو محاذ نے جموں وکشمیر میں اردو زبان کی آئینی حیثیت کو بحال کرنے کا مطالبہ کیا کہ اس زبان کو نظر انداز کرنے والے افسران کے خلاف کاروائی عمل میں لائی جائے۔ادھران موجودہ تعلیمی نظام میں اردو زبان کو جائز مقام دینے کی وکالت کرتے ہوئے کہا گیا کہ اگر آج سے ہی اس سلسلے میں سرکاری سطح پر اقدامات نہیں

اُٹھائے گئے تو آئیندہ نسل اردو زبان سے محروم ہو جائے گی۔

ادارۂ نگینہ انٹرنیشنل 16-2015 عیسوی......وحشی سعید

اردو زبان وادب کی ترقی وترویج کے سلسلے میں نگینہ کے مدیرِ اعلیٰ وحشی سعید نے بین الاقوامی ادبی میگزین اور نگینہ تخلیق نمبر پیش کیا۔ دونوں رسالے ریاستی، ملکی اور بین الاقوامی اہمیت کے نامور اور مقتدر قلم کاروں کے متنوع نگارشات سے مزین ہیں۔ اب ''نگینہ'' سال میں دو شماروں کے بجائے تین شمارے منظر عام پر آئیں گے۔ اس اقدام سے یقیناً ریاست میں اردو زبان وادب کو نئی بلندیوں سے ہمکنار ہونے کے امکانات روشن ہونگے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ''نگینہ'' کا ضخیم وجسیم انٹرنیشنل نمبر شائع ہو کر عالمگیر سطح پر خراجِ تحسین قبول وصول کر چکا ہے۔

اردو زبان کو فروغ دینے کے لئے اقدامات

6/اپریل 2018عیسوی:

وزیرِ تعلیم کی صدارت میں جموں وکشمیر کونسل برائے فروغ اُردو زبان کی پہلی میٹنگ منعقد ہوئی جس میں معروف سکالروں، ادیبوں اور یونیورسٹیوں سے تعلق رکھنے والے فیکلٹی ممبران اور سربراہان کی اچھی خاصی تعداد نے بھی شرکت کی۔ اس موقعہ پر وزیر نے کہا کہ اس اہم ادارے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اس زبان کے اُس مقام کو بحال کیا جائے جو یہ ریاست میں صدیوں سے اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس موقعہ پر اردو زبان کو فروغ دینے کے حوالے سے سیر حاصل تبادلہ کیا گیا۔ سکولوں میں اردو پڑھانے والوں کی کمی دور کرنے کے لئے حکومت نے دس فیصد اسامیاں

اردو زبان کے لئے رکھی ہیں۔ وزیر نے یہ بات واضح کر دی ہمارا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اردو کو ریاست اور پورے سماج میں اپنا موزوں وقار مل سکے۔ پرنسپل سیکریٹری ڈاکٹر اصغر علی سامون، وایس چیرمین سٹیٹ اردو کونسل ظفر اقبال منہاس، ڈائریکٹر نیشنل کونسل فار ڈیولپمنٹ آف اردو ارتقا کریم، سیکریٹری کلچرل اکیڈیمی ڈاکٹر عزیز حاجنی، نے اردو زبان کی اہمیت اور اسے فروغ دینے کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

کشمیر میں اردو کی ترقی اور بقا کا مسئلہ اس زبان کے کل ہند مستقبل سے وابستہ ہے۔ محکمہ اطلاعات اور محکمہ تعلیم کیلئے اردو میں کام کاج کرنا اشد ضروری ہے۔ ان محکموں میں انگریزی کے بجائے اردو میں خط وکتابت کا سلسلہ جاری ہونا چاہیے۔ علاقائی سطح پر جو امتیازی سلک اس زبان کے ساتھ کیا جارہا ہے۔ اس کو کم کیا جائے۔ عدالتوں اور اسمبلی میں سرکاری کام کاج اردو زبان میں ہونا چاہئے۔ ریاست، ضلع اور تحصیل کی سطح پر انتظامیہ کے تمام افسروں کیلئے اردو کا علم ہونا ضروری ہے۔

اب اگر اردو والے خلوص دل سے اردو کی بقا چاہتے ہیں تو ادب کو دولت سے اونچا مقام دینا ہوگا۔ پس ہم اس نتیجے پر آپہنچے کہ اردو ہماری، آپ کی، سب کی زبان ہے۔ اس کی خدمت کرنا اور اسے ترقی دینا ہمارا اولین فرض ہے۔

ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی ادبی خدمات

(1957 عیسوی ......تاحال)

ریاست میں اردو زبان وادب کی ترقی وترویج کیلئے ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے جو رول ادا کیا ہے اُسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ جب بھی کبھی ریاست میں اردو زبان وادب کی تاریخ لکھی جائیگی۔ کلچرل اکیڈیمی کی گرانقدر خدمات کو بھی سراہا جائیگا کہ ریاست میں میں اردو کی مخصوص پوزیشن، مرتبے اور تشخص کو متعین کرنے میں اکیڈیمی کی کارکردگی قابلِ ستائش ہے۔ ریاست میں اِس ادارے کا قیام 1957 عیسوی میں اُس وقت کے وزیراعظم بخشی غلام محمد کی حکومت میں عمل میں آیا اوراس وقت اردو زبان ریاست میں رابطے اور سرکاری زبان کا درجہ حاصل کر کے کئی مراحل سے گذر چکی تھی۔ کئی انجمن اور ادبی مراکز قائم ہو چکے تھے۔ تعلیمی اداروں میں اس کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام تھا۔ جموں وکشمیر اور لداخ تینوں علاقوں میں رابطے کی زبان کی ضرورت کو پورا کرتے ہوئے فروغ حاصل کر رہی تھی اور ریاست اُس وقت کے ادیب وشاعر اپنی مادری زبان کے بجائے اردو زبان کو اپنی تخلیقی

اظہار کا ذریعہ بنا رہے تھے۔ ایسے وقت میں کلچرل اکیڈیمی کے قیام نے اردو زبان وادب کے فروغ کو مزید استحکام عطا کیا۔ وادی کے تخلیق کاروں کو انعامات، اعزازات اور مالی معاونت سے نوازا گیا۔ اردو خوشنویسی، فن خطاطی یا کتابت کا درس بھی اکادمی میں دیا جانے لگا۔ گویا اردو کو ایک سہارا مل گیا جو ہر طرح سے اُس کے پھلنے پھولنے میں مددگار و معاون ثابت ہوا۔ اپنے قیام کے پچاس برسوں کے دوران اکادمی نے نہ صرف بہت سے مصنفین کی کتابیں شائع کیں بلکہ علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو میں تین رسالے ''شیرازہ''، ''ہمارا ادب'' اور ''خبرنامہ اکادمی'' شائع ہونے لگا۔

1958 عیسوی میں جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچرل اینڈ لنگویجز کے قیام کے فوراً بعد ریاست کی مالا مال ادبی اور ثقافتی روایات کو منظّم کرنے اور انہیں تقویت دینے کے مقصد سے جنوری 1962 عیسوی میں اُس وقت کے صدر اکیڈیمی بخشی غلام محمد کی اجازت سے ''شیرازہ'' نام کا اردو رسالہ جاری کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اکیڈیمی کی زمام اقتدار وقت کے عالم بے بدل اور جہاں دیدہ شخصیت جناب علی جواد زیدی کے ہاتھوں میں تھی۔ اُنہوں نے ذاتی اثر و رسوخ اور دیرینہ دوستانہ روابط کو بروئے کار لاتے ہوئے وقت کی سرکردہ تمدن شناس شخصیتوں، صاحبزادہ حسن شاہ، پروفیسر رام ناتھ شاستری، پروفیسر عبدالقادر سروری اور پروفیسر جے لال کول اس بات کیلئے آمادہ کیا کہ شیرازہ کے خدوخال متعین کرنے کیلئے مشاورتی بورڈ میں شامل ہوں۔ وزیر اعظم بخشی غلام محمد بحیثیت صدر اکادمی

جناب علی جواد زیدی کی یہ استدعا منظور ہوئی کہ محمد یوسف ٹینگ، جو اس وقت محکمہ اطلاعات میں بطورِ ڈسٹرکٹ انفارمیشن آفیسر کام کر رہے تھے، ریاستی کلچرل اکیڈیمی میں بطورِ ایڈیٹر ''شیرازہ'' تعینات کیا جائے۔ اس طرح سے صاحبزادہ حسن شاہ، پروفیسر رام ناتھ شاستری، پروفیسر عبدالقادر سروری اور پروفیسر جے لال کول کی مشاورت، جناب علی جواد زیدی کی نگرانی او جناب محمد یوسف ٹینگ کی ادارت میں ''شیرازہ'' کلچرل اکیڈیمی کے نام اور اس کے آئینی حدود کی پاسداری میں فقط ادب اور ثقافت کی خدمت کیلئے وقف رہے گا۔

''شیرازہ'' سرکاری ایجنسیوں کی طرف سے شائع ہونے والے رسالوں میں واحد ایسا رسالہ ہے جو خالص ادبی ہے۔ اس کا واضع نصب العین ہے کہ ریاست کے علمی، ادبی اور ثقافتی، شعبوں میں تحقیق اور ان شعبہ جات میں انجام دی جارہی سرگرمیوں کو ارباب نظر اور صاحبان ذوق تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ نو آموز قلمکاروں کو مناسب پلیٹ فارم مہیا کر کے اُن کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کی جائے۔ ''شیرازہ'' گذشتہ نصف صدی سے خطے کی تاریخ و تمدن، ثقافت و ادب کے مختلف پہلوؤں پر مضامین شائع کرتا رہا ہے۔ ریاست کے تمدنی اور فنی ورثے کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی مقالات اس کا خاصا رہے ہیں۔ منظومات اور تراجم اس کے ہر شمارے میں مناسب جگہ پاتے رہے اور اس بات کی حتی الامکان کوشش کی جاتی ہے کہ ہر حال میں اس رسالے کا تحقیقی مزاج قائم رہے۔

جناب جواد زیدی نے ''شیرازہ'' کے پہلے شمارے میں اپنے تاثرات اس

اظہار کا ذریعہ بنا رہے تھے۔ ایسے وقت میں کلچرل اکیڈیمی کے قیام نے اردو زبان وادب کے فروغ کو مزید استحکام عطا کیا۔ وادی کے تخلیق کاروں کو انعامات، اعزازات اور مالی معاونت سے نوازا گیا۔ اردو خوشنویسی، فن خطاطی یا کتابت کا درس بھی اکادمی میں دیا جانے لگا۔ گویا اردو کو ایک سہارا مل گیا جو ہر طرح سے اُس کے پھلنے پھولنے میں مددگار و معاون ثابت ہوا۔ اپنے قیام کے پچاس برسوں کے دوران اکادمی نے نہ صرف بہت سے مصنفین کی کتابیں شائع کیں بلکہ علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو میں تین رسالے ''شیرازہ''، ''ہمارا ادب'' اور ''خبرنامہ اکادمی'' شائع ہونے لگا۔

1958 عیسوی میں جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچرل اینڈ لنگویجز کے قیام کے فوراً بعد ریاست کی مالامال ادبی اور ثقافتی روایات کو منظّم کرنے اور انہیں تقویت دینے کے مقصد سے جنوری 1962 عیسوی میں اُس وقت کے صدر اکیڈیمی بخشی غلام محمد کی اجازت سے ''شیرازہ'' نام کا اردو رسالہ جاری کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اکیڈیمی کی زمام اقتدار وقت کے عالم بے بدل اور جہاں دیدہ شخصیت جناب علی جواد زیدی کے ہاتھوں میں تھی۔ اُنہوں نے ذاتی اثر ورسوخ اور دیرینہ دوستانہ روابط کو بروئے کار لاتے ہوئے وقت کی سرکردہ تمدن شناس شخصیتوں، صاجبزادہ حسن شاہ، پروفیسر رام ناتھ شاستری، پروفیسر عبدالقادر سروری اور پروفیسر جے لال کول اس بات کیلئے آمادہ کیا کہ شیرازہ کے خدوخال متعین کرنے کیلئے مشاورتی بورڈ میں شامل ہوں۔ وزیراعظم بخشی غلام محمد بحیثیت صدر اکادمی

جناب علی جواد زیدی کی یہ استدعا منظور ہوئی کہ محمد یوسف ٹینگ، جو اس وقت محکمہ اطلاعات میں بطورِ ڈسٹرکٹ انفارمیشن آفیسر کام کر رہے تھے، ریاستی کلچرل اکیڈیمی میں بطورِ ایڈیٹر ''شیرازہ'' تعینات کیا جائے۔ اس طرح سے صاحبزادہ حسن شاہ، پروفیسر رام ناتھ شاستری، پروفیسر عبدالقادر سروری اور پروفیسر جے لال کول کی مشاورت، جناب علی جواد زیدی کی نگرانی او جناب محمد یوسف ٹینگ کی ادارت میں ''شیرازہ'' کلچرل اکیڈیمی کے نام اور اس کے آپسی حدود کی پاسداری میں فقط ادب اور ثقافت کی خدمت کیلئے وقف رہے گا۔

''شیرازہ'' سرکاری ایجنسیوں کی طرف سے شائع ہونے والے رسالوں میں واحد ایسا رسالہ ہے جو خالص ادبی ہے۔ اس کا واضع نصب العین ہے کہ ریاست کے علمی، ادبی اور ثقافتی، شعبوں میں تحقیق اور ان شعبہ جات میں انجام دی جارہی سرگرمیوں کو ارباب نظر اور صاحبان ذوق تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ نو آموز قلمکاروں کو مناسب پلیٹ فارم مہیا کر کے اُن کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کی جائے۔ ''شیرازہ'' گذشتہ نصف صدی سے خطے کی تاریخ وتمدن، ثقافت وادب کے مختلف پہلوؤں پر مضامین شائع کرتا رہا ہے۔ ریاست کے تمدنی اور فنی ورثے کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی مقالات اس کا خاصا رہے ہیں۔ منظومات اور تراجم اس کے ہر شمارے میں مناسب جگہ پاتے رہے اور اس بات کی حتی الامکان کوشش کی جاتی ہے کہ ہر حال میں اس رسالے کا تحقیقی مزاج قائم رہے۔

جناب جواد زیدی نے ''شیرازہ'' کے پہلے شمارے میں اپنے تاثرات اس

طرح قلم بند کئے ہیں۔

''شیرازہ'' کو اردو زبان کے دوسرے رسالوں کی طرح عام رسالہ سمجھنا غلط ہوگا۔ ہم نے اس معیار کو نہیں اپنایا ہے کہ اس میں بہت سی نظمیں، غزلیں اور افسانے ہوں، کچھ مزاحیہ مضامین ہوں اور اس میں دو ایک مضامین بھی شائع ہو جائیں۔ ''شیرازہ'' خالص علمی اور تحقیقی رسالہ ہے۔ اس کا ایک واضح مقصد ہے اور وہ ہے ریاست کی ثقافتی سرگرمیوں کو ہر خطے اور علاقے کے ارباب نظر اور صاحبان ذوق تک پہنچانا''۔

اگرچہ ریاست کے تمام علاقوں میں ثقافتی یگانگت ہے، پھر بھی اپنے مخصوص ثقافتی اقتباسات کی بدولت کشمیری، ڈوگری، لداخی کے اردگرد بعض مخصوص دائرے ہیں۔ اس کے علاوہ پنجابی، بلتی، گوجری، پہاڑی بھی اپنے جوہر آزما رہی ہیں۔ زبانوں کے اس رنگارنگ مجمع میں اردو ایک بین العلاقائی رابطہ کا کام دیتی ہے۔ اس کیلئے علاقے کی تخلیقات سے دوسرے علاقہ والوں کو روشناس کرانے کیلئے ''شیرازہ'' نے اردو کو وسیلہ بنایا ہے۔ اس رسالہ نے ریاست اور ریاست سے باہر اردو دان طبقے کے درمیان روابط قائم کرنے کیلئے راہیں ہموار کیں۔

''شیرازہ'' اردو کی خدمات کا سرسری اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ریاست اور بیرون ریاست میں اس کی مختلف جہتوں پر چار پی۔ ایچ۔ ڈی اور چھ ایم۔ فل مقالے تحریر کئے جاچکے ہیں۔ شری مہیش کمار گپتا نے ''شیرازہ'' کے

ابتدائی دس سال کا وضاحتی اشاریہ مرتب کر کے شائع کروایا ہے۔ ڈاکٹر شفق سوپوری نے شیرازہ کا مکمل اشاریہ تیار کیا جس سے اکیڈیمی نے محققوں، ادب نوازوں اور طلبا کے اسفادے کیلئے زیور طباعت سے آراستہ کیا ہے۔ ملک کے تمام کتب خانوں میں شیرازہ کی مکمل فائل موجود ہیں اور تشنگانِ علم کی پیاس بجھا رہے ہیں۔

اردو ''شیرازہ'' قد آور اردو ادیبوں کی نظر میں:

پروفیسر حامدی کاشمیری کا نظریہ:

''شیرازہ'' ایک خالص علمی اور تحقیقی رسالہ ہے اور اس کا واضع مقصد ہے ریاست کی ثقافتی اور علمی سرگرمیوں کو ہر خطے اور علاقے کے ارباب نظر اور صاحبان ذوق تک پہنچانا ہے۔ حامدی صاحب لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ یہ رسالہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ خالص ادبی تحقیقی اور علمی مزاج کو قائم کرنے میں کامیاب رہا اور اس کی کامیابی کا سہرا محمد یوسف ٹینگ کے سر ہے، جواد زیدی صاحب کی خواہش کے مطابق ماہنامہ ''تعمیر'' کی ادارت کو خیر باد کہہ کر ''شیرازہ'' کے مدیر اعلیٰ مقرر ہونے اور اولین شمارے سے برسوں تک اس کی ادارت میں مصروف رہے اور معاونین کے طور پر مختلف اوقات میں خصوصی طور پر محمد احمد اندرابی اور محمد اشرف ٹاک

کام کرتے رہے''۔

نیا پروگرام ''شیرازہ'' کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ترسیلی اور اشاعتی دائرہ کار صرف ریاست تک ہی محدود نہیں رہا ہے۔ اس کے ہر شمارے میں بیرون ریاست کی زبانوں کے ادب، خاص طور سے اردو ادب سے متعلق مضامین اور منظومات کو کھلے دِل سے جگہ دی گئی اور مستند نقادوں اور قلمکاروں کا تعاون حاصل کیا جاتا رہا۔ ان میں سید احتشام حسین، سید محی الدین قادری زورؔ، خلیل الرحمٰن اعظمی، مسعود حسین خان، اختر انصاری، ڈاکٹر عابد حسین، عبدالقادر سروری قابل ذکر ہیں۔

''شیرازہ'' نے خاص طور پر نئی نسل کے ادیبوں، شاعروں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس کا ثبوت وہ نوجوان نمبر ہیں جو اکتوبر 1979 عیسوی اور خاص طور سے ستمبر 1980 عیسوی میں شائع ہوئے۔ ان نمبروں سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ''شیرازہ'' نے ریاست میں اردو زبان وادب کو مقبول بنانے میں کتنا اہم رول ادا کیا ہے۔ اکیڈیمی مختلف اوقات پر ''شیرازہ'' خصوصی نمبر بھی شائع کرتی رہی جیسے ''جموں، کشمیر، لداخ نمبرات قدیم تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں''۔ 1973 عیسوی میں جدیدیت شمارہ نمبر، کشمیر نمبر، جنوری مارچ 1989 عیسوی کشمیری عجائبات نمبر، 1987 عیسوی شاہ ہمدانؒ نمبر وغیرہ۔ حالیہ برسوں میں محمد اشرف ٹاک نے مختصر وقت میں مختلف سیاسی اور ادبی شخصیات کے خصوصی نمبر شائع کئے ہیں۔ شیرازہ گولڈن جوبلی 10 جنوری 2013 عیسوی میں شائع ہوا۔

''شیرازہ''......ایک رسالہ، ایک تحریک:

پروفیسر قدوس جاوید کی نظر میں:

ریاست جموں و کشمیر اردو کی آخری پناہ گاہ ہے اور یہ پناہ گاہ جن ستونوں پر قائم ہے ان میں ''جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز'' کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ قدوس جاوید شیرازہ اردو کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''جہاں تک ''شیرازہ اردو'' کے حوالے سے ریاست میں خالص ادبی تحقیق وتنقید کا تعلق ہے۔ اس کا سرمایہ اتنا وسیع اور ہمہ جہت ہے کہ ریاست کی یونیورسٹیوں میں کوئی بھی تحقیقی منصوبہ اس سرمایہ سے استفادہ کے بغیر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اگر کشمیر یونیورسٹی کا اردو شعبہ اس سرمایہ سے رجوع کریں تو پھر ان کی تحقیق وتنقید کے دائرے اتنے رسمی اور تنگ نہیں رہیں گے''۔

''شیرازہ''......ایک علمی وادبی رسالہ......عبدالغنی شیخ کی نظر میں:

جناب عبدالغنی شیخ لکھتے ہیں کہ ''شیرازہ اردو'' کے مدیر اعلیٰ محمد اشرف ٹاک نے ''جموں و کشمیر اور لداخ'' پر شیرازہ کے خصوصی شماروں کے اجراء کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس ضمن میں اب تک سات ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ مزید شمارے نکل رہے ہیں۔ اس سے پہلے ''ہمارا ادب'' کے مدیر محمد احمد اندرابی نے بھی تینوں اکائیوں کے تمدن اور ثقافت پر خصوصی شمارے نکالے تھے۔ مذکورہ خصوصی شماروں میں ریاست کے ادیبوں اور محققوں نے جامع تحقیقی اور معلوماتی مضامین لکھے ہیں

جو ریاست پر تحقیقی کام کرنے والوں اور ریسرچ سکالروں کیلئے انمول خزینہ ہیں۔

اکیڈیمی کا اردو جریدہ ''شیرازہ'' اس کے قیام کے ساتھ ہی شائع ہونے لگا۔ پہلے یہ رسالہ سہ ماہی، دو ماہی اور پھر 1979 عیسوی سے ماہانہ شائع ہونے لگا۔ اس رسالے کی اشاعت سے ریاست کے نوجوانوں، ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی بھی ہونے لگی۔ اکادمی ہر سال خصوصی محفلیں منعقد کرتی ہے اور ان محفلوں میں ریاست کے فن کاروں کو اپنی تازہ تخلیقات پیش کرنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ اکیڈیمی کے رسالے ''شیرازہ'' نے اردو رسائل کی تاریخ میں اپنا ایک خاص اور منفرد معیار قائم کیا ہے۔ ریاستی شعر و ادب کے ساتھ یہاں کی ثقافتی اور عملی سرگرمیوں کی بھی دوسرے علاقوں تک پہنچانے کا کام ''شیرازہ'' سے لیا گیا۔

''ہمارا ادب'' کلچرل اکادمی کا دوسرا اہم رسالہ ہے۔ پہلے تو اس میں ''شیرازہ'' سے سال بھر کی منتخب تخلیقات اِکٹھا کر کے انہیں شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس رسالے میں تنقیدی اور تحقیقی مقالات بھی پیش کئے جاتے تھے۔ یہ رسالہ ضخیم کتابی صورت میں شائع ہوتا رہا۔ اس میں شائع شدہ مقالات سے ریاستی اکیڈیمی کی گراں قدر ادبی خدمات کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ 1975 عیسوی کے بعد اس سالانہ رسالے کے خاص نمبر بھی شائع کئے گئے، جن میں ''لوک ادب نمبر''، ''جموں و کشمیر نمبر...... 5 جلد''، ''شیرازہ انتخاب نمبر'' اور ''مشاہیر نمبر...... جلد 2'' شائع کئے گئے۔ مشاہیر نمبر میں ریاست کی اُن اہم شخصیات کا تعارف کرایا گیا جنہوں نے ریاستی فنونِ لطیفہ، مذہب، سیاست اور دوسرے شعبوں میں اہم کارنامے

سرانجام دئے تھے۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور ہمارا ادب کے "شخصیات نمبر...... جلد 5" اور "اولیاء نمبر" منظر عام پر آئے۔ جموں وکشمیر کے اولیائے کرام کی دینی اور علمی ودیگر خدمات کا احاطہ کرنے والے اس خصوصی نمبر کی چار جلدیں اب تک زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔

"شیرازہ" اور "ہمارا ادب" کے علاوہ "خبر نامہ اکادمی" بھی اکیڈیمی کی جانب سے شائع ہوا۔ یہ اپنی نوعیت کا منفرد نیوز لیٹر تھا۔ اس خبر نامے میں اکیڈیمی کی ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ریاست کی تہذیبی اور ادبی زندگی کے مختلف گوشوں کے بارے میں خبریں، مضامین اور معلومات شامل ہوتی رہیں۔ 1988 عیسوی کے بعد اس کی اشاعت روک دی گئی۔ نامساعد حالات کی وجہ سے ریاست کی تہذیبی اور تمدنی زندگی پر بھی بُرا اثر پڑا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ "شیرازہ" اور "ہمارا ادب" کے جتنے بھی شمارے نکلے وہ سب قابلِ تعریف ہیں۔

ان رسائل کے علاوہ بلند قامت ادیبوں اور شاعروں کی یاد کو تازہ کرنے کیلئے اکیڈیمی نے خصوصی اقدامات کئے۔ غالب صدر تقریبات کے دوران اکیڈیمی نے غالب کی غزلوں کے کشمیری ترجمے "شیرازہ" میں شائع کئے۔ اس کے علاوہ گیان چند جین کی کتاب "تفسیرِ غالب" اور "رقعات غالب" کے نام سے کتابیں شائع کی گئیں۔ ان کے علاوہ بھی کلچرل اکیڈیمی نے بہت سی کتابیں شائع کیں۔ ان میں ڈاکٹر اکبر حیدری کا "دیوانِ میر" اور "تذکرہ شاعرات اردو" بھی شامل ہیں۔ اکادمی کی اردو مطبوعات میں "اردو کشمیری فرہنگ" بھی شامل ہے جو بارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس فرہنگ

میں نوّے ہزار کے قریب الفاظ اور مرکبات شامل ہیں۔ اس فرہنگ کو مکمل کرنے میں پندرہ سال سے زیادہ کا وقت صرف ہوا اور ''کشمیر میں اردو'' تین جلدوں پر مشتمل وگراں قدر کارنامہ ہے جو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ اکیڈیمی نے بہت سے سمینار منعقد کئے۔ علامہ اقبال کے فن اور فلسفہ پر سرینگر اور جموں میں دو سمینار کئے گئے۔ اِن میں اردو کے مشہور شاعروں اور نقادوں نے شرکت کی، جن میں علی سردار جعفری، وحید اختر اور عبدالحق قابلِ ذکر ہیں۔ ان سمیناروں میں جو مقالات پڑھے گئے اُنہیں محفل اقبال کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ اقبال صدی تقریبات کے دوران علامہ اقبال کے کلام کا کشمیری زبان کے علاوہ ڈوگری، پنجابی اور ہندی میں بھی تراجم کئے گئے۔ ''شیرازہ'' (اردو) کے دو ضخیم اقبال نمبر شائع کئے گئے ہیں۔ پہلا رشید نازکی کی ادارت میں اور دوسرا محمد احمد اندرابی کی ادارت میں۔ اسی طرح دوسری زبانوں میں بھی شیرازہ کے اقبال نمبر شائع کئے گئے۔

منشی پریم چند کی صد سالہ برسی کے موقعے پر اکیڈیمی نے شیرازہ (اردو) کے علاوہ دیگر زبانوں میں شیرازہ کے مختلف ایڈیشنوں میں خصوصی شمارے شائع کئے۔ اس کے علاوہ منشی پریم چند کے افسانوں کے تراجم شائع کئے گئے۔

کلچرل اکیڈیمی کا اہم کارنامہ وہ سمینار اور اردو کانفرنس ہیں جن میں ریاستی شعراء، ادباء کے علاوہ اردو ادب کے نامور ادیبوں کو دعوت دی جاتی رہی۔ اب تک جن ادبی شخصیات کو بلایا گیا ہے اُن میں اختر الایمان۔ کرشن چندر، شمس الدین فاروقی، جوگندر پال اور عصمت چغتائی قابلِ ذکر ہیں۔

کلچرل اکیڈیمی ہر سال جموں میں یوم جمہوریہ کے موقع پر کُل ہند مشاعرے کا اہتمام کرتی ہے، جس میں ریاست کے شعراء کے علاوہ ریاست سے باہر کے نامور شعراء حضرات کو بھی بلایا جاتا ہے۔ شاعروں اور ادیبوں کی ان تقاریب کے علاوہ جو اہم کارنامہ اکیڈیمی نے انجام دیا وہ اکیڈیمی کو سلور جوبلی تقریبات کے سلسلے میں ایک تاریخی سمینار رہے، جس میں اکیڈیمی کی پچپن سالہ کارکردگی کا جائزہ لیا گیا۔ اس سمینار کا مقصد زبان اور ادب کے مسائل پر غور کرنا تھا۔

ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی اردو خدمات کے ساتھ اس کے سابق سیکریٹری محمد یوسف ٹینگ کا ذکر کرنا پہلی بات ہے۔ ٹینگ صاحب 1958 عیسوی سے لے کر 1993 عیسوی تک اکیڈیمی میں رہے۔ وہ پہلے ''شیرازہ'' اور ''ہمارا ادب'' کے مدیر تھے۔ پھر ڈپٹی سیکریٹری بنے اور پھر سیکریٹری۔ مگر اُنہوں نے شیرازہ اور ہمارا ادب سے اپنا ناطہ نہیں توڑا، بلکہ ان جرائد کے مدیران ڈاکٹر رشید نازکی اور محمد احمد اندرابی کے ساتھ بطورِ نگرو مدیرِ اعلیٰ اُنکی دیکھ بال کرتے رہے۔ ''خبرنامہ اکادمی'' اور دوسری مطبوعات کی اداراتی فرائض میں بھی اہم رول ادا کرتے رہے۔

اکیڈیمی کی اردو خدمات کے ایک اجمالی جائزے کے بعد اس حقیقت سے پردہ اُٹھانا بھی ضروری ہے کہ نامساعد حالات کی بنا پر اکیڈیمی کی اردو کے تئیں خدمات میں وہ خلوص اور جذبہ باقی نہیں رہا اور نہ وہ معیار قائم رہا جو ابتداء میں قابلِ تحسین نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

[1]: ''شیرازہ'' جموں و کشمیر میں اردو ادب کے پچاس سال، ص ۳۱۸۔ جموں و کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز سرینگر

اردو نے اگر چہ ہماری ریاست سے بہت دور جنم پایا لیکن یہاں کے لوگوں نے اپنے خون جگر سے اس کی آبیاری کی اور اپنے تخلیقی ذہن کی تمام توانائیوں کے ساتھ اس زبان اور اس کے ادب کی توسیع میں اہم رول ادا کیا۔ ہم نے اس زبان کو اپنی مادری زبان سے کم اہمیت نہیں دی۔ یہی وہ زبان ہے جس کو ہم نے ذریعہ اظہار بنایا، جس میں ہم نے پہلا اخبار نکالا، پہلا افسانہ تخلیق کیا، پہلی تنقید لکھی۔ یہ زبان سال ہا سال تک درباری زبان رہی ہے اور آج بھی اسے سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ آن بھی ہم اپنی تمام محبتوں کے ساتھ اسے گلے لگائے ہوئے ہیں۔ اگر چہ اس زبان میں تعداد کے اعتبار سے ہمارے کارنامے بہت قلیل ہیں۔ لیکن اردو ادب کے سلسلے میں جموں و کشمیر میں جو کام ہوا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ ہمارا دعویٰ بے بنیاد نہیں کہ اردو کی کوئی بھی ادبی تواریخ ہمارے کارناموں کا ذکر کئے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ ہم نے اپنی علاقائی زبانوں میں یعنی کشمیری، ڈوگری اور لداخی کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس زبان کی وسعت، پھیلاؤ اور ترقی کی راہیں نکالی ہیں کہ یہی زبان ہماری ریاست میں رابطے کی زبان ہے اور اس کی بدولت یہاں کے لوگ ریاست کی کلچرل اکائیوں کے ثقافتی رشتوں کو فروغ دے سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انفرادی کوشش کے علاوہ مختلف سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی کوشش قابلِ تعریف ہیں۔ چنانچہ 1947 عیسوی کے بعد کلچرل فرنٹ، آل سٹیٹ کلچرل کانفرنس۔ لٹریری فورم، انجمن ارباب ذوق، حلقہ علم و ادب، انجمن ترقی پسند مصنفین، بزمِ اردو ادب، بزمِ ادب کشتواڑ، انجمن ترقی اردو، انجمن فروغ اردو جموں خاص طور

پر قابلِ ذکر ہیں۔ دوسرے اداروں میں ریاستی کلچرل اکیڈیمی، ریڈیو کشمیر سرینگر و جموں، دوردرشن کیندر سرینگر، اقبال انسٹیچوٹ کشمیر اور جموں یونیورسٹی کے اردو شعبے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سب ادارے 1947 عیسوی کے بعد قائم ہوئے اور آج بھی بیشتر ادارے اردو ادب اور زبان کی خدمت گزارنے میں مصروف ہیں۔ ان اداروں میں سے ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی ادبی خدمات خصوصی طور پر اہم ہیں۔ اس ادارے نے اردو ادب کی ترویج اور توسیع میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ کلچرل اکیڈیمی کی کارکردگی کا دائرہ وسیع ہے۔ اس کے فرائض میں نہ صرف ریاست میں مروج مختلف زبانوں کی ترویج اور توسیع ہے بلکہ سنگیت، مصوری اور فنون لطیفہ کے دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ یہاں کی ثقافت کی توسیع کا کام بھی ہے۔ لہٰذا اس ادارے سے یہ توقع کرنا کہ یہ اپنا دائرہ عمل محض اردو کی توسیع اور ترقی تک محدود رکھے گی صحیح نہیں ہے۔ مگر پھر بھی اس ادارے نے اردو کو فروغ دینے کیلئے جو کام کیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ اکیڈیمی نے گذشتہ برسوں میں نہ صرف ازخود کافی کتابیں شائع کروائیں بلکہ ایسے مسودات بھی چھپ کر منظر عام پر آئے ہیں جو مالی دشواریوں کے باعث مصنفین کی عدم توجہی کے شکار ہو چکے ہیں۔

اکیڈیمی نے مالی امداد فراہم کر کے یہ دشواریاں کسی حد تک دور کر دیں اور بہت سے گراں قدر کارنامے سامنے آئے۔ اسی طرح دوسری کئی زبانوں کی تخلیقات کو اردو میں اور اردو تخلیقات کو دوسری زبانوں میں منتقل کر کے اردو کیلئے کام کر رہی ہے اور اس طرح پورے ملک کے اردو سے دلچسپی لینے والوں کا حلقہ بڑھ گیا ہے۔

اکیڈیمی اپنے ماہوار اور سالانہ جرائد کے ذریعے اردو کیلئے کام کر رہی ہے اور اس طرح پورے ملک کے اردو سے دلچسپی لینے والوں تک ہماری تخلیقات پہنچتی ہیں اور ملک کے ادیبوں، شاعروں اور دوسرے لکھنے والوں کی تحریروں سے فیض حاصل کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو کے سلسلے میں اکیڈیمی کی کارگزاری قابلِ ستائش ہے۔

مالی امداد:

ا) گذشتہ دس برسوں کے دوران اردو کے دوسو کے قریب مصنفین کو مالی امداد کے طور پر دولاکھ سے زائد کی رقم دی گئی ہے تاکہ وہ اپنی کتابیں شائع کرسکیں۔ اس طرح پچھلے 10 برسوں میں اردو میں درجنوں نئی اردو کتابوں کا اضافہ ہوا ہے۔

ب) گذشتہ برسوں میں اکیڈیمی نے دولاکھ سے زائد رقم مختلف کتابوں کی اشاعت کیلئے منظور کر لئے تھے۔ اس رقم سے اکیڈیمی کے اہتمام سے اردو میں پچاس سے زائد کتابیں شائع ہوچکی ہیں اور 12 جلدوں پر مشتمل اردو کشمیری فرہنگ مکمل ہوکر شائع ہوچکی ہیں۔

ج) اکیڈیمی ایسے مصنفین کی مالی امداد کرنے کے پروگرام پر عمل درآمد کرنے لگی ہے جو روزگار کے معیاری وسائل کی عدم موجودگی کے باعث آئے دن مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں۔ اس فہرست میں اردو کے کئی مصنفین بھی شامل ہیں جن کو اکیڈیمی 500 سو روپے ماہوار کا وظیفہ دیتی ہے۔ اکیڈیمی نے یقیناً ایک حوصلہ افزا کام کی شروعات کی ہے جس کیلئے یہ مبارکبادی کی مستحق ہے۔

اردو میں مطبوعات:

شیرازہ اور ہمارا ادب، اشاعت:

اردو شیرازہ اکیڈیمی کا ترجمان ہے اور گذشتہ تیس برس سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ رسالہ ابتداء میں سہ ماہی پرچے کے طور پر جاری کیا گیا تھا۔ ستمبر 1979 سے ماہانہ ہو گیا۔ اس رسالے میں ریاستی اور غیر ریاستی اردو ادیبوں کے اعلیٰ معیار کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں۔ اب تک اس رسالے کے 50 شمارے چھپ چکے ہیں۔ جن میں چند گراں قدر خاص نمبر بھی شامل ہیں۔ اس پرچے کے شائع ہونے سے مقامی ادیبوں اور فنکاروں کی کافی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اس رسالے میں اس کے علاوہ اردو دنیا کے بیشتر معروف اور معتبر ادیبوں، شاعروں اور ادب کے دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے اہل قلم کے مضامین اور تخلیقات شامل ہوتے ہیں۔ ''شیرازہ'' آج ملک کے چند اہم ادبی رسائل میں شامل ہوتا ہے اور اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اکیڈیمی کے اعداد و شمار کے مطابق ملک بھر میں اس پرچے کو 700 سے زائد اعزازی خریداروں کو مفت بھیجا جاتا ہے۔ عام شماروں کے علاوہ شیرازہ (اردو) کے کئی خاص نمبر شائع ہوتے ہیں۔ ان میں پریم چند نمبر، اقبال نمبر، افسانہ نمبر، حسن نمبر، فوق نمبر، صادق نمبر، اردو کانفرنس نمبر، للّ دید نمبر، ثقافت نمبر، زور نمبر، شیر کشمیر نمبر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ب) اکیڈیمی کا ''کاشُر اور ڈوگری ''شیرازہ'' میں اردو سے متعلق مضامین شائع ہوتے ہیں یا بعض اردو تخلیقات کا ترجمہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں پریم چند،

اقبالؔ، غالبؔ، اور دوسرے اردو شعراء کے بارے میں بعض معیاری مضامین اردو ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی مدد سے کشمیری اور ڈوگری کے قارئین کو بھی اردو ادبیات سے جانکاری ہوتی ہے۔

مطبوعات:

گذشتہ برسوں میں اکیڈیمی نے کئی بلند پایہ اور معیاری کتابیں شائع کرلی ہیں۔ یہ ایسی کتابیں ہیں جو اکیڈیمی خود شائع کرواتی ہے۔ ان میں اردو کشمیری فرہنگ بہت اہم ہے۔ دو جلدوں پر مشتمل یہ فرہنگ تقریباً 70 ہزار الفاظ کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اس میں الفاظ کے معنی، تلفظ ان کی اصل اور ماخذات شامل ہیں۔ اس لغت کو فرہنگ آصفہ، فیروز الغات، نور الغات، مہذب الغات کی بنیاد پر تیار کرلیا گیا ہے۔ یہ ضخیم فرہنگ ایک کارنامے سے کم نہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر گیان چند کی ''تفسیر غالبؔ'' غالبؔ کے غیر متداول کلام کی تفسیر پیش کرتی ہے اور نکات ''واقعات غالبؔ'' اکبر علی عرشہ زادہ نے اپنے حواشی اور مقدمے کے ساتھ ترتیب دی ہے، جس میں غالبؔ کے نادر واقعات اور تحریروں کو شامل کیا گیا ہے۔ دوسری اہم کتابوں میں پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کی تین جلدوں میں ''کشمیر میں اردو'' ڈوگری لوک گیت اور پہاڑی آرٹ (ترجمہ ٹھاکر پونچھی) ، انوار ابوالکلام (مرتبہ جواد زیدی) کشمیری زبان اور شاعری (عبدالاحد آزادؔ) ، کلیاتِ آزاد، (مرتبہ ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو)، محفل اقبال (مرتبہ رشید نازکی)، انتخاب اردو ادب (مرتبہ نور شاہ)، خیابان خیابان (مرتبہ روش صدیقی)، وطن کی پکار (مرتبہ محمد یوسف ٹینگ)

دیوان میر (مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری) شامل ہیں۔

ب) ترجمے: گذشتہ برسوں میں اکیڈیمی کے اہتمام سے اردو کی متعدد شخصیات کے کارناموں کو کشمیری اور ڈوگری میں منتقل کیا گیا ہے۔ پریم چند کی بعض کہانیاں، اقبال کا منظوم ترجمہ، پرتو اقبال، غالبؔ نمبر (کاشُر شیرازہ)، اقبالؔ نمبر (کاشُر شیرازہ)، غالبؔ نمبر (ڈوگری)، ادبیات کو بھی اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر للؔ دید اور شیخ العالمؒ کے کلام کو پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ نندلال کول طالبؔ اور پرفیسر جیالال کول کے للؔ دید کلام کا اردو منظوم ترجمہ ایک اچھا کام ہے۔اسی طرح جدید ڈوگری ادب کا ارتقا (ترجمہ ٹھاکر پونچھی)، پربت اور پنگھٹ (کشمیری اور ڈوگری) ادبیات کے کئی رنگوں سے متعارف کراتے ہیں۔

ادبی تنظیموں کو مالی امداد:

اکیڈیمی ہر سال مختلف ادبی انجمنوں کو مالی امداد سے نواز کر ان کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ ان میں اردو کی ادبی انجمنیں بھی شامل ہیں۔اس سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ یہ انجمنیں باقاعدہ طور پر اردو کی ترویج اور ترقی کیلئے سرگرم ہیں۔

ابھرتے ہوئے فنکاروں کی حوصلہ افزائی:

اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے نوجوان فنکاروں کی حوصلہ افزائی کیلئے ہر سال نوجوان فنکاروں کی ادبی نشستیں منعقد ہوتی ہیں۔ یہاں نوجوان فنکار افسانے، مقالات اور دوسری تخلیقات پڑھتے ہیں۔جن پر تعمیری تنقید ہوتی ہے۔اس طرح اکٹھا کئے ہوئے مواد سے ہر سال ''اردو شیرازہ'' کا نوجوان نمبر مرتب ہوتا ہے۔ یہ نشستیں

اُن نشستوں سے مختلف ہوتی ہیں جو دوسرے ادیبوں اور شاعروں کے اشتراک سے بزمِ مقالات، بزمِ شعر، محفل افسانہ یا محفل موسیقی کے طور پر ہر سال منعقد ہوتی ہیں۔ ان نشستوں میں اپنی تخلیقات پیش کرنے والوں کو باضابطہ معاوضہ ملتا ہے۔

ادیبوں کی محفلیں:

غیر ریاستی اردو ادیبوں کے اعزاز میں ہر سال اکیڈیمی کئی محفلوں کا اہتمام کرتی ہے۔ یہاں فن اور فنکار کے تعلق سے بات چیت ہوتی ہے۔ گذشتہ برسوں میں جو لوگ ان محفلوں کے خصوصی مہمان رہے ہیں ان میں جگر مراد آبادیؔ، فراق گورکھپوریؔ، مخدوم محی الدین، خلیل الرحمٰن اعظمی، آل احمد سرورؔ، اختر الایمان، جوگندر پال، سردار جعفری، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، شمس الدین فاروقی قابلِ ذکر ہیں۔

دوسری تقاریب:

اکیڈیمی نے ایک پروگرام کے تحت اردو کے برگزیدہ شاعروں اور ادیبوں کی برسیاں منائی ہیں۔ پریم چند اور حضرت اقبالؔ کی صد سالہ برسیاں اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ اکیڈیمی کے اہتمام سے ریاست میں ان بزرگوں کے شایانِ شان محفلیں منعقد ہوئیں اور سیمیناروں کا اہتمام کیا گیا۔

اردو ڈرامہ:

اکیڈیمی کی طرف سے اردو کو موثر ڈھنگ سے مقبول بنانے کیلئے ڈرامے کے وسیلے سے بھی مستحسن کوششیں کی گئی ہیں۔ چنانچہ گذشتہ برسوں میں اکیڈیمی کے

زیرِ اہتمام کئی معیاری ڈرامے ہندوستان کے مختلف شہروں میں پیش ہوئے، ان میں زبیر رضوی کا ''پیا باج پیالہ''، علی محمد لون کا ''جھیل بلا رہی ہے''، اور ''ہمالیہ کے چشمے'' قابلِ ذکر ہیں۔

انعامات اور خلعت فاخرہ:

ا) اکیڈیمی ہر سال ریاست میں چھپنے والی بہترین اردو کتابوں پر دو (2) انعامات دیتی ہے۔

ب) ریاست کے بزرگ شاعروں اور ادیبوں کی ادبی خدمات کے پیش نظر انہیں خلعت فاخرہ سے نوازنے کا سلسلہ بھی اکیڈیمی نے شروع کیا ہے۔ چنانچہ اب تک رسا جاودانی مرحوم، میر غلام رسول نازکی، شہ زور کاشمیری اور کرشن سیمپوری کو ان کی اردو ادبی خدمات کے پیش نظر خلعت دیئے جا چکے ہیں۔

دوسرے اقدامات:

اردو خطاطی کے فن کو ترویج دینے کیلئے اکیڈیمی کا شعبہ خوشنویسی اہم خدمات انجام دے رہا ہے اور اس فن کو زندہ رکھنے کیلئے قابلِ ستائش کوششیں ہو رہی ہیں۔ اس تین سالہ تربیتی کورس میں خوشنویسی کا فن سکھایا جاتا ہے۔ اس شعبے نے کئی اچھے خوشنوس پیدا کئے ہیں جو مختلف اخبارں اور اداروں کے ساتھ منسلک ہو گئے ہیں۔ اس طرح سے نہ صرف ایک بڑی کمی دور ہو رہی ہے بلکہ ایسے لوگوں کے روزگار کا مسئلہ بھی حل ہو گیا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ خطاطی کے شعبے میں تربیت پانے والوں کو اکیڈیمی ماہوار وظیفہ دیتی ہے۔

ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی کارکردگیوں کے اس مختصر جائیزے کے بعد اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس ادارے نے اس ریاست میں حتی المقدور جو کام اردو کی بقا اور توسیع کیلئے کیا ہے وہ کافی اہم ہے کچھ کوتاہیاں ہیں جن پر نظر رکھنے اور جن کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس طرح سے اکیڈیمی کی سرگرمیاں زیادہ فعال ثابت ہوسکتی ہے۔

درج ذیل تجاویز پر غور کرنا لازمی ہے۔

ا) ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں کو ڈھنگ سے اطلاعات فراہم کرنے کیلئے خبر نامہ شائع کرنا لازمی ہے، ویسے تو اکیڈیمی کے نام سے پہلے بھی خبر نامہ شائع ہوتا تھا، لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر بند کیا گیا۔ مگر اب اکیڈیمی میں ادبی سرگرمیاں بڑی تیزی سے چل رہی ہیں۔

۲) اکیڈیمی کی اردو مطبوعات سے سلسلے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکیڈیمی نے ان کتابوں پر زر کثیر خرچ کیا ہے، خصوصیت کے ساتھ "ہمارا ادب" کے بعض نمبر دستاویزی اہمیت کے حامل ہیں اور ریاست کی ثقافتی، سیاسی اور سماجی زندگی پر سے بہت سے پردے سرکاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ادب، فن، ثقافت، سیاسی اور سماجی زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر مستقل کتابیں لکھوائی جائیں۔

۳) ترجمہ کاری کے سلسلے میں اکیڈیمی نے بہت کام کیا ہے، لیکن ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ریاست کی رتینوں اکائیوں میں بھرپور ہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے اردو میں ایسا ادب اور ایسا مواد ترجمہ کروائے جو یہاں کی مختلف زبانوں کے

ذخائیر میں موجود ہے۔

۴) اردو میں ایسی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے جن کا تعلق سماجی علوم، سائنس، فلسفے اور دوسرے علوم سے ہو تا کہ ایسے علوم کے بارے میں اردو کے قارئین کو کما حقہ واقفیت ہو۔

۵) مغربی اور مشرقی ادبیات کے منتخب کارناموں کو اردو میں منتقل کیا جائے۔

۶) اردو کے نمائندہ کارناموں کو یہاں کی علاقائی زبانوں میں منتقل کیا جائے۔

۷) اردو میں ایک ایسا انسائیکلو پیڈیا ترتیب دیا جائے جس میں ادبی اصطلاحات کی وضاحت ہو۔

۸) ریاست کے لکھنے والوں کی کتابوں کی اشاعت کیلئے جو رقم مخصوص ہوتی ہے اس میں موجودہ گراں بازاری کے پیشِ نظر اضافہ کیا جائے تا کہ زیادہ آسانی سے کتابوں کی اشاعت ممکن العمل ہو۔

یہ حقیقت ہے کہ ریاست میں اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کیلئے ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے جو رول ادا کیا ہے اُسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ریاست میں اردو کی مخصوص پوزیشن، مرتبے اور تشخص کو متعین کرنے میں اکیڈیمی کی کارکردگی قابلِ ستائش ہے۔

5 رجنوری 2009 عیسوی کو بھی اردو اکادمی کی سالانہ کارکردگی کا جائیزہ لیا گیا اور مستقبل کے حوالے سے کئی تجاویز پر تبادلہ خیال ہوا۔ یہ اجلاس صدر نور شاہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سال 2008 عیسوی کے دوران شائع شدہ اردو کتب کے

مصنفین اور میٹرک کے سالانہ امتحان میں اردو مضمون میں پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کی حوصلہ افزائی کے پروگرام پر بھی بحث ہوئی۔

سون ادب 2008 عیسوی ایک جائزہ:

جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی کے حالیہ مطبوعات میں سے ''سون ادب 2008 عیسوی'' کی رسمِ رونمائی ہوئی جو کہ ظفر مظفرؔ کی ادارت میں شائع ہوا ہے۔ اس نمبر کو منظر عام پر پیش کرنے میں مدیر موصوف نے بڑی جانفشانی اور لگن کے ساتھ جاذب نظر بنایا ہے۔ 240 صفحات پر اس میں مختلف قلم کاروں نے اپنے جوہر خوب دکھائے ہیں اور بہت سے معلوماتی مضامین تحریر کر کے عام وخاص لوگوں کو خوب محظوظ کیا ہے۔ ''کأشر زبان تہٕ سون تعلیمی نظام'' کا مضمون لکھتے ہوئے ڈاکٹر عزیز حاجنیؔ نے اس بات کا دُکھ اظہار کیا ہے کہ کشمیری زبان کو خود کشمیریوں نے ہی بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ حتیٰ کہ زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے کشمیریوں نے اس زبان سے قطع تعلق کر کے اپنے بچوں کو انگریزی اور اردو زبانوں کی طرف مائل کیا، یا یوں کہئے کہ کشمیری میں بات کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اب یہ زبان صرف دیہاتوں، اپاہجوں، نادار یا اسی قسم کے لوگوں کی زبان رہ گئی ہے۔

ماہنامہ ''شیرازہ جموں، کشمیر، لداخ''
قدیم تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں:

''شیرازہ کا یہ خصوصی شمارہ ایک اہم دستاویز کی حیثیت میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ اس موضوع پر دستیاب مختلف تذکرے، سفرنامے عام قاری کی دسترس سے

دور ہیں۔ کئی ایک ایسے ہیں جواب نایاب ہیں۔ اکیڈیمی نے ان دستاویزات کے مطالعے پر مبنی مضامین کا یہ مجموعہ شائع کرا کے ایک قابلِ ستائش کارنامہ انجام دیا ہے۔ مضامین لکھنے والوں میں کشمیر، جموں اور لداخ کی تاریخ، تہذیب، تمدن، ادب، اور ثقافت سے جڑی کئی نامور شخصیات ہیں اور اُن کی بدولت یہ مجموعہ اور زیادہ معتبر اور مستند ہو گیا ہے۔ مجموعے میں شیرازہ کے مدیر محمد اشرف ٹاک کا تحریر کردہ ''حرف آغاز'' مجموعے کے بارے میں مفصل اور مدلّل تعارف کی حیثیت رکھتا ہے۔

''شیرازہ'' کے خصوصی شمارے کا آخری مضمون جناب عبدالغنی شیخ کا تحریر کردہ ''لداخ...... غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں'' ہے۔ شیخ صاحب نے بڑی تفصیل سے دنیا کے بہت سارے ممالک سے لداخ وارد ہوئے سیاحوں کے سفرناموں کا تذکرہ کیا ہے۔ لداخ کے موضوع پر اتنا تفصیلی کام شاید اس سے پہلے اس پیمانے پر نہیں کیا گیا۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ مقالہ ایک سو دس صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور درجنوں کتابوں اور دیگر تصانیف کا حوالہ مقالہ میں موجود ہے۔

کشمیر اور کشمیریات کے طالب علموں کیلئے ''شیرازہ'' کا یہ خصوصی شمارہ واقعی بہت کار آمد ثابت ہوگا۔ صدیوں کا احاطہ کرتے ہوئے سفرناموں اور تذکروں سے پردے ہٹانا اور ان میں موجود معلومات، مشاہدات اور تجربات کو نظروں کے سامنے لانا واقعی ایک بڑا کارنامہ ہے۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ کشمیر کے موضوع پر صرف اتنا ہی نہیں لکھا گیا، کئی اور سفرنامے اور تذکرے بھی ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے اس شمارے میں شامل نہیں ہو پائے ہیں۔ لیکن جتنا شامل ہوا ہے وہ بھی سمندر کو کوزے میں

بھرنے کے مترادف ہے۔

جموں وکشمیر کے اردو مصنفین:

یہ حقیقت ہے کہ جان محمد آزاد نے یہ کتاب لکھ کر معیاری نثر کی اینٹوں سے ایک پرشکوہ عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب لگ بھگ ایک سو سال کی ذہنی تاریخ ہے۔ یہ ایک پورے عہد کی تخلیقی سرگرمیوں کا جائیزہ ہے۔ اکیڈیمی نے ''جموں وکشمیر کے اردو مصنفین'' کتاب شائع کر کے ایک بڑا کام انجام دیا ہے۔

''شیرازہ'' جموں وکشمیر میں اردو ادب کے پچاس سال:

جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کے حوالے سے اُس کام کا جائیزہ لینے کی کوشش کی ہے جو گذشتہ پانچ دہائیوں کے دوران ریاست کے اردو ادیبوں، شاعروں، محققوں اور نقادوں نے اس کی ترقی اور ترویج کے سلسلے میں انجام دیا ہے۔ نصف صدی میں تخلیق کیئے گئے ادب کا احاطہ کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ اکیڈیمی اس سلسلے میں کامیاب ہے۔

گذشتہ پچاس برسوں میں اکیڈیمی کی طرف سے اردو میں کل ہند مشاعرے، کانفرنس، سمینار، محفل مقالات، ادبی نشستیں اور اردو کے حوالے سے کئی تقاریب منعقد ہوگئیں۔ اس پورے سفر کی روئیداد تصویروں کی زبانی ''شیرازہ'' اور اکیڈیمی کی دیگر مطبوعات میں پیش کی جاچکی ہے۔

مختلف زبانوں میں اکیڈیمی کی تازہ ترین مطبوعات 2013 عیسوی:

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز کے اردو گوجری، پہاڑی

اور دیگر شعبوں کی طرف سے مختلف مطبوعات منظر عام پر آگئیں ہیں۔ اردو میں شجاع سلطان (مرحوم) کا شعری مجموعہ "خواب زار" ، "ہمارا ادب" کا سعادت حسن منٹو نمبر، "شیرازہ" اردو کا ہم عصر نمبر، ٹیگور نمبر اور گولڈن جوبلی نمبر، پہاڑی شیرازہ کا "اوڑی نمبر" مولانا رومی نمبر، مثنوی مولانا روم کا ترجمہ، کلیات شمس الدین سیاں محمد نمبر، The Gujars میاں محمد بخش، گوجر اور گوجری وغیرہ شامل ہیں۔

اردو کانفرس۔ جموں و کشمیر اکیڈیمی برائے فن، تمدن ولسانیات

24-25 مارچ 2014 عیسوی:

جموں و کشمیر اکیڈیمی برائے فن، تمدن ولسانیات کی جانب سے منعقد دوروزہ اردو کانفرنس 25 مارچ 2014 عیسوی کو اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ اس کانفرنس کے دوران 6 ریسرچ پیپرس پیش کئے گئے۔ ریاست جموں و کشمیر میں اردو کی ترویج و بقا کیلئے قد آور ادیبوں نے حصہ لیا۔ ڈاکٹر ایاز رسول نازکی، پروفیسر اسد اللہ وانی، ڈاکٹر نذیر آزاد جیسے قلم کاروں نے "کشمیر کے اردو شعرا"، "جموں کے اردو شعرا"، جموں و کشمیر میں اردو غزل کو درپیش چلینجوں کے متعلق رسرچ پیپرس پڑھے۔ ڈاکٹر پریمی رومانی اور ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے جموں و کشمیر میں اردو نظم اور 1947 عیسوی کے بعد "جموں و کشمیر میں اردو شاعری" پر بالترتیب پیپرس پیش کئے۔ محکمہ اطلاعات کی طرف سے اسی روز سرینگر میں محفل مشاعرہ منعقد ہوا۔ محفل مشاعرہ میں ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ریڈیو کشمیر سرینگر، بشیر عارفؔ، جوائنٹ ڈائریکٹر انفارمیشن شفیق اقبال بھی موجود تھے۔

کلچرل اکیڈمی کے اہتمام سے ''جموں وکشمیر میں اردو نثر'' کے موضوع پر سمینار 17/ اپریل 2014 عیسوی:

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز کے زیرِ اہتمام 17 اپریل 2014 عیسوی کو اکیڈیمی کے ، ایل ہنگل ہال میں ''جموں وکشمیر میں اردو نثر'' کے موضوع پر ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں ریاست میں اردو نثر کی تاریخ، موجودہ صورت حال اور اس کے حوالے سے مسائل اور امکانات پر مقالے پیش کئے گئے اور بحث و مباحثہ ہوا۔ سمینار کی پہلی نشست کی صدارت پدم شری پروفیسر نیلامبر دیو شرما نے کی جب کہ ایوان صدارت میں شعبہ اردو جموں یونیورسٹی کے سابق سربراہ پروفیسر ظہور الدین اور سیکریٹری اکیڈیمی خالد بشیر احمد بھی موجود تھے۔ اپنے خطبۂ استقبالیہ میں خالد بشیر احمد نے کہا کہ اکیڈیمی ''جموں وکشمیر میں اردو نثر'' کے عنوان سے سمینار کا انعقاد کرنے کا شرف حاصل کیا۔ اُنہوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ یہ سرزمین صدیوں سے اردو کا گہوارہ رہی ہے اور یہ ایسے نامور ادیبوں کی آماجگاہ رہی ہے جنہوں نے اردو زبان اور اس کے ادبی سرمائے کو کئی لحاظ سے مالا مال کیا۔ اردو کی مقبولیت اور اس کی اثر آفرینی نے آج سے قریب ڈیڑھ سو سال قبل اس وقت کے حکمرانوں کو یہ حوصلہ بخشا کہ اُنہوں نے باضابطہ طور سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ یہ وہ دور تھا جب اردو یہاں کی روزمرہ زندگی میں بالکل رچی بسی تھی۔

کانفرنس کا کلیدی خطبہ پروفیسر ظہور الدین نے پیش کیا۔ انہوں نے ریاست میں اردو نثر کے حوالے سے کہا کہ تاریخ، تہذیب اور تمدن میں اہم کردار ادا

کیا ہے۔ یہ زبان ریاست کے تینوں خطوں کے رابطے کی زبان ہے جبکہ اس زبان نے یہاں کی تہذیب اور تاریخ کو بھی محفوظ کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

پہلا مقالہ ڈاکٹر پریمی رومانی نے ''جموں وکشمیر میں اردو ڈرامہ'' کے عنوان سے پیش کیا۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے ''جموں وکشمیر میں اردو تحقیق'' کے موضوع پر پیش کیا۔ اس سمینار میں سرکردہ کہانی کار شیام سندر نے اور آنند لہر نے دوسرے سیشن کی صدارت انجام دی۔ ایوانِ صدارت میں نورشاہ ، پروفیسر ظہور الدین اور خالد حسین موجود تھے۔ اس سیشن میں ڈاکٹر نذیر آزاد نے ''جموں وکشمیر میں اردو تنقید'' نورشاہ نے ''جموں وکشمیر میں اردو افسانوی ادب'' ڈاکٹر شفق سوپوری نے ''جموں وکشمیر میں غیر افسانوی ادب'' پر اپنے مقالات پیش کئے۔ شیام سندر آنند لہر نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ سمینار کے انعقاد سے ریاست میں اردو نثر کا ایک خاکہ سامنے آیا ہے جس سے مستقبل میں نئے خاکے سامنے آئیں گے۔

کشمیری لال ذاکر کے اعزاز میں اکیڈیمی کی تقریب

16/اپریل 2014 عیسوی:

کشمیری لال ذاکر نے اپنے تاثرات میں جموں وکشمیر کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار بڑے جذباتی انداز میں کیا اور کہا کہ اُس کی کہانیوں ، ناولوں اور شاعری میں وادیٔ کشمیر کی سرزمین کی خوشبو رچی بسی ہے۔ اکیڈیمی کے صدر خالد بشیر احمد نے

کہا کہ اکیڈیمی کیلئے یہ اعزاز ہے کہ وہ کشمیری لال ذاکر کے ساتھ ملاقات کا اہتمام کررہی ہے۔ انہوں نے اُن کی تحریر کردہ 132 کتابوں کے بارے میں اپنے تاثرات بھی پیش کئے۔ تقریب کی صدارت محمد یوسف ٹینگ، مہمان خصوصی وید بھسین اور عرش صہبائی نے اپنی تقریروں میں اردو زبان و ادب میں کشمیری لال ذاکر کے کنٹری بیوشن کا ذکر کیا۔ پروگرام کی نظامت پر فیسر قدوس جاوید نے انجام دی۔

ڈل جھیل کے مقام پر مزاحیہ مشاعرے اور موسیقی کا اہتمام 23ر ستمبر 2015 عیسوی:

ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے مشہور ڈل جھیل کے مقام پر ایک خصوصی مزاحیہ مشاعرے اور موسیقی کے پروگرام کا اہتمام کیا۔ اپنے وجود میں آنے کے بعد پہلی مرتبہ ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے اس طرح کے مشاعرے کا انعقاد کیا۔ جس میں وادی کے کئی نامور مزاحیہ شعرا نے شمولیت کی۔

کلچرل اکیڈیمی اور جے کے بنک کی مشترکہ ثقافتی محفل ٹیگور ہال میں رنگا رنگ پروگرام کا انعقاد 13 دسمبر 2015 عیسوی:

ریاستی تہذیب و ثقافت کی ترویج اور اس کی بہتر عکاسی کی غرض سے ریاستی کلچرل اکیڈیمی اور جموں و کشمیر بنک نے مشترکہ طور سے ٹیگور ہال سرینگر میں ہفت روزہ رنگارنگ ثقافتی محفلوں کا انعقاد کیا۔ "Art for all" پروگرام سیریز پر بات کرتے ہوئے ریاستی کلچرل اکیڈیمی کے سیکریٹری ڈاکٹر عزیز حاجنی نے بتایا کہ اس سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر ''باغ بہو'' جموں میں بھی بادام واری طرز پر شام

موسیقی کا ہفت روزہ اہتمام کیا جائے گا۔

کلچرل اکیڈیمی کی طرف سے رمضان سپیشل کے سلسلے میں اردو زبان میں نعتیہ مشاعرے کا انعقاد 1/ جون 2017 عیسوی:

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچرل اینڈ لنگویجز کی طرف سے منعقدہ رمضان سپیشل کے سلسلے میں اکیڈیمی کے سمینار ہال میں اردو زبان میں حمدیہ/نعتیہ مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت کہنہ مشق شاعر سلطان الحق شہیدی نے کی۔ اس موقعے پر سیکریٹری اکیڈیمی ڈاکٹر عزیز حاجنی نے اپنے استقبالیہ خطبے میں کہا کہ اکیڈیمی نے رمضان المبارک کے مہینے کی مناسبت سے رمضان سپیشل ترتیب دیا ہے۔ جس کے مطابق مختلف زبانوں جیسے کشمیری، اردو، پہاڑی اور گوجری میں حمدیہ/نعتیہ محفلوں کا انعقاد کیا جائے گا۔

سوچھتا ہی سیوا کے سلسلے میں اردو مشاعرہ: 18/ ستمبر 2017 عیسوی:

(زبان، ادب اور ثقافت کے تحفظ اور آبیاری پر زور):

جموں وکشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز کرگل کی جانب سے ضلع کے مرکزی آڈیٹوریم میں قومی سطح ''سوچھتا ہی سیوا'' صفائی مہم کے سلسلے میں ایک ضلع سطح کا اردو مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر محمد صادق ہرداسی کی تصنیف کردہ کتاب بلتی شاعری ایک مختصر تاریخ اور جگمید نور پوخیال لداخی کا تازہ شعری مجموعہ ''آزاد خیال'' کی رسم رونمائی بھی انجام دی گئی۔ لداخ خودمختار پہاڑی ترقیاتی کونسل کرگل کے

چیرمین نے موجودہ دور میں زبان، ادب اور ثقافت کے تحفظ اور آبیاری کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے اس سلسلے میں کلچرل اکیڈیمی کی جانب سے چلائے جارہے ادبی ثقافتی پروگراموں کے انعقاد پر اطمینان کا اظہار کیا۔

میرے خیال میں اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کیلئے ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے جو رول ادا کیا ہے اُسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ریاست میں اردو کی مخصوص پوزیشن، مرتبے اور تشخص کو متعین کرنے میں ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی کارکردگی قابل ستائش ہے۔

جموں وکشمیر میں اُردو افسانہ

(1932 عیسوی ......تا حال)

جہاں تک اردو میں مختصر افسانے کا تعلق ہے۔ یہ بیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ بیسویں صدی میں ہم کو جو ابتدائی افسانہ نگار ملتے ہیں۔ ان میں دو نام نمایاں طور پر نظر آتے ہیں ایک سجاد حیدر یلدرم کا، دوسرا پریم چند کا۔ دونوں کی افسانہ نویسی کی ابتدا کم و بیش ایک ہی زمانے سے ہوتی ہے۔ پریم چند کا جو پہلا افسانہ ملا ہے وہ 1905 عیسوی کا لکھا ہوا ملا ہے۔ جس کا عنوان ہے "دنیا کا سب سے انمول رتن" اور انہوں نے اس افسانے کو اپنی بعد کی تحریروں میں خود بھی اپنا پہلا افسانہ قرار دیا ہے۔ جن لوگوں نے افسانوں پر کام کیا ہے یا کر رہے ہیں ان کو بھی غالباً اس سے پہلے کوئی ایسا افسانہ نہیں ملا ہے جس کو باقاعدہ افسانہ کہہ سکیں۔ اس طرح ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم 1905 عیسوی سے اس کی باقاعدہ تاریخ شروع کر سکتے ہیں۔

ناول کی طرح افسانہ بھی اردو میں مغربی بلکہ یوں کہیے کہ انگریزی کے اثر سے آیا۔ انگریزی کے علاوہ اور زبانوں بالخصوص روسی اور فرانسیسی افسانوں نے بھی اردو کے افسانہ نگاروں کو متاثر کیا۔ مختصر یہ کہ افسانے بھی انگریزی ترجموں کے وسیلے سے اردو میں آئے۔

ریاست جموں و کشمیر میں اردو افسانہ:

پہلا دور (1932 عیسوی تا 1947 عیسوی):

وادیٔ کشمیر میں اردو افسانے کی طرف سے پہلے مورخ، ادیب، شاعر اور صحافی منشی محمد دین فوقؔ نے توجہ دلائی۔ اُنہوں نے پہلا اخبار جس کا نام ''پنج فولاد'' تھا، 1901 عیسوی میں لاہور سے شائع کیا۔ یہ اخبار 1906 عیسوی تک جاری رہا۔ فوقؔ نے زندگی کا بیشتر حصہ پنجاب میں گذارا لیکن اُن کی کشمیر سے والہانہ عقیدت و جذبات کے بارے میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ فوقؔ نے روش زمانہ کے مطابق کئی تاریخی اور نیم تاریخی قصے قلم بند کئے، جنہیں ہم وادی کشمیر میں اردو افسانہ کے اولین نقوش کہہ سکتے ہیں۔ اُن کے بعد چراغ حسن حسرت کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اُنہوں نے تاریخ، شاعری، افسانہ ہر صنف پر طبع آزمائی کی بھرپور کوشش کی ہے۔

اُن کے افسانوں کا مجموعہ ''کیلے کا چھلکا'' جو 1927 عیسوی میں لاہور میں شائع ہوا[1]۔ تاہم وادی کشمیر میں اُردو کا رواج پریم ناتھ پردیسی سے ہی شروع ہوتا ہے۔[1]

پریم ناتھ پردیسیؔ:

کرشن چندر کے علاوہ وادی کشمیر میں پہلے دور کے افسانہ نگاروں میں سب سے پہلا نام پریم ناتھ پردیسی مرحوم کا لیا جاتا ہے۔ اُن کی ادبی زندگی کا سفر اُس وقت شروع ہوتا ہے جب ریاستی عوام مطلق العانی کے آہنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانوں میں دُکھ درد، حاکموں کی لوٹ کھسوٹ، افلاس و

---

[1] جلوہ صد رنگ۔ برج پریمی صفحہ ۱۷۱، اشاعت: ۱۹۸۵، دیپ پبلی کیشنز آزاد بستی نٹی پورہ، سرینگر،

بے چارگی، غلامی، جہالت، سماجی نابرابری، طبقائی کشمکش، بھوک، پریشانی جیسے سماجی وسیاسی اورادبی موضوعات پائے جاتے ہیں۔

بیسوی صدی کے آغاز میں پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم نے افسانے کا پہلا چراغ روشن کیا۔ نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کی دھوم مچی تھی۔ ملکی سیاست کے شعور اور مغربی ادب کے مطالعے نے اس صنف میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کی اور اُردو کا مختصر افسانہ معاصر زندگی کے سیاسی، سماجی اور نفسیاتی پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے ترقی کے منازل طے کرنے لگا۔ پریم ناتھ پردیسی ابتداء سے ہی ادب برائے ادب کے نقیب تھے۔ مگر پریم چند کی کہانی ''کفن'' اور 1935 عیسوی میں دس افسانوں کا مجموعہ ''انگارے'' شائع ہوا اور 1936 عیسوی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا تو پریم ناتھ پردیسی نے اس بات کو محسوس کیا کہ ادب برائے ادب کا نظریہ زندگی کے حقائق کو سمجھنے کی کسوٹی پر پورا نہیں اُترتا۔ اسی لئے اُنہوں نے رجعت پسندی، رومانیت، داخلیت اور تصور پرستی کو ترک کر کے ادب کے خارجی اور افادی پہلوؤں پر کافی توجہ دی۔ اس زمانے میں یہاں وادی کشمیر میں ڈوگرہ شاہی کے جبر و استبداد کے خلاف تحریک آزادی کا آغاز ہو چکا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ کی قیادت ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی تھی۔ پردیسی جیسا حساس فنکار ان تمام باتوں سے دامن نہ بچا سکا۔ چنانچہ ابتدائی دور کی کہانیوں مثلاً راجو کی ڈولی، پارسل، ماں کیا پیار، جے کارا، حسین پیامبر، سندھیا کا شراب اور شام وسحر (اولین مجموعہ) کی کئی کہانیوں کی طرح جن میں زندگی کی مہک سے خالی رومان اور

جذبات سے بھرے ہوئے انداز کو اپناتے ہیں آہستہ آہستہ کم ہو جاتے ہیں اور اُن کے بجائے وہ سیدھے سادھے انداز کو اپناتے ہیں۔ اس طرح آخری سانس تک صحیح معنوں میں ''کشمیر اور کشمیریت'' کو اپنے اصلی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے مطالعے کو وسیع تر کر لیا اور مغربی اور اشتراکی فنکاروں، خصوصی طور پر گورکی اور چیخوف کا مطالعہ کیا۔ جس سے ان کے ذہن کے دریچے کھُل گئے، ''میں اور میرے افسانے'' میں خود اعتراف کرتے ہیں:

''جب ترقی پسند مصنفین کی پہلی کتاب ''انگارے'' شائع ہوئی تو مجھے شدت سے اس امر کا احساس ہوا کہ جو کچھ آج تک میں نے لکھا ہے سب بے کار ہے، کیونکہ اس میں رومان کے سوا کچھ نہ تھا'' [1]

پردیسی نے ایک باشعور فنکار ہونے کا ثبوت فراہم کر کے ان تمام حالات کو اپنی شخصیت کا حصہ بنا لیا اور اپنے قلم کی جولانیوں سے نئے پیکر تراش لئے۔ اُنہوں نے موضوع کی ہمہ گیری کے ساتھ فن کے اعلیٰ نمونے خلق کئے اور اس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دئے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

''1932 عیسوی سے لیکر 1936 عیسوی تک میں نے جو کچھ لکھا ہے اس پر فخر نہیں کر سکتا، اُس وقت مجھے احساس ہی نہیں تھا کہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے مجھ پر اپنے وطن عزیز کے کیا فرائض ہیں، اُس وطن کے جس کے چالیس لاکھ باشندے پونے چار سو سال

---

[1] ماخذاز ''کشمیر کے مضامین'' ڈاکٹر برج پریمی، صفحہ ۸۸ سالِ اشاعت ۱۹۹۰ عیسوی۔

سے غلام در غلام چلے آرہے ہیں، جس کی جڑیں افلاس اور لوٹ کھسوٹ سے کھوکھلی ہو چکی ہیں''۔ [1]

پریم ناتھ پردیسی کے خط سے اس حقیقت کی غمازی ہوتی ہے کہ اُن کو ادب کے بارے میں کیا نظریہ تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ وادی کشمیر میں اردو افسانہ نگاری کی ابتدا حقیقت میں 1931 عیسوی اور 1932 عیسوی کے آس پاس ہوتی ہے اور پردیسی جموں و کشمیر میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈالنے والوں میں سے شمار ہوتا ہے۔ اُنہوں نے اس وقت ملک کے سیاسی، سماجی اور ادبی سطح پر بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیا۔ اپنے افسانوں کو رومانی اور داخلی حصار سے نکال کر زندگی کے افادی اور خارجی پہلوؤں سے روشناس کرایا۔ اُن کے بعد کے افسانوں میں زندگی کی تلخیوں اور تابناکیوں کا سنگیت ساتھ ساتھ ملتا ہے۔ نرگ، شام وسحر، کیچڑ کے دیوتا اور بہتے چراغ اسی قبیل کے افسانے ہیں۔

افسانوی مجموعہ ''دنیا ہماری'' میں جو افسانے درج ہیں، اُن کے بارے میں راجندر سنگھ بیدی نے کہا کہ یہ افسانے اپنی سادگی اور معصومیت کی بنا پر ٹالسٹائی کی یاد دلاتے ہیں۔ ان میں مشاہدے اور مطالعے کا خلوص ملتا ہے۔ ان کہانیوں میں نہ صرف نفسِ انسانی کی بنیادی کیفیات کی نقاب کشائی کی گئی ہے بلکہ تفسیر کے ساتھ تنقید کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ اُن میں کوئی جوش، کوئی غصہ، کوئی تلملاہٹ، نظر نہیں آتی جو ترقی پسند مصنفین کے یہاں ابتدا میں نظر آتی ہے۔ حالانکہ یہ کہانیاں اسی زمانے کی

---

[1] ہمارا ادب ص، ۱۵، سن اشاعت ۱۹۶۰، کلچرل اکیڈیمی سرینگر۔

پیداوار ہیں، لیکن ان کی تہہ میں ایک تند و تیز طوفان کے آثار واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ دنیا ہماری، سکھ کی واپسی، کاریگر، لباس تلے اچھی کہانیاں ہیں۔ ان میں انسانی ہمدردی کا جذبہ موجود ہے۔

اس ذیل میں راجندر سنگھ بیدؔی، پریم ناتھ پردیسؔی کے افسانوی مجموعہ ''دنیا ہماری'' کے پیش لفظ میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح پیش کرتے ہیں:

''پردیسؔی نے کہانیاں بہت سوچ بچار کے عالم میں لکھی ہیں، لیکن ان کہانیوں کی پرسکون سطح کے نیچے ہم ایک ایسا دل دیکھتے ہیں جو انسانیت کے دُکھ سے تار تار ہے، اس کی ہموار آواز کبھی کبھی تقدیر کی آواز کی طرح فیصلہ کُن نظر آتی ہے''۔ [1]

پریم ناتھ پردیسؔی نے یہاں کے حسین جھرنوں سدا بہار جنگلوں اور برفیلے پہاڑوں کا ذکر بھی بہت کم کیا ہے۔ اس کے برعکس انہوں نے یہاں کے تپتے جہنم کدوں کی تصویرکشی کی ہے، بھوک کو بہلاتے ہوئے کاریگروں کا ذکر ملتا ہے۔ اُن کے نزدیک کشمیر کا سب سے بڑا مسئلہ غلامی اور افلاس ہے جس کی طرف کسی نے توجہ نہ کی تھی۔ انہیں اپنے معاصرین اردو بیشتر غیر ملکی کشمیری افسانہ نگاروں سے شکایت ہے، جنہوں نے کشمیر کو محض عیش گاہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی کے نام پردیسؔی لکھتے ہیں:

---

[1]: 'افسانوی مجموعہ، ''دنیا ہماری''، صفحہ ۱۶، سن اشاعت ۱۹۴۱، پریم ناتھ پردیسی، پبلشرز، مکتبہ لالہ راخ سرینگر۔

''کشمیر کا ہر بدنصیب باشندہ بذاتِ خود افسانہ ہے، جس کی طرف
آج تک کسی نے توجہ نہیں دی۔ باہر کے چند افسانہ نگاروں نے
کچھ کہانیاں ضرور لکھیں مگر وہ بھی غلط انداز میں۔ ان میں بیشتر
نے محض جنس کو اپنا موضوع بنایا۔ حالانکہ یہاں یہ کوئی اہم مسئلہ
نہیں جس پر فوری توجہ کی ضرورت ہے، یہاں کا سب سے بڑا
مسئلہ غلامی ہے، افلاس ہے، شخصی حکومت ہے۔ ایسے دوستوں
سے مجھے ہمیشہ شکایت رہی ہے، جنہوں نے اپنی کہانیوں میں
رنگینی پیدا کرنے کیلئے جنسیات کے فرضی رومان تیار کئے اور کشمیر کو
بدنام کیا''۔

نئے شعور کے طلوع ہونے کے بعد پردیسی نے جتنے افسانے لکھے اُن میں
کشمیر اور کشمیر کے عوام کی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ ان افسانوں میں کشمیر کی زندگی
اپنے مخصوص سماجی پسِ منظر کے ساتھ اپنے مسائل رکھتی ہے۔ ''جنت جہنم''،
''جھنڈیاں''، ''ڈھول'' اور ''بہتے چراغ'' جیسے افسانوں میں کشمیر اور کشمیر کے محنت
کش عوام کی زندگی اور اُن کے مسائل کو پیش لانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

افسانوی مجموعہ ''بہتے چراغ'' کے بغیر یہ سب افسانے 1947 عیسوی سے
پہلے لکھے گئے۔ ڈوگرہ شاہی کا ظلم وستم ان افسانوں کا موضوع ہے۔ ایک طرف
انہوں نے اپنی کہانیوں میں جاگیردارانہ نظام کے مظالم اور اُس کی لعنتوں یعنی
توہم پرستی، نوکر شاہی اور روشوت خوری، عوام کی اقتصادی بدحالی اور زنگ خوردہ

سماجی بندھنوں اور اقتصادی رشتوں کے خلاف جنگ کی ہے اور دوسری طرف اُن کی کہانیاں انسان دوستی، زندگی سے محبت، فن سے محبت، نئی اور خوشحال زندگی کی امید اور تمناؤں اور اُس کے حصول کے عزم کی بہت ہی اچھی تصویر پیش کی ہے۔ اُنہیں عالم گیر امن سے محبت اور جنگ سے نفرت تھی۔ اُردو کے نمائندہ افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی لکھتے ہیں:

> ''پردیسی کی زندگی کشمیر کیلئے تھی۔ اُن کا فن کشمیر کیلئے تھا۔ اُن کی زندگی کا ہر لمحہ اور اُن کے افسانوں کا ایک ایک لفظ اسی حقیقت کا شاہد ہے''۔

مرحوم محمد صادق وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر ''بہتے چراغ'' کے تعارف میں لکھتے ہیں:

> ''پردیسی کشمیری عوام کی زندگی کی گہرائیوں تک پہنچنے اور اُن کی تمناؤں اور اُمنگوں کو محسوس کرتے اور محسوس کر کے کہانیوں میں پیش کرتے تھے۔ اُنہوں نے ایک نبض شناس کی طرح ہر دور اور ہر زمانے میں لوگوں کے نبض پر ہاتھ رکھا اور اس طرح سے جو نتیجہ اخذ کیا وہ ہمارے سامنے رکھا۔ اس لحاظ سے وہ کشمیری عوام کے نمائندہ کی حیثیت رکھتے تھے''۔ [1]

''افسانہ ''ڈھول'' جو پری محل کے تاریخی کھنڈر کی شاداب فضا اور بیلوارڈ کی

---

[1] ''بہتے چراغ'' افسانوی مجموعہ، مرحوم پردیسی کے منتخب افسانے ''تعارف'' ص، ٦۔

رنگا رنگ زندگی کے اطراف میں گھومتا ہے، پردیسی کے نمائندہ افسانوں میں سے ہے، جس کے تانے بانے ایک غریب میاں بیوی کی زندگی کے حقیقی نقوش ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ''ٹیکہ بٹنی'' کشمیری پنڈتوں کے گھرانوں میں شادی بیاہ مقدس مراسم اور اُن کی نگہداشت کا عمدہ خاکہ ہے۔ کشمیر کے جنت نظیر ہونے کے دعوے کے وہ منکر نہیں، لیکن جہاں تک اس جنت ارضی کے عوام کی زندگیوں کا تعلق ہے وہ اس جنت ارضی میں پہلے سے طے کیئے ہوئے تصورات لے کر آنے والوں پر زہر خند کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لیکن شاید وہ نہیں جانتی تھی کہ جنت ارضی کی میلی مخلوق کی تصویریں جہنم کے بے فکر باسی بہت پسند کرتے ہیں''۔ [1]

پردیسی اپنے افسانوں کو ایک ڈرامائی موڑ پر لا کر ختم کرنے کے بہت شائق تھے۔ اس خصوصیت کے لحاظ سے افسانہ ''کاری گر'' بہت بلیغ ہے۔ یہ ایک یورپی سیاح کی کہانی ہے۔ جو نفسیات کا معلّم ہے۔ وہ ایک کشمیری کاریگر مام دیؔن کے کام کو پسند کر کے سگریٹ کیس پر نقش بنانے کی فرمائش کرتا ہے۔ لیکن جب یہ سگریٹ کیس تیار ہو جاتا ہے تو اس کے نقش اور سگار بکس کے نقش و نگار کو پسند کرتے ہوئے اس کے لینے سے ہیبت ناک گریز، جہاں اس معلّم نفسیات کی ایک پوشیدہ اُلجھن کی طرف اشارہ ہے وہاں کہانی کیلئے ایک اچھا ڈرامائی انجام بھی مہیا کرتا ہے۔

نفسیات کا معلّم دل ہی دل میں سوچ رہا تھا، مام دیؔن کا وجود بھی ایک حُسن ہے،

---

[1]: بہتے چراغ ص ٦، پریم ناتھ پردیسی۔

دماغی حسن جو جسمانی حسن سے بالکل مختلف ہے اور بے پرواہ۔ اور مشرقی آرٹ کی طرح واقع عیاں اور اپنے سے مطمئین۔

پروفیسر عبدالقادر سروری پردیسی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"پردیسی نے کشمیر کے پسِ افتادہ طبقوں کی زندگی کو پیش کرتے ہوئے جہاں تک ہوسکا ان کے شعور کی گتھیوں کو سلجھانے اور کبھی کبھی اُن کے تحت شعور میں جھانکنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس طرح اُن کے افسانوں میں فضا کی ایک تازگی اور اُن کے بیان میں رچاؤ پیدا ہوگیا ہے"۔ [1]

پریم ناتھ دَر:

پریم ناتھ دَر پردیسی کے قریبی معاصرین میں پریم ناتھ در کا نام ہے۔ 1947 عیسوی کے بعد بھی افسانے لکھتے رہے۔ پریم ناتھ پردیسی اور پریم ناتھ دَر دونوں نے بڑے صاف ستھرے افسانے لکھے اور نہ صرف زبان و بیان کے اعتبار سے بلکہ موضوع اور تکنیک کی تازہ کاری سے اردو کے افسانوی ادب میں اپنا مقام بنایا۔ پردیسی کی طرح پریم ناتھ در نے بھی کشمیر کی جنت کا ذکر بہت کم کیا ہے۔ سید احتشام حسین پریم ناتھ در کے افسانونی مجموعہ "کاغذ کا واسدیو" کے پیش نظر میں لکھتے ہیں۔

"کشمیر جو بار بار اُن کے افسانوں میں آتا ہے اپنی وہ جنت بدوش عظمتیں لئے ہوئے نہیں آتا، جن سے رومانوں کا افسوں جگانے

---

[1] کشمیر میں اردو (دوسرا حصہ)، پروفیسر عبدالقادر سروری ص،۷۱۔

کیلئے فضا تیار ہوتی ہے، بلکہ ان میں وہ غم آلود اور نشتر اگین کسک بھرتا ہے جس سے کشمیر کی حقیقت کے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں"۔[1]

پریم ناتھ در کے ہاں غضب کا باریک مشاہدہ نظر آتا ہے۔ وہ اس بے چارگی اور لاچاری کی تہوں تک ٹٹول کر نیچے جاتے ہیں اور اُن حقائق کو بے نقاب کرتے ہیں جس نے یہاں کے عوام کو افلاس اور بھوک کی اندھے غاروں میں دھکیل دیا تھا۔ دؔر کے موضوعات ہماری آس پاس کی زندگی اور اس سڑے ہوئے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں، اور اُن میں زندگی اس قدر قریب محسوس ہوتی ہے جیسے ہمارے پاس سانس لے رہی ہو۔ اُن کے افسانوں کے صرف دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ایک کاغذ کا واسدیو 1949 عیسوی اور دوسرا نیلی آنکھیں 1960 عیسوی۔ اس کے علاوہ برصغیر کے رسالوں میں اُن کے افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ زبان و بیان پر اُنہیں قدرت حاصل تھی، لیکن وہ الفاظ کا خزانہ نہیں لٹاتے، نہایت احتیاط سے الفاظ کا استعمال کرتے تھے۔ اُن کے یہاں شاعری کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ تاثیر کی وحدت کا خیال بھی رکھتے ہیں اور افسانے کو آغاز سے لے کر اختتام تک مختلف منزلوں میں سے کامیابی سے گزرنے کا فن بھی جانتے تھے۔

لاہور سے شائع ہونے والے معروف رسالے "ادبی دنیا" کے مدیر نامدار مولانا صلاح الدین احمد کو ایک زمانہ میں اردو کے افسانوی ادب میں جمود کا احساس ہوا تھا، لیکن جب پریم ناتھ در نے اپنا افسانہ "غلط فہمی" 1945 عیسوی میں رسالہ

---

[1] کاغذ کا واسدیو، پریم ناتھ در، پیش لفظ، سید احتشام حسین سن اشاعت، دسمبر ۱۹۴۵۔

''ادبی دنیا'' میں شائع کروانے کیلئے بھیج دیا تو مولانا کو جمود ٹوٹنے کا یقین ہو گیا تھا کہ پریم ناتھ در نے فن کا پرچم ان دیکھے میدانوں میں جا گاڑا تھا اور افسانوی حدود کو آگے بڑھایا تھا۔ ''ادبی دنیا'' کے مدیر مولانا صلاح الدین نے نئے افسانہ نگار کو متعارف کراتے ہوئے لکھا تھا:

''درؔ ہمارے افسانوی اُفق پر طلوع ہوتے ہی چمک اٹھا ہے اور اگر وہ نو جوان ہے تو پھر موجودہ استادوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیے، وہ بہت جلد ہمارے افسانوی حدود کو آگے بڑھائے گا اور فن کا پرچم ان دیکھے میدانوں میں جا گاڑے گا''۔ ۱

اس کے بعد اُن کے ایک سے ایک افسانے منظر عام پر آنے لگے اور وہ مسلسل کامیابی کے جھنڈے گاڑتے ہوئے آگے بڑھے۔ مولانا کی یہ پیشن گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ چنانچہ درؔ کے افسانے یکے بعد دیگرے شائع ہونے لگے تو مولانا نے ایک بار پھر اپنے پہلے بیان پر تصدیق کی مہر ثبت کرتے ہوئے لکھا:

''میں نے درؔ کے بارے میں جو پیشن گوئی کی تھی وہ صحیح ثابت ہوئی، کہاں ہیں وہ افسانہ نگار جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُنھوں نے عظیم افسانے لکھے ہیں؟ وہ آئیں اور دیکھیں، افسانے یہ ہوتے ہیں''۔

کراچی میں ممتاز شیریں نے افسانہ ''اَخ تھو'' پڑھا تو بے ساختہ کہا کہ ''میں

۱: نیلی آنکھیں، ''پریم ناتھ در، ص، ۳، سن اشاعت مئی ۱۹۶۰۔

نے طنز پڑھی ہے لیکن اس بلا کی نہیں''۔ لکھنو میں احتشام حسین نے درؔ کے افسانوں کو دیکھ کر کہا کہ ہم یورپ یا امریکہ کے بہترین افسانے کا مقابلہ بلا جھجک اپنے ایسے افسانوں کے ساتھ کر سکتے ہیں۔

1947 عیسوی کے بعد اُردو افسانہ کی منزلیں سر کرتا ہوا آگے بڑھا ہے۔ نہ صرف موضوع کے اعتبار سے افسانے کا کینڈا بدل گیا بلکہ فن، تکنیک کے اعتبار سے بھی افسانہ کہیں سے کہیں پہنچا ہے۔ اس دور سے قبل اور اس کے بعد پردیسی، پریم ناتھ درؔ اور پنڈت گنگا دھر بھٹ دیہاتیؔ مسلسل لکھتے رہے، لیکن اس فہرست میں کئی اور ناموں کا اضافہ ہوا۔ خاص طور پر ٹھاکر پونچھی اور موہن یاور جنہوں نے 1947 عیسوی سے قبل لکھنا شروع کیا تھا مگر 1947 عیسوی کے بعد ہی ان کے فن نے ترقی کی۔ پریم ناتھ درؔ کے پہلے افسانوی مجموعہ ''کاغذ کا واسدیو'' میں نو 9 افسانے گیت کے چار بول، دونوں کا پھیر، تحلیل نفسی، غلط فہمی، جوان، اخ تھو، چڑھاوا اور کاغذ کا واسدیو شامل ہیں۔ پہلا افسانہ اگست 1947 عیسوی میں لکھا گیا تھا اور آخری افسانہ ''کاغذ کا واسدیو'' اس کے ٹھیک ایک سال بعد لکھا گیا۔ ان افسانوں میں عموماً کشمیر کی سماجی زندگی کے معرکے پیش کئے گئے ہیں۔ ''کوفتہ'' کشمیر کے شہرۂ آفاق ''گوشتابہ'' کا افسانہ ہے، جس کی لذت نے لالہ گھاسی رام کے بیٹے بابو رام کو سبزی خور سے گوشت خور بنا دیا تھا۔

''کاغذ کا واسدیو'' کشمیر کے دیہات کے ایک غریب مزدور کی ایک منفرد انداز کی کہانی ہے جو اپنے بچوں کو مری ہوئی ماں کی یاد سے محفوظ رکھنے کیلئے برف کے

تو دوں کو ہٹاتے ہوئے زندگی کی تھکان سے چور چور واسدیو بچوں کو ہنساتے ہنساتے خود ایک ابدی ہنسی بن جاتا ہے۔ ''کاغذ کا واسدیو'' کے پیش لفظ میں احتشام حسین نے پریم ناتھ در کے فن پر اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پریم ناتھ در کی افسانہ نویسی کی عمر ابھی کم ہے، لیکن تخلیق ذہن کی صلاحیتیں ابتدائی کارناموں میں ہی نمایاں ہو جاتی ہیں، چنانچہ در نے بہت جلد لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا، اردو افسانہ نگاری کے اس عظیم الشان دور میں کسی نئے افسانہ نگار کا میدان میں آنا اور اپنی جگہ بنانا خود ایک قابل تحسین اور قابل غور بات ہے اور پریم ناتھ در وہ جگہ حاصل کر رہے ہیں''۔ [1]

پریم ناتھ در کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''نیلی آنکھیں'' دس افسانوں پر مشتمل ہے۔ ''نیلی آنکھیں، بھوت پربت، گدھ، فائدہ بے فائدہ، ویسے کا ویسا، زندگی کا گھونٹ، دودھ، نیلی بوتل'' تقسیم ہند کے بعد کے حوادث اکثر معاصر افسانہ نگاروں کا موضوع رہے ہیں۔ لیکن کشمیر کے حوادث پر جو افسانے مثلاً گدھ، ویسے کا ویسا، نیلی بوتل، اس مجموعے میں شامل ہیں۔ ان سے بہتر افسانے اب تک نہیں لکھے گئے ہیں۔ ''ویسے کا ویسا'' کشمیر میں قبائیلوں کے گھس آنے کا بیانیہ ہے۔

پریم ناتھ در کے یہاں پریم ناتھ پردیسی کی طرح کشمیر کا ذکر کم آتا ہے۔ لیکن وہ کشمیر نہیں جس کا ذکر اردو کے کئی بڑے افسانہ نگاروں نے کیا ہے اور کشمیر کی

---

[1]: ''کاغذ کا واسدیو'' پریم ناتھ در، ۱۹۴۹ء۔

روح کو مسخ کیا ہے۔ درؔ کے افسانوں میں پردیسیؔ ہی کی طرح کشمیر کے برفیلے پانیوں، سدا بہار گھاٹیوں اور نیلی آنکھوں والی دوشیزاؤں کا ذکر نہیں ملتا۔ اُن کی کہانیوں میں یہاں کے جہنم زاروں کی تصویر ملتی ہے۔ اُنہوں نے اپنے معاشرے کی حقیقی عکاسی بڑے خلوص کے ساتھ اپنی کہانیوں میں پیش کی ہے۔ پروفیسر حامدی کاشمیریؔ اپنی کتاب ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''اُن کا محبوب موضوع کشمیر اور اہلِ کشمیر ہی رہا۔ ''کاغذ کا واسدیو'' اُنکا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں ''کاغذ کا واسدیو'' اور ''گیت کے چار بول'' بلند پایہ کے افسانے ہیں۔ پریم ناتھ درؔ نے کشمیریوں کی مفلوک الحال زندگی کے معرکے کھینچے ہیں۔ وہ کشمیری زندگی کا دردمندی اور خلوص سے مطالعہ کرتے ہیں اور پھر اپنے موضوع کو افسانوی سحر طرازی سے دلچسپ بناتے ہیں''۔ [1]

وادیٔ کشمیر میں اردو افسانہ تقسیم ہند کے بعد:

1947 عیسوی کے بعد ہماری ریاست سیاسی اعتبار سے ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی۔ اس کا اثر لازمی طور پر یہاں کی سماجی، ثقافتی اور ادبی زندگی پر بھی پڑا۔ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ملک بھی تقسیم ہوا اور ادیبوں کا بھی بٹوارہ ہوگیا۔ عزیز واقارب جدا ہوگئے۔ چند فرقہ وارانہ فسادات میں مارے گئے۔ ملک کے بٹوارے سے سارا نظام درہم برہم ہوگیا، جس کا اثر لوگوں کے علاوہ فنکاروں اور

---

[1] ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب''، حامدی کاشمیری ص ۸۲، ۱۹۹۱ عیسوی،

ادیبوں پر بھی پڑا۔ پریم ناتھ پردیسی محاذ پر جنگ لڑنے کیلئے نیشنل ملیشیا میں بھرتی ہوئے اور ان حالات سے متاثر ہوکر اُنہوں نے ''نغمۂ جنگ، بہتے چراغ اور شام وسحر'' جیسے افسانے لکھے، جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ امن وآشتی کے کتنے خواہاں تھے۔ ایک جگہ وہ اپنے شاہکار افسانہ ''بہتے چراغ'' میں لکھتے ہیں:

''اب آپ کے چراغ نہیں جلیں گے سیٹھ جی، دنیا کو امن کی ضرورت ہے''۔

ملک کی تقسیم سے جموں وکشمیر کے بہت سے افسانہ نگار پاکستان چلے گئے اور بہت سے ہندوستان کے دوسرے حصوں میں رہائش پذیر ہوگئے اور بعض نے لکھنا ہی بند کردیا یا بہت کم لکھا۔ قدرت اللہ شہاب، محمد عمر، نور اِلٰہی، کوثر سیمابی، طالب گورگانی، گلزار احمد فدا اور شیخ منظور اِلٰہی پاکستان چلے گئے۔ راما نند ساگر، کشمیری لال ذاکر، کندن لال، جگدیش کنولؔ، پریم ناتھ درؔ اور ٹھاکر پونچھی تلاش معاش کے سلسلے میں ریاست سے باہر ہندوستان کے مختلف حصوں میں پھیل گئے اور بدستور لکھتے رہے۔ وادی کشمیر میں ملک کی آزادی کے بعد افسانہ نگاری کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ کشمیری افسانہ نگار بھی ترقی پسند تحریک سے روشناس ہوگئے۔ دینا ناتھ نادمؔ پہلے کشمیری افسانہ نگار تھے جنہوں نے باقاعدہ طور سے کشمیری افسانے کا آغاز شروع کیا۔ ہردے کول بھارتیؔ کشمیری افسانہ کے ابتدا کے بارے میں لکھتے ہیں:

''گوڈنیک افسانہٕ یُس چھاپ سپد تھ لۆکن بروٚنٹھ کنہِ آو اوس شری دینا ناتھ نادِمؔ سُند ''جوابی کارڈ'' اُتھی ےِتی سپُد شری سومناتھ زُتشی

سُند افسانہ ''ییلہِ پھۆل گاش'' تہِ شایع، کینژن بزرگن ہنز رائے
چھِ اَتھ مختلف۔ قومی کلچرل کانگریس کِس 25ہمہِ فروری 1950
عیسوی کِس ادبی جلسس منز آو گوڈنیک کاشُر افسانہ پرنہٕ، ناو
اوسُس ''ییلہِ پھۆل گاش'' تہٕ افسانہٕ نگار اوس سومناتھ زُتشی'' ۔[1]

ترجمہ: کشمیری افسانہ نگار دینا ناتھ نادم کا پہلا افسانہ ''جوابی کارڈ'' تھا جو سب سے
پہلے عوام کے سامنے آیا۔ اس کے ساتھ ساتھ سومناتھ زتشی کا افسانہ ''جب صبح ہوئی''
شائع ہوا۔ مگر کچھ بزرگوں کی رائے اس کے برعکس ہے۔ قومی کلچرل کانگریس
25 فروری 1950 عیسوی کے ادبی جلسے میں پہلا کشمیری افسانہ ''ییلہِ پھۆل گاش''
یعنی جب صبح ہوئی پڑھا گیا۔ اس کے افسانہ نگار سوم ناتھ زتشی تھے۔

کشمیر کے اُردو افسانہ کا دوسرا دور:

وادیٔ کشمیر کے اردو افسانہ نگاری کا دوسرا دور لگ بھگ 1950 عیسوی سے
شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں پرانے لکھنے والوں کے ساتھ ادبی اُفق پر جو نئے
چہرے اُبھرے ہیں اُن میں تیج بہادر بھان، حامدی کاشمیریؔ، برج پریمی، پشکر ناتھ،
غلام رسول سنتوش، علی محمد لون، اختر محی الدین، صوفی غلام محمد، نور شاہ، عمر مجید، آمیش
کول بھارتی، ہردے کول بھارتی، مخمور حسین بدخشی اور شبنم قیوم کے نام خاص طور
سے لئے جا سکتے ہیں۔

---

[1]: تحقیقی رسالہ، (انہار)، جلد۵، سنِ اشاعت، ۱۹۸۱، ص، ۴۶۔ کاشُر ڈیپارٹمنٹ، کشمیر
یونیورسٹی حضرت بل سرینگر۔

پشکر ناتھ:

پشکر ناتھ نے دلچسپ افسانے لکھے ہیں اور ایک ناول ''دشت تمنا'' کے نام سے لکھا ہے۔ اُن کے ایک افسانوی مجموعہ ''اندھیرے اُجالے'' کو کلچرل اکیڈیمی سرینگر کی طرف سے پہلا ادبی انعام بھی ملا۔ کلچرل اکیڈیمی کے رسالے ''ہمارا ادب'' کے وہ مسلسل لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ''موت کا سوداگر، پردہ نشیں، گالی، انتقام، جاہل کمینے، اندھیرے اُجالے'' اُن کے دلچسپ افسانے ہیں۔ ''جاہل کمینے'' کے واقعات گلمرگ سے تعلق رکھتے ہیں، جو اپنے حسن اور دلکشی کی وجہ سے دُنیا کے سیاحوں کی آماجگاہ ہے۔ اس کے افراد صمدو، خدجی، نوری اور اس کا مریض بچہ فطرت اور سماج کے تضاد کا ایک نمونہ ہے۔ ''موت کا سوداگر'' اُن کے نمائندہ افسانوں میں شمار ہوسکتا ہے۔ یہ افسانہ ایک بدمعاش کاہن سنگھ کی داستان ہے۔ پشکر نے اس کے ردِعمل اور کردار کو بڑی خوبی سے اٹھایا ہے۔ لڑکے سے محبت اس کا مرکزی موضوع ہے، جس نے بدمعاش کو ایک ہوٹل کے ہیڈ ویٹر کا خون کرنے سے باز رکھا۔

پشکر ناتھ کا ایک اور دلچسپ افسانہ ''پردہ نشیں'' ہمارا ادب میں 1959 عیسوی میں شائع ہوا تھا اور یہ بعض اعتبارات سے اُن کے بہترین افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ پشکر ناتھ نے ایک رومانی افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ لیکن بہت جلد اُنہوں نے اپنے منصب کو پہچان لیا اور رومان سے اُتر کر اُنہوں نے کشمیر کی زندگی کے کرب کو اپنے افسانوں میں ڈھال دیا۔ اُن کی کہانیوں میں جذبے اور احساس کا ادراک ملتا ہے اور منجھا ہوا شعور بھی۔ ان کے افسانوں میں

پریم چند، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کے خیالات ملتے ہیں۔

''ڈل کے باسی'' اُن کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس کے بعد ''عشق کا چاند اندھیرا'' اور ''کانچ کی دُنیا'' دو مجموعے اور شائع ہوئے ہیں۔ ''ڈل کے باسی'' 1967 عیسوی میں شائع ہوا۔ اس کو ریاستی کلچرل اکیڈیمی کا پہلا انعام حاصل ہوا۔ تیسرا افسانوی مجموعہ 1982 عیسوی میں شائع ہوا اور ملک کے طول و عرض میں سہرایا گیا۔ ''ڈل کے باسی'' میں کل تیرہ افسانے ہیں۔ ''جرم اور ضمیر، صبح کا بھولا، معرر تحصیل کی داستان، افسردہ گلاب، غیر حاضر، گرداب، پرایا آنگن، میرا گاؤں، نیلے امبر تلے، اور نازلی'' ان افسانوں کی تہہ میں کشمیری عوام کی اقتصادی بدحالی کا ذکر ہیں۔ افسانوی مجموعے ''کانچ کی دنیا میں، رازِ دِل، غبارے کی واپسی، اکیلی راہ کا مسافر، شہر بے چراغ، ٹراوٹ مچھلی، اُبال، تیرا آنچل میرا دامن، نوری بھی ناری بھی، برکھا برسے ساری رات، مداوا، شہہ رگ سے دور، دل کی بستی، لوٹ آئے میرے سر بلند، درد کا مارا، پل نمبر صفر کے گدھ، بے خواب دریچے اور کانچ کی دنیا'' شامل ہیں۔

حامدی کاشمیری:

حامدی کاشمیری کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری اور افسانہ سے ہوا۔ وہ 1932 عیسوی کے اوائل میں سرینگر میں پیدا ہوئے اور کالج کی طالب علمی کے زمانے میں ہی یعنی 18 سال کی عمر سے باقاعدی کے ساتھ ان دونوں اصناف میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے لگے۔ 1951 عیسوی میں اُن کا پہلا افسانہ

''ٹھوکر'' ماہنامہ شعائیں دلی میں شائع ہوا۔ اس کے بعد سے 1961 عیسوی تک اُنہوں نے اردو کے مقبول رسالوں میں تسلسل کے ساتھ بڑی خاصی تعداد میں افسانے لکھے۔ حامدیؔ کے افسانوں کا مجموعہ ''وادی کے پھول'' 1957 عیسوی میں منظر عام پر آیا جو 1950 عیسوی سے 1955 عیسوی تک سولہ منتخب کہانیوں پر مشتمل تھا۔ ''وادی کے پھول'' کے بعد ان کے افسانوں کے دو اور مجموعے ''سراب'' اور ''برف میں آگ'' کے نام سے شائع ہوئے۔ حامدی کے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری کا واضع رجحان ملتا ہے۔ اُنہوں نے اس میں غریبی، بیماری، جہالت اور توہم پرستی کے حقیقی نقوش اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جو اُس زمانے میں کشمیر کا مقدر تھے۔ یہ افسانے خارجیت، مقصدیت اور افادیت کے حامل ہیں۔

مظہر امام اپنے مضمون ''حامدی کاشمیریؔ ایک بازیافت'' میں لکھتے ہیں:

''حامدیؔ کے افسانے کشمیر کی زندگی کے عکاس ہیں۔ آج کم لوگوں کو احساس ہوگا کہ اب سے تیں، چالیس سال پہلے کشمیر کے نچلے طبقے کی زندگی کس بے چارگی اور کسمپرسی کا شکار تھی۔ حامدیؔ نے اس طبقے کی زندگی کو قریب سے دیکھا، چکھا اور محسوس کیا''۔ [1]

مقامی رنگ اور مقامی خصوصیات نے اُن کے افسانوں میں جان ڈال دی۔ جنہوں نے کشمیر کو دیکھا ہے وہ حامدیؔ کے افسانوں کے کرداروں کو یہاں کے ماحول میں ضرور پہچان لیں گے۔ ان کے کردار جیتے جاگتے اور یہاں کی فضامیں

---

[1]: ریاست جموں کشمیر میں اردو ادب، حامدی کاشمیری، ص، ۳۱، سال اشاعت، ۱۹۹۱،

سانس لیتے ہوئے کردار ہیں۔ حامدی ان کرداروں کی مدد سے کشمیر کی زندگی پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن لکھتے ہیں:

''یہ حقیقت ہے کہ اُن کے کردار کشمیر کی زندگی کے مختلف گوشوں کے نمائندے بھی ہیں اور اشارے بھی۔ کرم دین، نورہ، سارہ، زونی، چاچا شعبان، نبلہ، غفارہ وہ کردار ہیں جنہیں ہم کبھی بھول نہ سکیں گے اور بہت ساری حقیقتیں سامنے آجاتی ہیں''۔ [1]

''سراب، سندری، وادی کے پھول، برف میں آگ'' جیسے افسانوں میں جہاں شعر تراشیاں ہیں، وہاں مشاہدے کی باریکی اور غور و فکر کی گہرائی کے ساتھ جنس کا شدید احساس ملتا ہے اور حسن و عشق کی حقیقی داستانیں بھی۔ ان افسانوں میں فن کی اہمیت، کشمیری کلچر اور عوام کی نفسیاتی زندگی کی تہہ در تہہ کڑیاں جاملی ہیں۔

نور شاہ:

نور شاہ کے افسانوں میں زخم خوردہ دلوں کی دھڑکنیں ملتی ہیں۔ اُن کے افسانوں کے چار مجموعے ''بے گھاٹ کی ناؤ، ویرانے کے پھول، من کا آنگن اُداس اُداس، ایک رات کی ملکہ'' دلچسپی سے پڑھے اور پسند کئے جاتے ہیں۔

''بے گھاٹ کی ناؤ'' میں دس افسانے شامل ہیں۔ ''ویرانے کے پھول'' میں بارہ افسانے، ''من کا آگن اُداس اُداس'' میں چھ افسانے شامل ہیں اور

---

[1]: ''وادی کے پھول'' پیش لفظ، شکیل الرحمن، ص ۴، ۱۹۷۸ء

''ایک رات کی ملکہ'' گیارہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس علاوہ اُن کے افسانے رسالہ ''ہمارا ادب'' میں چھپتے رہے اور ملک کے مشہور رسالوں میں اُن کے افسانے شائع ہوئے۔ کہانی لکھنے میں اُنہیں نہ صرف ذوق ہے بلکہ سلیقہ اوراچھا سلیقہ ہے۔ انہیں مظلوم اور مفلوک انسانوں سے ہمدردی ہے۔ اکثر افسانوں میں انسان دوستی کے جذبے کا کام لیتے ہیں۔

عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''کشمیری عوام کی زندگی، اُن کے جذبات، اُن کے رنج وغم، اُن کی مسرتوں، اُن کی تمناؤں اور خواہشات کے کتنے ہی معرقے ان کے افسانوں کی کثیر تعداد میں ملتے ہیں''۔ [1]

نور شاہ کے افسانے شدید احساس کے مرہون منت ہیں۔ وہ انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتا ہے۔ اُن کے افسانوں میں رومان کے پھول بھی ملیں گے اور مقصدیت کے کانٹے بھی۔ کہیں کہیں سماجی بے اعتدالی اور بے راہ روی، پُر دردمندی کے ساتھ طنز بھی کیا ہے۔ اُن کی نگاہیں ماحول کی پرفریب سطح کو چیر کرتہہ میں حقیقت کو ڈھونڈتی ہیں اور کامیابی کے ساتھ مطلوبہ تاثیر اُبھارتی ہیں۔ ٹھاکر پونچھی لکھتے ہیں:

''اگر اُس نے اپنی دھرتی کا دامن نہ چھوڑا اور اپنی کہانیوں کا خمیر اپنی مٹی سے ہی اٹھاتا رہا تو ایک دن اس کا شمار اُن سر کردہ افسانہ

---

[1] کشمیر میں اردو تیسرا حصہ، ص ۲۴۴، سن اشاعت، ۱۹۸۶۔

نگاروں میں ہوگا جو حقیقی معنوں میں کشمیر کے نمائندہ اور منفرد
ادیب کہلانے کے مستحق ہیں۔ اپنے موہن یاور، حامدی کاشمیری،
ویدراہی اور پشکر ناتھ جیسے جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگاروں کی
صف میں نور کی شمولیت قابل فخر اور باعث ستائش ہے۔ افسانہ
نگاروں کی صف میں اس کا خیر مقدم ہونا چاہیئے"۔ [1]

مخمور حسین بدخشی:

مخمور حسین بدخشی اپنی وادی کے انسانوں کو دیکھتے ہیں، اُن کے ساتھ چلتے پھرتے ہیں اور اُن کو پرکھنے کے بعد اپنے افسانوں میں جگہ دیتے ہیں۔ اُن کے تمام کردار اِسی آب وگل کی پیداوار ہیں۔ اُن کے افسانوں میں حقیقت اور صداقت کے گُل بوٹے قدم قدم پر کھلتے نظر آتے ہیں۔ یہ افسانے کسی نہ کسی حقیقت اور کسی نہ کسی راز کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ تکنیک کے لحاظ سے بھی یہ دِل فریب ہیں۔ اُن کی انہیں خصوصیات کو اُجاگر کرتے ہوئے محی الدین زور "نیل کنول مسکائے" افسانوی مجموعہ کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

> "مخمور حسین کے افسانوں میں ان کی گفتگو اور اندازِ طبیعت کے خلاف مسکراہٹیں کم اور طنز نگاری زیادہ ہے۔ اُنہوں نے ہنستے چہروں سے زیادہ افسردہ دلوں کو پیش کیا ہے اور ہوس کاروں اور مکاروں پر بھی پورا طنز کرنے کی کوشش کی ہے"۔ [2]

---

[1] پیش لفظ: ٹھاکر پونچھی "بے گھاٹ کی ناؤ"۔ نور شاہ ص ۱۶

[2] نیل کنول مسکائے (افسانوی مجموعہ) مخمور حسین بدخشی سن اشاعت ۱۹۶۲ عیسوی۔ پیش لفظ: ڈاکٹر محی الدین زور

''نیل کنول مسکائے، عبداللہ دیوانہ، یہ خلش کہا سے ہوتی اور ہار جیت''
کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے افسانوں میں اول مشاہدے کی کمی محسوس
ہوتی ہے، دوم وہ کشمیری محاورات کا براہ راست لفظی ترجمہ کر جاتے ہیں جس کی وجہ
سے کہانی کا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔ افسانوی مجموعہ ''نیل کنول مسکائے'' میں انتظار،
مریم، ہار جیت، نور اور سائے، اندھیرا اُجالا، کاغذ کے پھول، وادی کی رانی،
یہ خلش کہاں سے ہوتی اور نیل کنول مسکائے'' شامل ہیں۔ افسانہ نگار نے اب اس
افسانوی مجموعہ کا نام ''کاغذ کے پھول'' رکھا ہے۔

برج کیتال، شبنم قیوم اور برج پریمی نئی فضا اور نئے رجحانات کی عکاسی
کرتے ہیں۔ تخلیقی تانے بانے کم اور حقیقت پسندانہ عناصر بہت زیادہ ہیں۔ اُن کے
افسانوں میں روزمرہ زندگی کے چٹخارے اور عام ماحول کی تصویر کشی کے علاوہ طنز کا
عنصر بھی وافر ملتا ہے۔ برج کیتال کے ''موت کے راہی''، شبنم قیوم کے ''لوہا پگھلتا ہے،
پانی کا دھواں، بہت اونچے بہت نیچے'' اور برج پریمی کے ''یادوں کی خوشبو،
افسانوں میں بیسویں صدی کے مشینی دور کے انسان کا کرب ملتا ہے۔

جموں و کشمیر میں اردو افسانوی ادب کے لئے یہ دور نشاۃ ثانیہ سے کم نہیں
اس دور میں جہاں نئے لکھنے والے سامنے آئے وہاں کہنہ مشق ادیب مثلاً :
ٹھاکر پونچھی، رامانند ساگر، کشمیری لال ذاکر، موہن یاور اور پشکر ناتھ بدستور لکھتے
رہے۔ اسی دور میں متعدد اخبارات اور رسائل شائع ہونے لگے۔

تیج بہادر بھان:

تیج بہادر بھان کا افسانوی مجموعہ ''جہلم کے سینے پر'' ایک شاہکار مجموعہ ہے، جس میں کشمیر کا مخصوص ماحول ملتا ہے۔ دوسرا افسانوی مجموعہ ''عورت'' ہے۔ اُن کے تمام افسانوں میں جموں و کشمیر کے عوام کی زندگی کا ہر پہلو بہت ہی موثر اور دِل نشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ''نئے کشمیر'' میں زندگی کی جھلکیاں دکھائی گئی ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ پرانی دنیا دم توڑ رہی ہے اور اس کی جگہ ایک نئی دنیا جنم لے رہی ہے۔ ''جہلم کے سینے پر'' اور ''عورت'' دونوں افسانوی مجموعوں میں کالج کے نوجوان، طالب علم اور طالبات، ہانجی، کاشت کار، مزدور، دوکان دار، سیاست دان غرض تمام نمائندہ طبقات کی زندگی کے معرقے آگئے ہیں۔ تیج بہادر بھان کے سبھی افسانے 1947 عیسوی کے بعد کشمیر کی فضا میں لکھے گئے ہیں، جب کہ کشمیر میں عوامی طاقتیں برسر اقتدار آچکی تھیں اور جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ افسانے ''سڑے گلے پھل'' میں جنگ کی مخالفت کی گئی ہے اور اس کے ثبوت میں قبائلی حملہ آوروں کی تباہ کاریوں کا ذکر کر کے اسے بھی کشمیر کے حالات سے ہی منطبق کر دیا گیا ہے۔

ٹھاکر پونچھی:

پریم چند کے اندازِ فکر کا اثر ٹھاکر پر گہرا ہے۔ ''زندگی کے موڑ پر'' کے علاوہ اُن کا ایک مجموعہ ''چناروں کا چاند'' ہے۔ ٹھاکر پونچھی کے فن پر دیویندر سارتھی لکھتے ہیں:

> ''ٹھاکر کے بیشتر افسانوں میں بڑی چابک دستی سے کام لیا گیا ہے۔ افسانے کی ہئیت میں مصنف ایک کہنہ مشق ایکٹر کی طرح

اپنی شعوری پختگی سے کام لیتا ہے، زبان کا بہاؤ پورے رکھ رکھاؤ سے آگے بڑھتا ہے''۔

ٹھاکر کے افسانے کلچرل اکیڈیمی کے ادبی رسالوں ''شیرازہ'' اور ''ہمارا ادب'' میں شائع ہوتے رہے۔ اُن کو پہاڑوں، جنگلوں کے گرد و پیش سے بے پناہ محبت اور وہ ان سے کبھی بھی دور نہیں رہتے۔ جسمانی طور پر انہوں نے بائیس برس کا طویل عرصہ دلی میں گزارا، لیکن اُن کی روح پہاڑوں کی سوندھی مٹی، دلکش نظاروں اور آس پاس بسی زندگی میں انسانیت کے خواب دیکھتی رہی۔ اُن کے فن پاروں میں جہاں شہر کا متوسط اور غریب طبقہ جی رہا ہے وہاں غریب پہاڑی لوگوں کی دھڑکنیں، اُن کے دکھ سُکھ، اُن کی محبت، اُن کی کہانیوں اور سب سے بڑھ کر اُن کے پیارے گیت تھرکتے نظر آتے ہیں۔ اُن کا خلوص انسانی ہمدردی کی انچائیوں کو چھوتا ہے۔ اُن کا دِل پہاڑوں پر ایسے بسے لاچار لوگوں کی بے بسی پر خون کے آنسو روتا ہے اور اس طرح وہ اپنی پہاڑی دھرتی میں پیدا ہونے کا حق ادا کرتے ہیں۔ ٹھاکر کو جاگیردارانہ نظام سے بے حد نفرت تھی اور اس نظام کے پیدا کردہ افلاس کو وہ کئی دُکھوں کی جڑ سمجھتے ہیں۔

افسانہ نگاری کا تیسرا دور:

وادیٔ کشمیر میں افسانہ نگاری کا تیسرا دور 1960 عیسوی سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں پہلے اور دوسرے دور کے افسانہ نگاروں کے علاوہ نوجوان افسانہ نگاروں کا ایک اور گروہ سامنے آتا ہے۔ کلدیپ رعنا، ہری کرشن کول، ظفر احمد،

محمد یٰسین، ساگر کاشمیری، شبنم قیوم، عمر مجید، حسن ساہو کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے افسانوں میں موجود سیاسی، سماجی دور کے انسان کا درد و کرب بھی موجود ہے۔ یہ سب باصلاحیت کہانی کار ہیں۔ اُنہوں نے نہ صرف روایتی انداز کی کہانیاں لکھی ہیں بلکہ روایت سے انحراف کر کے نئے اور تازہ موضوعات کو اسلوب کی ندرت اور تازہ کاری سے اردو افسانے کو ترقی کی نئی سمتیں عطا کی ہیں۔ ان کے یہاں ہلکے پھلکے رومان بھی نظر آتے ہیں اور عصری زندگی کی زخمی تمنائیں بھی ملتی ہیں۔

ہری کرشن کول:

ان کی کہانیوں میں نیا شعور جھلکتا ہے۔ ان کے افسانے ''داؤ اور کتے کی دُم'' بڑے دلچسپ افسانے ہیں۔ افسانہ ''داؤ'' میں ہمارے عہد کے نوجوانوں کی خالی خولی زندگی پر ایک گہرا طنز ہے۔ ایک اور افسانہ ''اور بھی غم'' ایک دلچسپ افسانہ ہے جس میں منوہر کی نفسیاتی اُلجھن کو پیش کیا گیا ہے۔ لیکن وجے کا کردار ایک معصوم پہاڑی دوشیزہ کی حیثیت سے بڑا ہی جاذب نظر آتا ہے۔ یہ کہانی یقیناً کشمیر کی گھاٹیوں، پہاڑوں اور دیودار درختوں کے پسِ منظر میں حقیقی زندگی کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ عمر مجید کی نظر اطراف کی زندگی کا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ نچلے طبقے کے لوگوں، کسانوں اور مزدوروں کی قابل رشک زندگی ان کے عام موضوع ہیں۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''اُجھالوں کے گھاؤ'' 1968 عیسوی میں شائع ہوا۔ جن میں نو افسانے ''نمرود کی خدائی، ڈل کی باسی، مردہ چنار، اُجالوں کے گھاؤ، میرے وطن، دھویں کا راستہ، گونگا مجنون اندھی لیلا،

آدمی اور زندگی کا ایک کھلونا'' شامل ہیں۔

''اُجالے کے گھاؤ'' میں ایک غریب کاشت کار کی تباہی کا افسانہ ہے۔

''نمرود کی خدائی'' میں ایک بھوکے نوجوان کی طرف اشارہ ہے جورات کی تاریکی میں دوموٹروں کے تصادم دیکھ کر قریب جاتا ہے۔ موٹرنشین حادثے کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ایک کیس موٹر سے اٹھالیتا ہے جس میں نوٹ بھرے ہوئے ہوتے ہیں، گھر کی طرف روانہ ہوتا ہے، لیکن کسی نامعلوم جذبے کے تحت جب وہ کیس موٹر میں واپس رکھنے کیلئے لوٹتا ہے تو پولیس اُسے گرفتار کرلیتی ہے۔

کلدیپ رعنا اپنے موضوع اور اپنے کرداروں سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔ وادی کشمیر کے دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح اُن کے افسانوں کا پس منظر بھی عموماً کشمیر کی زندگی ہے اور اکثر وہ نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والوں کی زندگی کو موضوع بناتے ہیں۔ ساگر کاشمیری اور مرزا محمد یٰسین بیگ نے بھی دلچسپ افسانے لکھے ہیں۔ ساگر کا افسانہ ''زلزلہ'' ''ہمارا ادب'' میں 1969 عیسوی میں چھپا ہے۔ یہ افسانہ کشمیر کے ایک گاؤں کی زندگی کا بڑا اچھا مرقع ہے۔ یٰسین بیگ کے افسانہ ''من کے منڈپ'' میں ایک بوڑھے کسان کی بیوی کے مرنے کے بیس سال بعد اس کی نئی شادی کی خواہش کو ایمائی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ظہورالدین نے ''نجات'' نعیم اختر نے ''بہار آئی چمن میں مگر خزاں کی طرح'' عبدالغنی شیخ لداخی نے ''مسکراہٹ'' رشید ارشد نے ''کون بتائے'' حسن ساہو نے ''پھولوں کا ماتم'' اور شمس الدین شمیم نے ''ویرانے اور انگلیاں'' جیسے افسانے لکھ کر ادب وفن کو جدیدیت کے ساتھ ہم

آہنگ کیا اور فن افسانہ نگاری کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا ہے۔

نئے لکھنے والوں کی بڑی تعداد وادی کشمیر میں اردو افسانہ نگاری کی روشن مستقبل کی نقیب ہے۔ ان میں رشیدہ پروین، جان محمد آزاد، م۔م۔ صدیق، عبدالاحد بٹ، بشیر گاش، ایم نساء، طارق عمر بچھ، بشیر دادا، وحشی ساحل، قیوم ساغر قابلِ ذکر ہیں۔

وادی کشمیر کے نوجوان اردو افسانہ نگاروں کے افسانوں کا ''مشترکہ مجموعہ'' ''ارمغانِ کاشمر'' مرتبہ بشیر گاش یکم نومبر 1947 عیسوی میں شائع ہوا۔ اس میں عمر مجید کا افسانہ ''میرے وطن''، شمس الدین شمیم کا افسانہ ''سڑک''، م۔م، صدیق کا افسانہ ''واپسی''، عبدالاحد بٹ کا افسانہ ''آخری موڑ'' بڑے دلکش افسانے ہیں۔ اس افسانوی مجموعہ میں وادی کشمیر کی خواتین نے بھی بھرپور حصہ لیا ہے۔ رابعہ دلشاد کا افسانہ ''کرب کی صلیب'' فرحت آرا کا ''زود پشمان'' شمیمہ اختر کا ''پیاسے سپنے'' ایم نساء کا ''گوری''، نسیم جہاں کا ''دشمن'' رفیقہ عارف کا ''رشتہ'' اور نیلوفر شاعر کا افسانہ ''ایک زخم ہرا سا'' قابلِ ذکر افسانے ہیں۔ اس افسانوی مجومعے کے شائع ہونے سے ان کے حوصلے بڑھ گئے اور موجودہ دور میں ان میں سے کئی خواتین دلچسپ افسانے لکھتی ہیں۔ بشیر گاش اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح پیش کرتے ہیں:

''ہمیں ہر اُبھرتی ہوئی ادیبہ کی خلوصِ دل سے حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ اگر ہم حبہ خاتون، لل ایشوری اور ارنی مال کی بنائی ہوئی

روایات کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں''۔

''ڈولتی نیا'' واجدہ تبسم (کشمیری) کا افسانوی مجموعہ ہے۔ تاریخ اشاعت 1983 عیسوی ہے۔ واجدہ سماج کو بدلا ہوا دیکھنا چاہتی ہیں۔ آذر عسکری (مظفر آباد، پاکستان) لکھتے ہیں:

''واجدہ کو کہانی کا فن آتا ہے اور ان کے ہاں وادی کشمیر کی زندگی کا تنوع مشاہدہ موجود ہے اور اسے نفسیاتی پُر جذب کرنے اور پھر فکروفن کے سانچوں میں ڈھالنے کی قوت بھی۔ ایک عام قاری بھی اُن کے افسانوں میں وقت کی بے راہ روی اور ذہنی کشمکش کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا، جس کی مثال آپ کو ''ڈولتی نیا'' میں نظر آئے گی''۔[1]

اس افسانوی مجموعے میں تیرہ (13) افسانے شامل ہیں۔ ''وقت کے گھاؤ'' ''ڈولتی نیا''، ''نئی منزل''، ''بے نور کی چاندنی'' بڑے دلچسپ افسانے ہیں۔

شمس الدین شمیم نے اپنے افسانوی مجموعے ''ویرانے'' میں زندگی کی ویران بہاروں کو افسانوی پیرائے میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ریاست کی نئی نسل سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں میں خاصے معروف ہیں۔ وہ دردمندی اور خلوص سے سماجی برائیوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ''پھاوڑے کی بیٹی''، ''دوسری صلیب''، ''ڈولی کب آئے گی'' دلچسپ افسانے ہیں۔

---

[1] ڈولتی نیا: واجدہ تبسم ص ۹ سال اشاعت دسمبر ۱۹۸۳ء۔

جموں وکشمیر میں یوں تو اردو افسانے کے ابتداء پریم ناتھ پردیسی کے افسانوں سے ہوئی ہے مگر یہاں کی افسانہ نگاری کی تاریخ تب تک ادھوری سمجھی جائے گی جب تک نہ کرشن چندر کا ذکر نہ کیا جائے۔ جموں وکشمیر کے ساتھ اُن کا روحانی اور تخلیقی رشتہ بڑا گہرا ہے۔ پروفیسر بلاقی رام سے لے کر ''بے پنکھ فرشتہ'' یا ''ادب برائے بطخ تک'' ان کے بیشمار ناول اور افسانے اسی ریاست اور اس کے ماحول سے متعلق ہیں۔ ان کے کردار یہاں کے عوام کی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

اردو افسانے کا چوتھا دور 2000 عیسوی تا حال:

اکیسویں صدی کی ابتدا میں جن نئے اور تازہ دم افسانہ نگاروں نے اس میدان میں قدم رکھا ہے اور جن سے مستقبل قریب میں بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں ان میں منصور احمد منصور، مشتاق احمد وانی، زنفر کھوکھر، طالب کشمیری، نگہت نذر، پرویز مانوس، مجیدار جمند، مقبول ساحل، خالد کرار، وزیر محمد، نیلوفر ناز نحوی، ناصر ضمیر، ریاض توحیدی، فلک ریاض، ماسٹر غفار، یوسف میر، مشتاق کیفی، میر ایوب میر قابلِ ذکر ہیں۔ متذکرہ بالا افسانہ نگاروں میں بعض افسانہ نگاروں نے 2000 عیسوی سے قبل لکھنا شروع کیا ہے لیکن ان کے افسانوی مجموعے باضابطہ طور 2000 عیسوی کے بعد ہی منظر عام آئے ہیں۔ 1990 عیسوی کے بعد کشمیر کے حالات بدل گئے۔ ہر طرف گرنیڈ دھماکوں اور گولیوں کی گھن گرج سنائی دینے لگی۔ ان حالات میں گویا ہر شخص اپنے آپ سے جدا ہو گیا۔

ڈاکٹر منصور احمد منصور:

ریاست کے ایک سنجیدہ کہانی کار ہیں جو خاموشی سے اپنا افسانوی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے دو افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں کشمیری زندگی کی مختلف تصویریں اُتارتے ہیں۔ ''کشمیر خواب، سراب اور گرداب'' میں اُنہوں نے وادی کے عصری زندگی کا خاکہ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر ریاض توحیدیؔ:

ڈاکٹر ریاض توحیدیؔ کا پہلا افسانہ ''قتل، قاتل اور مقتول'' کشمیر سے شائع ہونے والے معروف اور موقر اخبار کشمیر عظمیٰ میں اپریل 2005 عیسوی میں شائع ہوا۔ تب سے وہ برابر کہانیاں لکھتے جارہے ہیں اور اُن کی کہانیاں نہ صرف مقامی اخباروں بلکہ کشمیر اور بیرون کشمیر سے شائع ہونے والے رسائل میں بھی شائع ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی کا پہلا افسانوی مجموعہ ''کالے پیڑوں کا جنگل'' ہے۔ توحیدیؔ نے اپنی تخلیقی سرگرمیوں کا آغاز اس وقت کیا جب کشمیر پُرآشوب دور سے گزر رہا تھا۔ اب تک کی تحریر کردہ اکثر کہانیوں میں کشمیر کا درد و کرب، خون خرابہ اور ٹوٹتی ہوئی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس تعلق سے مجموعہ میں شامل اُن کی کہانیاں ''قتل، قاتل اور مقتول، ناکہ بندی، ہوم لینڈ اور مسائل کے یذید'' قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی اکثر کہانیوں کے کردار انسانی زندگی کی تلخیوں، الجھنوں اور ناکامیوں کی عکاسی کے ساتھ ساتھ بہتر اور خوش حال مستقبل کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ رنج و غم کی داستانوں میں وہ چراغ جلا جلا کر انسانی دلوں کی تاریکیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ آپسی بھائی

چارہ پر زور دیتے ہیں۔ اُن کی ایک کہانی ہوم لینڈ سے ایک اقتباس............

''عبداللہ خان، سوم ناتھ اور سر جیت سنگھ ہندو مسلم اور سکھ اتحاد کی پائیدار علامت تھے...... الگ الگ مذہبوں سے تعلق رکھنے کے باوجود یہ لوگ ایک ہی کنویں سے پانی پیتے تھے۔ ایک ہی کھیوٹ سے فصل اگاتے تھے۔ گاؤں میں ایک بہت بڑا صدیوں پرانا چنار تھا، یہ تینوں اس چنار کے سائے میں غم روزگار پر گفتگو کرتے رہتے تھے۔ یہ چنار اس علاقے کے لوگوں کا صدیوں پرانا ورثہ تھا، جب بھی بستی میں بدامنی کا کوئی واقعہ پیش آتا تو بستی کے لوگ مِل جُل کر اس چنار کے سائے میں بیٹھ کر اس بدامنی کو امن میں تبدیل کرتے تھے۔ (ہوم لینڈ)

اس کہانی میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کشمیر میں رہنے والے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان صدیوں سے چلے آرہے بھائی چارہ کو کیسے اور کن سازشوں کا شکار ہونا پڑا۔ ''کالے پیڑوں کا جنگل'' میں اکیس کہانیاں شامل ہیں۔ جب ڈاکٹر توحیدی کشمیر کے موجودہ درد و کرب کی باتیں کرتے ہیں تو پڑھنے والے کا وجود لرز جاتا ہے۔

مشتاق احمد وانی کینیؔ:

مشتاق احمد وانی کینیؔ تھوڑے ہی عرصہ میں وادی کے اردو ادبی حلقوں میں اپنا ایک مقام بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔ اُن کے افسانوں پر مشتمل اُن کا پہلا

افسانوی مجموعہ ''غافل'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اب 2010 عیسوی کے آغاز میں اِن کا دوسرا مجموعہ ''شہر بے پُرسان'' منظر عام پر آیا ہے۔ اس کتاب میں اُن کے اٹھائیس افسانے شامل ہیں۔ ''مجبوری، مالکن، شہر بے پرسان، فتح کی شکست، ٹی پارٹی، عمل پیہم اور بے پر کی'' حالات و واقعات خود بولتے نظر آتے ہیں۔ مشتاق کینؔی نے کشمیر کے موجودہ پُر آشوب دور کے صورتِ حال میں بگڑنے والے انسانی وجود کی شناخت کا فریضہ انجام دیا ہے۔ وہ اپنی سرزمین اور تہذیب سے جڑے تخلیق کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ جو کچھ مشاہدات اور تجربے کے آئینے میں رقم کیا ہے اُسے اپنے افسانوں میں سمونے کی کوشش کی اور حسن خوبی نبھاتے ہوئے عام فہم سلیس زبان اور دلکش انداز میں پیش کیا البتہ ان کی کئی تحریروں کو انشایئے کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

مقبول ساحلؔ:

مقبول ساحلؔ کی کہانیوں میں جہاں کشمیر کی رومانیت، شادابی اور شگفتگی سے بھرپور فضائیں ملتی ہیں، وہیں یہاں کی کڑواہٹ، آلودگی اور جبر و تشدد کے مناظر بھی سامنے آتے ہیں۔ آج یہاں کا انسان جس بے یقینی کے دور سے گزر رہا ہے، درد و کرب سے دوچار ہے، اس کا احاطہ مقبول ساحلؔ نے فن کارانہ بصیرت سے کیا ہے۔ اپنے اکثر افسانوں میں اُنھوں نے کشمیر کی بے کفن لاشوں، معصوم زندگیوں، سسکتے ارمانوں اور سب سے بڑھ کر کشمیر میں ہو رہے خونین رقص کو اپنے خون جگر سے سنوار کر پیش کرنے کی ہمت کی ہے۔ ان کے افسانوں میں ہمارے ہی اردگرد حالات نظر آتے ہیں

اور کبھی کبھار یہ لگتا ہے کہ یہ میرے سامنے ہوا ہے یا پھر میرے ساتھ ہوا ہے۔

مقبول ساحلؔ کے زیرِ نظر افسانوں کے مجموعے ''قدم قدم تعزیر'' میں تقریباً 21/افسانے شامل ہیں۔ اس مجموعے سے پہلے ان کی دو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سے حال ہی میں ان کی تخلیق (جیل ڈائری) ''شبستان وجود، ایک صحافی کی سرگزشت کے نام سے شائع ہو کر قارئین کی داد تحسین حاصل کر چکی ہے۔ ساحلؔ کو ایک صحافی ہونے کے پاداش میں اپنی زندگی کے بے شمار شب و روز جیل کی کال کوٹھریوں میں آرزو اور انتظار کی کشمکش میں بسر کرنا پڑے ہیں۔ اپنے اِنہی تلخ اور تیکھے تجربات کو اُنہوں نے دوسروں کے ساتھ بانٹ کر معاشرے کی بہت ساری اچھائیوں اور برائیوں، خامیوں اور کمیوں کو اپنے افسانوں کے ذریعے بے نقاب کیا ہے۔ حالات اور وقت کے تحت بدلتے ہوئے مناظر، اپنے کرداروں کی زمین، نفسیاتی کشمکش کا مناسب پھیلاؤ اور زندگی کی چلتی پھرتی پرچھائیاں، یہ سب ''قدم قدم تعزیر'' میں بخوبی نظر آتی ہیں۔

''قہقہوں سے دور''، ''زلزلہ''، اور ''گڑیا'' زبرون کے دامن میں ''شاعر کی محبت'' کوہ تاف کے دامن میں ''چشمے والا بزرگ'' مقبول ساحلؔ کے بڑے دلچسپ افسانے ہیں۔

ترنم ریاض:

جہاں تک ریاست کی خواتین افسانہ نگاروں کا تعلق ہے۔ ان میں ترنم ریاض سرفہرست ہیں اُنہوں نے اپنے افسانوی ادب کو مالا مال کیا ہے۔ اُن کے

افسانوں کے موضوعات ہمیشہ تروتازہ اور اچھوتے ہوتے ہیں۔ اپنے کرداروں کے اندر اُتر کر اُن کے وجود میں پوشیدہ کہانیوں کو باہر نکالنے کے فن انہیں خوب آتا ہے۔ وہ مضامین بھی لکھتی ہیں جو علمی اور ادبی چاشنی سے آراستہ ہوتے ہیں۔ اُن کا ناول ''برف آشنا پرندے'' اردو ناولوں میں اضافہ ہے۔

سیدہ نکہت فاروق:

نکہت فاروق کا افسانوی مجموعہ ''قہر نیلے آسمان کا'' منظر عام پر آ گیا ہے۔ اُنہوں نے اپنے افسانوں میں وادی کے حالات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

منظورہ اختر:

منظورہ اختر نے بہت سے افسانے لکھے ہیں۔ اُن کے افسانوی مجموعے ''چناروں کے چھاؤں'' اور ''جہلم کے کنارے'' شائع ہو چکے ہیں۔

دیپک کنولؔ:

موجودہ دور کے منجھے ہوئے افسانہ نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ رہتے تو ممبئ میں۔ مگر اُن کی کہانیاں کشمیر کے اردگرد گھومتی رہتی ہیں۔ اُنکی ہر کہانی میں کشمیر چھایا رہتا ہے۔ کشمیر کے لوگوں کا درد، اُن کی بدحالی اُن کے افسانوں میں بیان ہوتی ہے۔ جس انداز سے دیپک کنولؔ کہانی اختتام کرتے ہیں وہ اُن کا نہ صرف منفرد انداز ہے بلکہ اُن کی کہانی دیر تک ہی نہیں برسوں ذہن پر چھائی رہتی ہے۔ آج کے دور میں کشمیری عوام اور کشمیری تہذیب و ثقافت کو جس خوبصورتی سے افسانہ نگار نے اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے، وہ دوسرے

کہانی لکھنے والوں کے ہاں نظر نہیں آتا۔ ''سنستا کی گوری، مرغی چور، پمپوش، مچھلی والی'' بڑے دلچسپ افسانے ہیں۔ اُن کا افسانوی مجموعہ ''پمپوش'' 2011 عیسوی میں چھپا جس میں میں چودہ کہانیاں ہیں۔ ''سنستا کی گوری'' میں گائے کو علامت بنا کر اُنہوں نے پیار و محبت اور بھائی چارے کی ایسی مثال قائم کی کہ یہ کہانی ایک بہترین کہانی بن گئی۔ اس مجموعے میں شامل ہر کہانی بے مثال ہے۔ افسانہ نگار نے ایک حساس اور بڑے فنکار کا رول ادا کیا ہے۔ ہر کہانی میں اُن کا تجربہ، مشاہدہ اپنی پوری تخلیقی توانائی کے ساتھ اُن کے کرداروں میں موجود ہے۔ وہ بالکل اپنے کرداروں میں ایسے ڈوب جاتے ہیں کہ ایک ایک مکالمہ'' اس کردار کی جیتی جاگتی تصویر بن جاتا ہے۔ ''پمپوش'' اُن کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔

زنفر کھوکر:

زنفر کھوکھر کا تعلق تو جوری (جموں) سے ہے۔ ان کے تین افسانوی مجموعے ''کانچ کی سلاخ''، ''خوابوں کے اُس پار'' اور ''عبرت'' شائع ہو چکے ہیں۔

نعیمہ مہجور:

نعیمہ مہجور اپنی کہانیوں مس معاشرتی، سماجی اور اقتصادی موضوعات کو منفرد انداز میں پیش کرتی ہیں۔ لیکن بی بی سی اردو سروس سے وابستہ ہونے کے بعد وہ افسانوی ادب سے دور ہوتی جارہی ہیں اور سماجی اور سیاسی موضوعات میں زیادہ دلچسپی لینے لگی ہیں۔ لیکن اُن کا حال ہی میں تحریر کردہ ناول ''دہشت زادی'' بہت ہی دلچسپ ہے اور اس میں آج کے کشمیر کی تصویر کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی:

1999 عیسوی کے آخری ایام میں اُردو کے جن افسانہ نگاروں نے جنم لیا اور اپنے افسانوں کے ذریعے اپنی موجودگی کا احساس دلایا اُن میں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا نام بھی شامل ہے۔ اُن کے دو افسانوی مجموعے ''ہزاروں غم'' اور ''میٹھا زہر'' میں 12 کہانیاں شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر کہانیاں ملک کے مختلف رسائل میں میں شائع ہوچکی ہیں۔

طالب کشمیری:

طالب کشمیری کی اردو کہانیوں پر مشتمل ''شناخت گل'' 2009 عیسوی میں شائع ہوئی ہے۔ وہ طنز و مزاح میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ''شناخت گل'' میں طنز و مزاح سے بھر پور چار مضامین شامل کیئے گئے ہیں۔ ''شناخت گُل'' نامی افسانہ دراصل ایک انشائیہ ہے، ایک خوبصورت انشائیہ، پھولوں کی کہانی، پھولوں کے شناخت کی کہانی۔ وہ کہانی کے فن سے کما حقہ واقف ہیں بلکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ مختصر محدود کینواس میں واقعات اور تجربات کو کس حد تک سمونے کی گنجائش ہے اور انہیں موثر انداز میں کس طرح پیش کیا جاسکتا ہے۔

پرویز مانوس:

پونچھ کی ادبی زرخیزی کو قائم و دائم رکھنے کیلئے چراغ حسن حسرتؔ سے لے کر آج تک جن قلم کاروں نے آبیاری کی۔ اُن میں پرویز مانوسؔ کا نام بھی شامل ہیں۔ اُن کا افسانوی مجموعہ ''شکارے کی موت'' 1995 عیسوی میں منظر عام پر آچکا

ہے۔ پرویز مانوس نے اپنی افسانہ نگاری کی شروعات 1985 عیسوی سے کی۔ اُن کا پہلا افسانہ تھا ''احساس'' جو 1989 عیسوی میں ''ہند سماچار'' میں شائع ہوا۔ وہ اپنے افسانوں میں طبقاتی کشمکش اور معاشرتی مسائل کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں امن وسلامتی سے بھرپور ماحول کا خواب دیکھتے ہیں۔ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''مٹھی بھر چھاؤں'' ہے۔

میر ایوب:

''ٹھنڈی آگ'' میر ایوب میر کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو دسمبر 1993 عیسوی میں شائع ہوا۔ اس میں نو کہانیاں شامل ہے۔ 2007 عیسوی میں ان کا ایک اور افسانوی مجموعہ ''اور پھر ایک دن'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اس میں کئی کہانیاں شامل ہیں۔

ناصر ضمیر:

ناصر ضمیر اپنی کہانیوں کو مقامی رنگ دیتے ہیں۔ مقامی حالات کو پیش کرتے ہیں، مقامی کرداروں کی عکاسی کرتے ہیں۔ ''رمق، کرب، زار، واپسی، زوال کی دستک، کارِ جہاں نہ پوچھ، یہ گلستان ہمارا'' اچھے اور صاف ستھرے افسانے ہیں۔

ملک ریاض فلک:

ملک ریاض فلک ریاست جموں وکشمیر کے ایک نوعمر افسانہ نگار ہیں۔ افسانچے لکھ کر وہ قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔

انہیں افسانوی ادب میں متعارف کرانے میں روزنامہ ''کشمیر عظمیٰ'' نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔

آج جب ہم برصغیر کے اردو افسانہ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ہر طرح کے موضوعات ملتے ہیں۔ گلوبل وارمنگ کا مسئلہ ہو یا مصنوعی اعضا کی پلانٹیشن، جنسی استحصال ہو یا مغرب کی اجارہ داری۔ ترقی پسندی سے ہوتے ہوئے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے نظریات سے آنکھیں ملاتے ہوئے افسانہ اس قابل ہو گیا ہے کہ وہ خود اعتمادی سے کہیں بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔

موجودہ دور میں ریاست میں اردو افسانے میں جو کمی محسوس ہو رہی ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اصل میں سماج کی اردو زبان و ادب کے تئیں بے رغبتی اور ادبی سرمائے سے عدم آگاہی اور دوری کا مظہر ہے ورنہ افسانہ، مختصر اور موثر ہونے کے باعث اس وقت باقی نثری اصناف کے مقابلے میں مقبول ترین اور موزون ترین صنف سخن ہے۔

جموں و کشمیر میں افسانے کا یہ طویل سفر جو ایک صدی پر محیط ہے بڑا ثمر آور رہا ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں نے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔ جموں و کشمیر واحد ریاست ہے جہاں اردو سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے اُمید کی جاتی ہے کہ نئی نسل کے افسانہ نگار بھی اپنے مخصوص نقش چھوڑ کر جائیں گے۔

ریاست جموں و کشمیر میں اُردو ڈراما

(1947عیسوی کے بعد)

ڈراما کی نوعیت:

ڈراما کسی واقعہ کی داستان یا قصے کو عملی طور پیش کرنے کا فن ہے۔ یہ حرکت اور عمل کا نام ہے۔ ارسطو نے اس عمل کو نقل قرار دیا ہے۔ ڈرامے کو صرف ایک ادبی صنف کی حیثیت سے دیکھنا اور جانچنا غلط ہے۔ حالانکہ ہمارے بیشتر مصنفین کا یہی رویہ ہے اور ہماری درس گاہوں میں بھی ڈرامے کے مطالعے میں یہی نقطہ نظر رکھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ ناٹک کرنا ہماری معاشرت میں معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ ڈرامے کو خالص ادبی صنف کی حیثیت سے دیکھنا اور سمجھنا اس کی حدوں کو تنگ کر دینا اور کبھی کبھی گمراہ کر دینا ہے۔ ڈرامے کے ادبی پہلو کی بھی اہمیت ہے۔ لیکن صرف یہی پہلو اس کی خوبی کا معیار نہیں اور نہ اس کا سب سے اہم جز ہے۔ ایک عظیم ڈرامہ یقیناً ادب کا اچھا نمونہ ہوتا ہے۔

ڈرامے کی روح الفاظ نہیں عمل ہے۔ وہ پڑھنے کیلئے نہیں کھیلے جانے کیلئے لکھے جاتے ہیں۔ ارسطو کی مشہور تصنیف ''بوطیقا'' میں بھی المیہ (یعنی ڈراما) عمل کی

نقل کہا گیا ہے۔ ڈرامے کے حصوں میں بھی ایکٹ کا لفظ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس میں ادا کرنے یا دکھانے کی اہمیت بنیادی ہے۔ اچھے ڈراموں کو پڑھ کر بھی مسّرت لطف اور کیف حاصل ہوتا ہے اور ہر مصنف کی طرح ڈراما نگار کو بھی کتابی شکل میں اپنے ڈرامے کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ لیکن ڈرامے کو کھیلے جاتے دیکھ کر اُسے خوشی کے ساتھ ساتھ اکثر اس میں نئ وسعتیں، فکر وخیال کیلئے نیا مواد اور زندگی کے نئے رُخ نظر آجاتے ہیں جو پہلے سے اس کی نظر میں نہیں تھے۔ حقیقی ڈرامہ نگار صرف پڑھے جانے کیلئے ڈراما نہیں لکھتا۔ لکھنے کے وقت اُس کے اسٹیج پر ہوتے رہنے کا تصور ڈراما نگار کے پیش نظر ضرور ہونا چاہیے تا کہ اُس کی چشم تصور اپنے کرداروں کو اسٹیج پر چلتے پھرتے، ہنستے بولتے دیکھتی رہے۔ لکھنے کے وقت اگر اُس کے سامنے کوئی مخصوص اداکار بھی ہو تو بھی اُس کے ذہن میں اپنے کردار کی ایک خاص وضع ہونا چاہیے۔ اس کے بول چال کا انداز ہونا چاہئے۔ ساتھ ہی اسٹیج کی ضرورتوں، اس کی پابندیوں اور حدوں کا لحاظ اور زندگی کے ایک چھوٹے سے نمونے کا اسٹیج پر ہونے کا تصور ضروری ہے۔

ریاست میں اردو ڈرامے کی تاریخ:

ڈرامے کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے۔ تو یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ ہمارے ڈراما نگاری کی تاریخ پرانی ہے۔ زمانے قدیم میں ہمارے یہاں رقص کی محفلوں کا چلن رہا ہے جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح ڈرامے کے ساتھ ہے۔ کلہن نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''راج ترنگنی'' میں اندر پر بھار قاصہ کا ذکر خاص طور کیا ہے۔ یہاں

ریاست میں اُنیسویں صدی کے اواخر میں پہاڑی ڈرامے کے خدوخال صحیح معنوں میں اُبھرنے لگے جب راس لیلا کا چلن ہوا۔ 1889 عیسوی میں اردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ مختلف اصناف کی طرف توجہ دینے کے ساتھ ڈرامے بھی لکھے جانے لگے۔

مہاراجہ کی تاجپوشی:

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی تاجپوشی کے وقت ممبئی سے الفریڈ کمپنی کو جموں میں ڈراما پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ جموں میں پرانی منڈی کے علاقے میں ایک ڈراما کھیلا گیا جس کی مقبولیت دیکھ کر مہاراجہ بے حد متاثر ہوئے۔ اس طرح مہاراجہ نے اسی طرح کے ڈرامے سرینگر میں بھی پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

پارسی تھیٹر:

پارسی تھیٹر کی ہندوستان بھر میں دھوم تھی۔ ریاست میں اس کی تقلید میں جو تھیٹر کمپنیاں کام کرنے لگیں، اُن میں مہاراجہ کمپنی، رام ناٹک کمپنی، کشمیر تھیٹر اور سرسوتی ڈراما کمپنی وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ اس طرح سے ریاست میں باضابطہ طور پر تھیٹر کی شروعات ہوگئی۔ چنانچہ ڈرامہ نویسوں، پیش کاروں، اداکاروں کا طویل سلسلہ سامنے آیا۔ آغا حشر کاشمیری، بیتاب بنارسی، طالب بنارسی اور رونق بنارسی، مہدی حسن، احسن لکھنوی نے نہ صرف ڈرامے لکھے بلکہ اداکاری اور پیش کاری کے جلوے بھی دکھائے۔ انیسویں صدی میں طالب بنارسی اور احسن لکھنوی کی مساعی سے ڈرامے نے ادبی صورت نکھاری شروع کر دی تھی اس قسم کے ڈرامے کو بیسوی

صدی میں آغا حشر کاشمری اور پنڈت بے تاب نے زیادہ فروغ دیا۔ آغا حشر کاشمری نے احسن لکھنوی کا ڈرامہ ''چندراولی'' دیکھا کہ اتنے متاثر ہوئے کہ ایک طبع زاد ڈرامہ'' آفتاب محبت'' لکھ ڈالا۔ اُن کا پہلا مقبول ڈراما ''مرید اشک تھا''۔ اُن کے ڈرامے دیکھ کر ریاست کے فنکاروں میں بھی حوصلہ پیدا ہوگیا۔ آغا حشر کاشمری نے جو سبق آموز ڈرامے لکھے۔ اُن کو ریاست میں جگہ جگہ کھیلا گیا۔

محمد عمر نور الٰہی:

محمد عمر نور الٰہی کی ڈراما نگاری اُن کی تنقید کشمیر تھا۔ اُنہوں نے مولئیر، شلّر کے ڈرامے ترجمے کئے اور ''تین ٹوپیاں، ظفر کی موت، ہمہ خانہ آفتاب اور بگڑے دِل'' وغیرہ ڈراموں سے غیر تجارتی اسٹیج کی ضرورتیں پوری کی۔ اُن کی خوبی یہ تھی کہ اُنہوں نے غیر ملکی ڈراموں کی مقامی مزاج اور صورت عطا کردی۔ ریاست جموں وکشمیر میں ڈراما نگاری کو ترقی وفروغ دینے میں محمد عمر نور اِلٰہی کا نام سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُن کی تصنیف ''ناٹک ساگر'' اردو ڈراما نگاری میں مستند حیثیت رکھتی ہے۔ نور اِلٰہی نے بعض اچھے ڈراموں پر تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ ''ناٹک کتھا'' محمد عمر نور اِلٰہی کا اہم کارنامہ ہے۔ خاص کر ''ہمہ خاندان آفتاب'' اور ''آ بیل مجھے مار'' اُن کے چند اہم ڈرامے ہیں۔ محمد عمر نور اِلٰہی کا ''ناٹک ساگر'' ہی اہم کارنامہ ہے جو 1924 عیسوی میں لاہور سے شائع ہوا۔

خطہ کشمیر سے تعلق رکھنے والے ڈراما نگار، دیان ناتھ وارید، شاہد کاشمیری نے 1933 عیسوی کے آپاس ''رُکمنی ہرن'' ایک اچھا ڈرامہ لکھا۔ یہ ایک نیم مذہبی اور

نیم تاریخ ڈراما ہے جو اُس زمانے میں روزنامہ ''مارتنڈ'' سرینگر میں قسط وار شائع ہوا۔ جگدیش کنول کا ڈراما ''پردے کے پیچھے ، نرسنگھ داس نرگس کا تعارف اور ایم ،اے عزیز کا نوشہ تقدیر'' اُس دور کے اہم ڈراموں میں شمار ہوتے ہیں۔

1947 عیسوی کے بعد ریاست میں اردو ڈرامہ:

1947 عیسوی کے المیے سے کون واقف نہیں۔ ملک تقسیم ہوا۔ چاروں طرف فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوئے۔ ریاست کے ادیبوں ، دانشوروں اور فنکاروں نے اپنی احساسِ ذمہ داری کو پہچان لیا اور عوام کی فلاح و بہبود کیلئے کام کرنے لگے۔ امن و آشتی کو فروغ دینے کیلئے اُنہوں نے اپٹا (IPTA) یعنی انڈین پیپلز تھیٹر کی توسیع کی اور کلچرل فرنٹ کے نام سے ایک انجمن بنائی۔ چنانچہ ادیبوں، مصوروں، ڈرامہ نگاروں اور دوسرے فنکاروں کے الگ الگ شعبے قائم کئے گئے۔ اس تنظیم کے فنکاروں میں محمود ہاشمی، راج ہنس کھنہ، پریم ناتھ پردیسی، علی محمد لون، قیصر قلندر، دینا ناتھ نادم، پران کشور کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

پران کشور:

پران کشور کے ریڈیو ڈراما، اس کی ترتیب، نظم اور پیش کشی کے سارے فنّی لوازم پر اُنہیں اچھا عبور حاصل تھا اور کئی اچھے ڈرامے لکھے۔ ڈراما کی ہدایت کاری کا بھی انہیں تجربہ ہے۔ کلچرل فرنٹ کے شعبہ ڈراما کے وہ سربراہ رہے۔ اردو اور کشمیری دونوں میں اُنہوں نے ڈرامے لکھے ہیں اور ہدایت کاری کی ہے۔ مشہور کشمیری فلم ''مائزی راتھ'' مہندی رات کے ہدایت کاروں میں وہ شامل ہیں۔

پروفیسر محمود ہاشمی:

محمود ہاشمی زمانہ طالب علمی سے ڈراموں سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ پریم ناتھ پردیسی کی صحبت میں رہ کر انہوں نے اپنا کلچرل فرنٹ اور کلچرل کانگرس میں کافی کام کیا۔ اُن کے ڈرامے ''کشمیر یہ ہے، انارکلی کی واپسی'' اُن کے یادگار ڈرامے ہیں۔ ''کشمیر یہ ہے'' قبایلی حملے کے خلاف عوامی رائے عامہ ہموار کرنے اور قوم پرستی کے جذبے کو مضبوط کرنے کیلئے لکھا گیا ڈراما ہے۔

پروفیسر محمود ہاشمی کا مقبول ڈراما ''کشمیر یہ ہے'' کہ اصل میں ریاست میں نئے تھیٹر کا آغاز اِسی ڈرامے سے ہوتا ہے۔

ریڈیو ڈراما:

ریڈیو کو مختلف اوقات میں ممتاز ادیبوں کا تعاون حاصل رہا اور متعدد ایسے ڈرامے لکھے اور نشر کئے گئے جن کی ادبی حیثیت بھی مسلمہ ہے۔ اس قسم کے ڈراموں میں راجندر سنگھ بیدی کے ڈرامے ''خواجہ سرا اور چانکیہ''۔ محمود نظامی کا ''الف لیلیٰ کی رات'' ممتاز مفتی کا ''آپا'' جاوید اقبال کا ''غدار اور گردش'' خدیجہ مستور کا ''آخری لمحوں کا سکون اور کھڑکی'' احمد ندیم قاسمی کا ''داراشکوہ اور مصور'' رفعت سروش کا ''عروج آدم'' اوپندر اشک کا ''چرواہے اور آگرہ بازار'' چند ایسے ڈرامے ہیں جن کے عمل وصوت کا نقش اب تک لوگوں کے ذہن میں محفوظ ہے۔

اردو ڈرامے کو فروغ دینے میں جموں وکشمیر کے ریڈیو اسٹیشنوں کا بھی زبردست ہاتھ رہا ہے۔ ریڈیو جموں وکشمیر ریاست کا پہلا اسٹیشن ہے۔ اس کے بعد

کچھ عرصہ بعد ریڈیو کشمیر کام کرنے لگا۔ معروف ادیب اور فلمساز خواجہ احمد عباس کا ڈراما ''چودہ گولیاں'' اولین ڈراما ہے جو ریڈیو کشمیر سے نشر ہوا۔

علی محمد لون اور بنسی نردوش:

علی محمد لون کشمیر کی سماجی زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں کو اپنے ڈراموں میں اُبھارنے کی کوشش کی۔ اُن کے ڈراموں میں تکنیک کی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ بنسی نردوش کشمیر کے محنت کش عوام کی مفلسی، لاچاری اور بدحالی کو نہایت ہی شائستہ زبان میں پیش کرتے رہے ہے۔ لون کا ڈرامہ ''چراغ اور سائے'' اور ''آدمؑ حواؑ اور ابلیس''، بنسی نردوش کا ڈراما ''ایک رات کا مہمان'' دلچسپ ڈرامے ہیں۔

ان ڈراما نگاروں کے علاوہ نریندر کھجوریہ، وینو پائی پنت نے سماجی اور اصلاحی ڈرامے لکھے۔ نرہری رائے زادہ کا ڈراما ''پرانے دیپ نئے اجالے'' ایک اچھا ڈراما ہے۔ زیڈ سمی کا ایک دلچسپ ڈرامہ ''جہانگیر کی موت'' 1962 عیسوی میں نیا کشمیر پریس جموں سے شائع ہوا تھا۔ اس میں قومی یکجہتی اور حب الوطنی کے جذبات نمایاں ہیں۔

پشکر ناتھ:

پشکر ناتھ دورِ حاضر کا ایک ممتاز ڈرامہ نگار تھے۔ اُن کا پہلا ڈراما ''چندر مُکھی'' جو اُن کے ایک افسانے ''رازِ دِل'' پر مبنی تھا دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوا۔ ''ساون جلے بھادوں جلے'' اُن کا وہ ریڈیو ڈراما ہے جس پر اُنہیں آکاش وانی سے انعام بھی ملا۔ ''دِل کی وادیاں'' پشکر ناتھ کا ایک اور ریڈیائی ڈراما ہے جس پر اُنہیں

آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے منعقد کئے گئے ڈراموں کے مقابلے میں پہلا انعام ملا۔ ''جانے انجانے، گھر گھر کی کہانی اور سراب'' اُن کے دلچسپ ڈرامے ہیں۔ پشکر ناتھ کے ساتھ ساتھ نور شاہ کا نام لینا ضروری ہے۔ اصل میں وہ بھی پشکر کی طرح افسانہ نگار ہیں لیکن اُنہوں نے بعض فکر انگیز ڈرامے لکھے جن میں ''ویرانے کے پھول، دِل کی بستی، چاند کے پھول، دھواں نہیں'' لکھے اور افسانوں کی طرح ڈراما نگاری میں بھی اپنا لوہا منوایا۔

دوردرشن کا رول:

ڈراما نگاری کو فروغ دینے میں دوردرشن کا رول کسی سے کم اہم نہیں ہے۔ دوردرشن کے دونوں اسٹیشنوں جموں و کشمیر سے بے شمار ڈرامے ٹیلی کاسٹ ہوتے ہیں۔ جن میں اصلاحی ڈرامے بھی ہیں اور سماجی ڈرامے بھی۔ علی محمد لون، وجے سوری، آنند لہر، سوہن لال، شوکت شہری، نور شاہ، وریندر پٹواری جیسے ڈرامہ نگاروں کے ڈرامے ٹیلی کاسٹ ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

کلچرل اکیڈمی کا رول:

اس ادارے نے موجودہ دور تک بڑے ادبی اور ثقافتی کارنامے انجام دئے ہیں اور ریاست جموں و کشمیر کے بے شمار ادیبوں، ڈراما نگاروں، شاعروں اور فنکاروں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ یہ ادارہ سالہا سال سے زبان، ادباء موسیقی، رقص اور مصوری کے مختلف شعبوں کی آبیاری کرنے کے ساتھ ساتھ ڈرامے اسٹیج کرنے کے لئے مالی امداد فراہم کرتا ہے۔

ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے اپنی نگہداشت اور مالی کفالت سے دو ڈرامے ''جھیل بلا رہی ہے اور ٹیپو سلطان'' کے علاوہ اردو کے دو اوپیرا ''ہمالہ کے چشمے اور پیا باج پیالہ'' پروڈیوس کیئے اور بیرون ریاست جا کر کئی شہروں میں اُن کی نمائش کی اور داد تحسین حاصل کی۔ سجود سیلانی نے ریڈیائی ڈراموں اور دوردرشن کے سیریلوں کے علاوہ ڈھیر سارے اردو ڈرامے لکھے ہیں جن میں کچھ ریاستی کلچرل اکیڈیمی کے اشاعتی سلسلے کے طفیل منظر عام پر آچکے ہیں اُن میں ''گرگٹ کے رنگ، پتھر پگلتا ہے، لوہے کے چنے، سونے کی چڑیا، ساجھے کی ہانڈی، حیاتِ نو، آستین کا سانپ اور رائی کا پہاڑ'' شامل ہیں۔ مدن موہن شرما کے بھی کئی ڈرامے شائع ہو چکے ہیں اور وقتاً فوقتاً سٹیج پر کھیلے جاتے ہیں۔ سرینگر کے ٹیگور ہال میں اُن کا ایک ڈرامہ ''جانور'' پیش ہو چکا ہے۔ رام کمار ابرولؔ کا لکھا ہوا ناٹک ''انسان جیت گیا'' 1959 عیسوی میں شائع ہوا۔ سوہن لال کول بھی ڈراما لکھنے کے فن کے ساتھ ساتھ ترجمہ نگاری کے فن سے بھی واقف ہیں۔

عصرِ حاضر کے ڈرامہ نگار:

ڈرامہ نگار اشرف عادلؔ:

پچھلے کئی برسوں سے ہم ان کے ڈرامے ریڈیو کشمیر سرینگر اور دوردرشن کیندر سرینگر سے دیکھتے آ رہے ہیں۔ اشرف عادلؔ کے ڈراموں کا مجموعہ ''چاند کا ہم شکل'' اپنے اچھوتے موضوعات کے ساتھ ساتھ بہت ساری فنی و تکنیکی خوبیوں سے مالا مال ہے۔ موضوعات ایسے ہیں جو معلومات، اخلاقی تعلیم، سماجی حالات اور تفریح کے

بنیادی مقاصد کو پورا کر سکتے ہیں۔ ''زندگی کے آس پاس'' ایک سماجی ڈرامہ ہے۔ جس میں کمال الدین احمد کا مرکزی کردار ہے۔ ڈرامہ نگار نے ایک طرف ہماری ماڈرن سوسائٹی اور نیو کلچر فیملی سسٹم پر طنز کے تیر برسائے ہیں، تو دوسری طرف انہوں نے غم سے لڑنے یا خوشحال زندگی جینے کا ایک سماجی فلسفہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے اس مجموعے کا اہم ڈراما ''قاتل لمحے'' کے عنوان سے ہے۔ اشرف عادلؔ نے اس ریڈیائی ڈرامے کا موضوع (AIDS) ایڈس جیسا عالمی مسئلہ چُنا ہے۔ اس بیماری کے مرتکب ہم اپنی لاعلمی، بدقسمتی اور لاپرواہی سے ہی ہو جاتے ہیں۔

میرے خیال میں عصرِ حاضر میں جن ڈراما نگاروں نے اردو کی روایت کو آگے بڑھانے اور اس کو تقویت دینے میں پہل کی ہے، اُن میں وریندر پٹواری، آنند لہر، سوہن لال، نذیر جہانگیر، شوکت شہری اشرف عادلؔ اور مشتاق کاک کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

وریندر پٹواری کے موضاعات ریاست کے لوگوں کو غربت، پسماندگی اور سماجی نابرابری کے ہے۔ ''آخری دن'' اُن کے ڈراموں کا مجموعہ ہے جو 1984 عیسوی میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ مختصر یہ کہ ریاست میں اب اردو ڈرامہ کی طرف کم توجہ دی جا رہی ہے۔ کشمیر کی وادی میں تھیٹریکل اردو ڈرامے کس حد تک مفقود ہو چکے ہیں۔ اب ریاستی کلچرل کا فرض بنتا ہے کیونکہ اُن کے پاس وسائل ہیں۔ اسی لئے قلم کاروں کی نئی پود کو اردو سٹیج ڈرامے تخلیق کرنے پر راغب کر سکتی ہے۔

ہمارے یہاں ڈرامہ نگاری کے ساتھ ساتھ ڈراما کے نقاد بھی پیدا ہوتے ہیں۔ محمد عمر نور الٰہی، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر اکبر حیدری، پروفیسر ظہور الدین، پروفیسر شکیل الرحمٰن، ڈاکٹر راج پریمی، قیصر قلندر اور ڈاکٹر اسداللہ وانی قابل ذکر ہیں۔

جموں و کشمیر میں اُردو ناول کے خدوخال

(1947 عیسوی کے بعد)

اردو ناول:

ناول انگریزی زبان کا لفظ ہے اور انگریزی ادب کے زیرِ اثر اردو میں آیا۔ موضوع کے اعتبار سے دورِ حاضر میں ناول کی ایک سادہ تعریف یہ کی گئی ہے یہ ایک ایسا نثری حصہ ہے جس میں صنعتی عہد کے پسِ منظر میں فرد اور سماج کی کشمکش دکھائی گئی ہو۔ لیکن یہ تعریف یورپ کے ناولوں پر صادق آتی ہے۔ جہاں صنعتی انقلاب کے فوراً بعد فرد اور سماج کی کشمکش کے آثار پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی رونما ہوئے۔ اصل میں ناول کا فن ایک مخصوص نقطۂ نگاہ سے زندگی کی تصویر کشی کا فن ہے۔ اس میں غم و غصہ کی بھی تلخی ہوتی ہے اور اس میں عیش و عشرت کے بھی سامان ہوتے ہیں۔ ہر ناول نگار اپنے موضوع اور مزاح کے مطابق جذبات و احساسات کی عکاسی اپنے ناول میں کرتا ہے۔ بعض ناولوں میں طنز و مزاح کا غلبہ ہوتا ہے بعد میں خوشی کی فراوانی ہوتی ہے۔ اور بعد میں غم و یاس کی کثرت ہوتی ہے۔ ہر ناول نگار اپنی فطرت کے مطابق کسی ایک جزبے کے اظہار میں مہارت رکھتا ہے۔ ناول کا تعلق زندگی سے

ہے۔ انسان کے جذبات کی عکاسی کرنا ناول نگار کا پہلا فرض ہوتا ہے۔ انسان کی خوشی، غم اور کامیابی، ناکامی، امید یا اُس کے جذبات و پیش کرنا ہی ناول نگاری ہے۔ ناول نگار ان جذبات کو اپنے خاص نقطۂ نظر سے پیش کرتا ہے اور زندگی کے متعلق اپنے تجربات سے بھی ہم کو روشناس کرتا ہے۔ دراصل ناول نگار مفکر بھی ہوتا ہے اور مفسر بھی وہ زندگی کے متعلق فکر کرتا ہے پھر اس کی تفسیر لکھتا ہے۔

اردو ادب میں جس وقت ناول وجود میں آیا ہندوستان مختلف قسم کی تبدیلیوں سے دوچار تھا۔ لیکن یہ تبدیلی یورپ کی طرح صنعتی ترقی کا فطری نتیجہ نہیں تھی بلکہ وہ غیر ملکی سامراجی اقتدار کے زیر اثر سامنے آرہی تھیں اور بڑی حد تک اس عہد کی اصلاحی تحریکوں کا نتیجہ تھی۔ نذیر احمد بھی ان تحریکوں سے متاثر ہوئے تھے۔ چنانچہ اسی زمانہ میں ان کے ہاتھوں ناول کا آغاز ہوا اور 1860 عیسوی میں انہوں نے اپنا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' لکھا۔ اس کے بعد ان کے دوسرے ناول لکھے گئے۔ ناول کے یہ اولین نمونے جو نذیر احمد کے قصوں کی شکل میں وجود میں آئے۔ فن کے اعلیٰ معیار پر پورے نہیں اُترتے اور ان میں وہ بنیادی اوصاف نہیں ملتے جو ناول کے اجزائے ترکیبی کہے جاتے ہیں۔ ان واقعات میں وہ داخلی ربط و تسلسل نہیں ہے جو ناول کی جان ہوتا ہے نہ ہی کردار نگاری کے اعتبار سے ناول کے معیار پر پورے اُترتے ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر میں ناول کی روایت کوئی زیادہ پرانی نہیں۔ ناول کی روایت میں ہمارے پاس جو سرمایہ موجود ہے اس کا بیشتر حصہ 1947 عیسوی کے بعد کی پیداوار ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردوناول 1947 عیسوی کے بعد:

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کی تاریخ مختصر افسانہ کے بہ نسبت اس قدر روشن نہیں ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ریاست سے کوئی اخبار شائع نہیں ہوتا تھا۔ مغرب میں اور خود ہندوستان میں فکشن کی ترویج اور اشاعت کے سلسلے میں اخبارات اور رسائل کا نمایاں رول رہا ہے۔ اردو کے بیشتر ناول نگار مثلاً سرشارؔ، شررؔ، منشی پریم چندؔ، کرشن چندرؔ، عصمت چغتائیؔ، قرۃ العین حیدرؔ، کشمیری لال ذاکرؔ اور دوسرے بہت سے فنکاروں کے ناول عرصہ دراز تک اخبارات اور رسائل میں قسط وار چھپتے رہے ہیں۔ اودھ اخبار، اودھ پنچ، دلگداز جیسے رسائل سے لیکر شاعر، آج کل، بسویں صدی، نقوش، شاہراہ اور افکار تک کتنے ہی رسائل نے کتنے ہی ناولوں کو کتابی صورت میں شائع ہونے سے قبل اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔ منشی پریم چند کا پہلا ناول، اسرار معابد" بنارس کے ایک معمولی ہفت روز اخبار" آواز خلق" میں 18/ اکتوبر 1903 عیسوی سے یکم فروری 1904 عیسوی تک قسط وار شائع ہوتا رہا۔ ہمارے فنکار اُس وقت اس صنف کی طرف متوجہ ہوئے جب جموں خطے سے ریاست کا پہلا اخبار "رنبیر" شائع ہونے لگا۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے شروع میں سب سے پہلے ناول نگاری کی شروعات پنڈت سالگرام سالک اور مولوی محمد الدین فوقؔ نے کی۔ سالک رام سالک نے "داستان جگت روپ" اور "تحفہ سالک" تصنیف کر کے نثر کے اس شعبے کی طرف توجہ کی۔ اگر چہ یہ تصانیف قطعی طور پر ناول کے زمرے میں

شامل نہیں کی جاسکتی۔ داستان جگت روپ ناول سے زیادہ ایک داستان ہے اور اس میں پلاٹ در پلاٹ کی تکنیک کا التزام کیا گیا ہے اور کئی مقامات پر فوق الفطری عناصر کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ لیکن اس سے قبل ہمارے یہاں اس طرح کا کوئی نثری کارنامہ نظر نہیں آتا۔ اس قصے سے قطع نظر سالک نے ''تحفہ سالک'' ڈپٹی نذیر احمد کے ''مراۃ العروس'' کے تتبع میں لکھا۔ جس میں قصے کے پیرائے میں مختلف ممالک کے سمندری سفر کا ذکر کیا گیا ہے۔ جیسے سند باد اپنے سفر کی روداد سنا رہا ہو۔ اس سے بہتر کوشش مولوی محمد الدین فوقؔ کے یہاں ملتی ہیں۔ فوقؔ کی تصانیف ایک سو کے لگ بھگ ہیں۔ ان میں ان کے نثری کارنامے بھی شامل ہیں۔ نثری کارناموں میں کئی تواریخی اور نیم تاریخی قصے بھی ہیں۔ اس میں سے محض قصوں پر ناول نگاری کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ فوقؔ خود اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ ان کے قصوں میں خاص طور پر ''اکبر'' اور ''انارکلی'' نام کے دو تاریخی قصے ہیں جن کو ہم بیسویں صدی کے اولین ناول کہہ سکتے ہیں جو اردو میں لکھے گئے اور ایک ایسے شخص کے قلم سے نکلے جس کا تعلق جموں وکشمیر سے تھا۔ فوقؔ کا ناول ''انارکلی'' 1900 عیسوی میں لاہور سے شائع ہوا۔ یہ تاریخی ناول ہے۔ اس کے دیباچے میں مصنف نے لکھا ہے کہ اس ناول کا پلاٹ فرضی نہیں بلکہ اوریجنل ہے اور اکثر تواریخیں اس کی شاہد ہیں۔ اس کا پلاٹ ان کے ایک دوست نے چند انگریزی تواریخوں اور دیگر ذرائع سے انتخاب کر کے ان کو ناول لکھنے پر آمادہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ابھی امتیاز علی تاج نے اپنا شہرۂ آفاق ڈراما ''انارکلی'' نہیں لکھا تھا۔

فوقؔ نے کئی اور ناول لکھے۔ ان میں ''ناکام، ناصح مشفق، غریب الدیار، نیم حکیم اور اکبرؔ'' قابلِ ذکر ہیں۔ ''اکبر'' تاریخی ناولوں میں درجہ امتیاز رکھتا ہے، کیونکہ اس میں واقعات نسبتاً مستند ہیں۔ یہ ناول انار کلی کے دس سال بعد 1909 عیسوی میں لاہور سے شائع ہوا۔ فوقؔ کو اس بات کا یقین تھا کہ یہ ناول دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ کیونکہ لوگوں کو قدیم غیر حقیقی باتوں اور جنسی معاملات میں دلچسپی نہیں تھی۔ اُنہوں نے خود اس ناول کے دیباچے میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایسی کتابیں ملکی اور قومی بہبودی کے خیالات لیکر نکلیں گی وہ دلوں میں جگہ بنا لیں گی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب منشی پریم چندؔ (جو اُس زمانے میں نواب رائے کے نام سے لکھتے تھے) نے اپنے اولین افسانوی مجموعے ''سوز وطن'' کے دیباچے میں اور باتوں کے علاوہ لکھا تھا:

> ''ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کی جگہ پر حُب وطن کی عظمت کا نقشہ جمائیں''۔

یہ بات پہلے ہی صاف ہو چکی ہے کہ ریاست جموں و کشمیر سے کسی اخبار کی عدم اشاعت بھی ادب کے مختلف شعبوں کی طرف عدم توجہی کا ایک بڑا سبب بنی۔ لیکن جب جموں خطے سے ہفت روزہ ''رنبیر'' شائع ہونے لگا تو کئی لوگوں نے لکھنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ ناول جیسی صنف کی طرف بھی توجہ ہوئی اور اس اخبار کی مختلف اشاعتوں میں اپنے ناول قسط وار چھپوانا شروع کیے۔ اسی دوران پنڈت نند لال درِ بے غرضؔ نے اپنا ناول ''تازیانہ عبرت'' کے عنوان سے لکھا، جس کے کچھ حصے بعد

میں مقامی اخبارات میں شائع ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب صوبہ کشمیر سے بھی اخبارات نکلنا شروع ہوئے تھے اور ''وتستا، ہمدرد، اور مارتنڈ'' نے اپنی ایک ساکھ قائم کرلی تھی اور اس طرح سے ہماری صحافی روایات کا آغاز ہوا تھا۔ بےغرض کا یہ ناول رتن ناتھ سرشار کے ضخیم ناول ''فساد آزاد'' کے تتبع میں لکھا گیا ہے اور اس میں آغاز سے انجام تک فسانہ آزاد ہی کی طرح داستانی فضا کی چھاپ ہے۔

میرے خیال میں فوق اور سالگرام سالک کے بعد موہن لال مردہ اور وشواناتھ ورما نے ناول نگاری کی روایت میں توسیع کی۔ ڈاکٹر ظہور الدین جموں میں اردو نثر کا جائزہ لیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ موہن لال مردہ نے ''داستان محبت'' کے نام سے ایک ناول لکھا جو 1924 عیسوی میں شائع ہوا۔ وشواناتھ ورما نے ''تلاش حقیقت'' کے نام سے جو کتاب لکھی وہ قصے کی مہک سے مخمور ہے۔

> ''1947 عیسوی سے قبل کشمیر کے معروف افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی نے ''پوتی'' کے عنوان سے ناول لکھا۔ لیکن یہ ناول 47 کے ہنگاموں میں تلف ہوا''۔[1]

جموں کشمیر میں 1947 عیسوی کے بعد ہی ناول نگاری کے میدان میں پیش رفت ہوئی اور نئی نسل سے تعلق رکھنے والے فنکاروں نے اچھے اور کامیاب ناول لکھے۔ قبل ازیں نرسنگھ داس نرگس ''پاربتی'' اور ''نرملا'' جیسے قابل ذکر ناول پیش کر چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی نرسنگھ داس کے ہم عصروں کشمیری لال ذاکر اور ٹھاکر پونچھی نے اس میدان

---

[1] : جلوۂ صد رنگ، برج پریمی۔ ص ۱۹۷

میں قدم رکھا۔ اُنہوں نے یکے بعد دیگرے متعدد ناول لکھے اور بحیثیت ناول نگار اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ کشمیری لال ذاکر اور ٹھاکر پونچھی نے اس میدان میں قدم رکھا۔ پریم چند کا اندازِ فکر کا اثر ٹھاکر پونچھی پر گہرا پڑا۔ ''زندگی کے موڑ'' افسانوی مجموعہ کے علاوہ اُن کا ایک اور دلچسپ افسانوی مجموعہ ''چناروں کا چاند'' ہے۔

کشمیری لال ذاکر ناول نگاری کے میدان میں ایک ناولٹ ''سندور کی راکھ'' سے متعارف ہوئے۔ ان کے ناولوں میں ''جاتی ہوئی رُت، دھرتی، سدا سہاگن'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس دوران مدن موہن شرما، برک کیتال، اور ملک رام آنند نے بھی ناول کے فن کی جوت روشن کی۔ عبدالقادر سروری رقم طراز ہیں:

> ''ملک رام آنند کا پہلا ناول 'نئے خدا' 1958 عیسوی میں مرتب ہوا اور اس کے بعد دوسرے ہی سال ایک اور ناول 'دہکتے پھول شبنم آنکھیں' شائع ہوا۔ دو اور ناول 'صلیب اور دیوتا' اور 'اپنے وطن میں اجنبی' شائع ہوئے''۔ [۱]

برج کیتال نے ''چراغ بجھنے سے پہلے'' کے نام سے ناول لکھا۔ مدن موہن شرما کے ناول ''ایک منزل چار راستے'' اور ''پیارے کنارے'' کے نام سے شائع ہوئے۔ یہ سبھی ناول زندگی کی ناہمواریوں اور سماجی تفاقت کو پیش کرتے ہیں، تاہم صوبہ جموں کے لکھنے والوں میں جو اہم نام ہے وہ ٹھاکر پونچھی کا ہے۔ ٹھاکر پونچھی صحیح معنوں میں ناول کے فنکار ہیں۔ انہیں ناول کے فن پر بھی عبور ہے اور زبان و بیان

---

۱ : کشمیر میں اردو (تیسرا حصہ) پروفیسر عبدالقادر سروری: ص ۳۴۲۔

پر بھی دسترس حاصل ہے۔ وہ انسانی نفسیات کی باریکیوں کو بڑی چابک دستی سے پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ بڑی خوبصورتی سے دیہاتی و شہری زندگی کے معرقے پیش کرتے ہیں۔ اہم سماجی مسائل بھی اُن کی ناولوں سے جھلک رہے ہیں۔ ٹھاکر پونچھی کے ناولوں میں ''وادیاں اور ویرانے، یادوں کے کھنڈر، شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، زُلف کے سر ہونے تک' اُداس تنہائیاں، چاندنی کے سائے اور پیاسے بادل'' قابلِ ذکر ہیں۔

1960 عیسوی کے بعد کشمیر میں ناول:

کشمیر میں 1960 عیسوی کے بعد جو ناول نگار سامنے آئے ان میں تیج بہادر بھان، غلام رسول سنتوش، علی محمد لون، حامدی کشمیری، نور شاہ، شبنم قیوم، عمر مجید، وحشی سعید ساحلؔ، بھوشن لال بھوشن، رشید پروین، فاروق رینز و اور جان محمد آزاد نمایاں ہے۔ کشمیر میں اردو ناول کی ترویج و ترقی میں یہ فنکار سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر ناول نگار ایک دو ناول لکھ کر اس فن سے دست کش ہو گئے۔ اُنہوں نے سنجیدگی سے اس فن کو نہیں اپنایا بلکہ ایک آدھ ناول لکھنے کا شوق پورا کیا۔ حالانکہ ان فنکاروں نے اپنے کارناموں سے ثابت کیا ہے کہ وہ اس صنف میں کافی دور تک جانے کی بھر پور صلاحیت رکھتے ہیں۔

تیج بہادر بھان:

تیج بہادر بھان نے صرف ایک ناول ''سیلاب اور قطرے'' کے عنوان سے لکھا۔ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں لیکن ''سیلاب اور قطرے'' سے اُنہوں نے

ایک اچھا ناول نگار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اس ناول کے موضوع کشمیر کے درد سے لبریز معاشرتی زندگی ہے جو افلاس اور استحصال کی شکار ہے اور جس سے حکمران ٹولے کے استحصالی نظام نے پامال کر دیا ہے۔ تیج بہادر بھان نے اسے سیلاب کے پس منظر میں اُبھارا ہے۔ اُنہوں نے تاناشاہی کے چہرے سے بھی پردہ ہٹا دیا ہے۔

عبدالقادر سروریؔ اس ناول پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ ناول ایک اچھا حقیقت پسندانہ، بیانیہ اور کسی حد تک ایک نفسیاتی مطالعہ اور کشمیر کی فضا کے پس منظر میں ایک نچلے طبقے کی زندگی کے واقعات کے بیٹھ بٹھاؤ کا دلچسپ اور معنی خیز نقشہ بن گیا ہے۔

تیج بہادر بھاون کا افسانوی مجموعہ "جہلم کے سینے پر" ایک شاہکار مجموعہ ہے، جس میں کشمیر کا مخصوص ماحول ملتا ہے۔ دوسرا افسانوی مجموعہ "عورت" ہے۔ ان کے تمام افسانوں میں جموں و کشمیر کے عوام کی زندگی کا ہر پہلو بہت ہی موثر اور دِل نشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ "نئے کشمیر" میں نئی زندگی کی جھلکیاں دکھائی گئی ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ پرانی دنیا دم توڑ رہی ہے اور اُس کی جگہ ایک نئی دنیا جنم لے رہی ہے۔ "جہلم کے سینے پر" اور "عورت" دونوں افسانوی مجموعوں میں کالج کے نوجوان طالب علم اور طالبات، ہانجی، کاشت کار، ، مزدور، دوکاندار، سیاست دان غرض تمام نمائندہ طبقات کی زندگی کے معرقے آ گئے ہیں۔ تیج بہادر بھان کے سبھی افسانے 1947 عیسوی کے بعد کشمیر کی فضا میں لکھے گئے ہیں، جب کہ کشمیر میں عوامی طاقتیں برسرِ اقتدار آ چکی تھیں اور جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

حامدی کاشمیری:

ریاست کے نامور شاعر اور نقاد ڈاکٹر حامدی کاشمیری نے ابتداء میں افسانے اور ناول کو اپنایا۔ شاعری کے علاوہ وہ فکشن کی طرف اپنی توجہ مرکوز کئے ہوئے تھے۔ لیکن بڑی جلدی سے انہوں نے اپنے فکر و ہنر کی جولان گاہ تبدیل کر دی۔ اُنہوں نے شاعری اور تنقید کو اپنے فکر وفن کا مرکز محور بنالیا۔ تاہم اُنہوں نے اردو ناول ''پرچھائیوں کا شہر'' جیسا قابل قدر ناولٹ بھی دیا۔ حامدی کاشمیری نے جو ناول لکھے وہ ہیں ''بہاروں کے شعلے، بلندیوں کے خواب، پگھلتے خواب، اجنبی راستے''۔ ان ناولوں کے کینواس بہت ہی محدود ہیں۔ ان ناولوں میں رومان کی سحر انگیزی ہے۔ لیکن پس منظر میں کشمیر کی زندگی اور یہاں کا سیاسی، سماجی ماحول شدت کے ساتھ اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ یہی ان ناولوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ ''بلندیوں کے خواب'' میں حامدی کاشمیری نے کشمیر کی جو تصویر پیش کی ہے وہ انتہائی کربناک ہے۔ کشمیر کی غیر فطری تقسیم اور غیر منظری اور مصنوئی تجارت راستوں سے اہلِ کشمیر جن چیرہ دستیوں کے شکار ہیں ''بلندیوں کے خواب'' بڑی خوبی سے اسے پیش کرتا ہے۔ ''پرچھائیوں کا شہر'' ان کا اہم ناولٹ ہے۔ یہ ان کے فکر وفن کا ایک نیا موڑ بھی ہے۔ یہاں وہ داخلیت کے محشرستان میں قدم رکھتے نظر آتے ہیں۔ وہ انسان کے اندرون کے پیچیدہ مسائل کو اپنی فکر ورسا کا ہدف بناتے ہیں۔

علی محمد لون اور غلام رسول سنتوش:

علی محمد لون اور غلام رسول سنتوش نے اردو ادب کو ''شاہد ہے تیری آرزو''

اور ''سمندر پیاسا ہے'' جیسے ناول دیئے۔ سنتوش کا اصل میدان مصوری ہے۔ ''سمندر پیاسا ہے'' ان کا واحد ناول ہے۔ اس ناول میں سنتوش نے بڑی بے رحمی کے ساتھ انسان کے باطن میں موجود ہوس ناکی اور زہرناکی کو ابھارا ہے۔ یہاں زندگی ایک روگ کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ اس روگ نے حاجرہ، شکنتلا اور کلپنا جیسی کتنی ہی زندگیوں کو دیمک کی طرح چاٹ لیا ہے۔ یہ روگ انسان کے باطن میں پرورش پاتا ہے۔ یہ خود غرضی، بولہوسی اور لذت پرستی کا روگ ہے۔ ٹھاکر پونچھی اس ناول کے تعارف میں لکھتے ہیں:

> ''سمندر پیاسا ہے'' ایک دریا کی کہانی ہے جو بھٹکی بھٹکی چھوٹی چھوٹی سی ندیوں کو اپنے سینے سے لگائے ان کی منزل کی جانب بڑھنے کی جستجو میں لگا ہے، کیونکہ اس میں اس کی محبت کی تکمیل ہے۔ سنتوش، انسانی نفسیات اور سیاسی و سماجی باریکیوں اور لغزشوں پر گہری نظر رکھتا ہے''۔[1]

علی محمد لون نے ڈرامہ نگار کی حیثیت سے نام کمایا۔ اُنہوں نے افسانے بھی لکھے اور دہلی میں دورانِ ملازمت ''شاید ہے تیری آرزو'' کے نام سے ایک ناول بھی لکھ ڈالا۔ عبدالقادر سروری کے مطابق یہ اُن کے قیام دہلی کے زمانے کی مشاہدات اور تجربات کی پیداوار ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے اور سٹیٹ کلچرل کانفرنس سے منسلک رہے اور اس کے ترجمان ''کونگ پوش'' کی ادارت کے فرائض

---

[1] : تعارف۔ سمندر پیاسا ہے ٹھاکر پونچھی۔ ص ۷ تا ۸

بھی اُنہوں نے انجام دیئے۔ لیکن ترقی پسندی کی شعوری تحریک اور نعرہ بازی کے اثر سے اُنہوں نے اپنی تخلیقات کو ہمیشہ بچائے رکھا۔ ادب کو وہ ایک آفاقی چیز مانتے ہیں اور زندگی سے اس کے گہرے رشتوں کی بھی آگہی رکھتے ہیں۔ جدیدیت کے موجودہ رجحان کو بھی وہ ایک نعرہ بازی سمجھتے ہیں۔

نورشاہ:

نورشاہ نے ناولٹ میں شاعرانہ اسلوب اختیار کیا ہے۔ اگرچہ ناولٹ کیلئے شاعرانہ اسلوب اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے لیکن شاہ صاحب کی تحریروں کی چاشنی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جب تخلیق کار ایسا طریقہ اختیار کرتا ہے جو قاری پر گراں نہیں گزرتا ہے تو ایسا طرز اسلوب اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔

''آوسو جائیں'' ناولٹ میں نورشاہ نے ایک خاص ماحول اور اس ماحول میں رہنے والے کرداروں کی نقاب کشی اپنے منفرد ڈھنگ سے کی ہے۔ یہ ناولٹ شاعر ممبئی کے ناولٹ نمبر 1947 عیسوی میں شائع ہو چکا ہے۔ دوسرے ناولٹ ''لمحے اور زنجیریں'' اور ''آدھی رات کا سورج'' قسط وار شائع ہو چکے ہیں۔ نورشاہ کی تینوں ناولٹ 2009 عیسوی میں کتابی صورت میں شائع ہوئی ہیں۔ شاہ صاحب کے ناولٹ نورشاہ کے افسانوں میں زخم خوردہ دلوں کی دھڑکنیں ملتی ہیں۔ اُن کے افسانوں کے چار مجموعے ''بے گھاٹ کی ناؤ، ویرانے کے پھول، من کا آنگن اُداس اُداس، اور ایک رات کی ملکہ'' دلچسپی سے پڑھے اور پسند کئے جاتے ہیں۔ ''بے گھاٹ کی ناؤ'' میں دس افسانے شامل ہیں۔ ''ویرانے کے پھول'' میں بارہ

افسانے، ''من کا آنگن اُداس اُداس'' میں چھ افسانے شامل ہیں اور ''ایک رات کی ملکہ'' گیارہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ اُن کے افسانے ''ہمارا ادب'' رسالہ میں چھپتے رہے اور ملک کے مشہور رسالوں میں اُن کے افسانے شائع ہوئے۔ کہانی لکھنے میں انہیں نہ صرف ذوق ہے بلکہ سلیقہ اور اچھا سلیقہ ہے۔ انہیں مظلوم اور مفلوک انسانوں سے ہمدردی ہے۔ اکثر افسانوں میں انسان دوستی کے جذبے کا کام لیتے ہیں۔

کشمیری لال ذاکر:

کشمیری لال ذاکر جدید اردو ادب کا ایک قد آور ناول نگار، افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار ہیں۔ اُن کا جنم 7/اپریل 1919 عیسوی میں کشمیر میں ہوا۔ اُن کے آباؤ واجداد کا تعلق گجرات (پاکستان) سے تھا مگر ان کے والد بسلسلہ ملازمت پہلے پونچھ اور پھر کشمیر آئے تھے۔ جہاں ذاکر کا جنم ہوا۔ کشمیر میں ہی ذاکر نے سرینگر کے مشہور اسکول ایس، پی اسکول میں اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کرلی۔ اُنہوں نے اپنے جذبات، احساسات اور تجربات کا اظہار کہانیوں کے ذریعے بیان کرنا شروع کیا۔ اُنہوں نے اپنا پہلا افسانہ ''سینی ٹوریم'' 1943 عیسوی میں لکھا۔ جس کی اشاعت رسالہ (ہمایوں) لاہور میں ہوئی۔

اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''جب کشمیر جل رہا تھا'' اور اُن کا پہلا ناولٹ ''سیندور کی راکھ'' ہے۔ ''سیندور کی راکھ'' اُن کا سوانح ناول ہے جو اُنہوں نے اپنی بیوی شیلا دیوی کو خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے لکھا ہے۔ اس ناول کے بعد اُن کے

دو ناول ''چھٹی کا دودھ'' اور ''میرا گاؤں میری زندگی'' ہے۔ 1965 عیسوی میں شائع ہوئے اور 1976 عیسوی میں ناول ''مجھے جینے کا حق مل گیا'' اور ''انگوٹھے کا نشان'' شائع ہوا۔

''آدھے چاند کی رات'' کشمیری لال ذاکر نے کشمیر کے پسِ منظر میں لکھا ہے۔ یہ ناول 1996 عیسوی میں شائع ہوا۔ ناول میں اُنہوں نے کشمیر کی مختصر تاریخ کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کے ان واقعات کا بیان کیا ہے جب وہ کشمیر کی مشہور سیاسی پارٹی نیشنل کانفرنس کے ساتھ وابستہ تھے۔ دراصل یہ ناول کشمیر کے پسِ منظر میں ان خاص حالات پر مبنی ہے جو 1931 عیسوی سے لے کر 1992 عیسوی تک یہاں رونما ہوئے۔ ڈوگرہ راج سے چھٹکارا پانے کے بعد شیخ محمد عبداللہ ایک ہر دلعزیز لیڈر بن جاتا ہے اور پھر قبائیلی حملے کے بعد کشمیر کا الحاق ہندوستان کے ساتھ کرتا ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب یہاں کے حالات بد سے بدتر ہو جاتے ہیں۔

کشمیر کی تباہ حالی اور اقتصادی بحران کے بارے میں ڈاکٹر اپنے ناول میں اس طرح رقمطراز ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

> ''سرینگر تو اب اُجڑ چکا ہے، کوئی بھی خوبصورت پہلو نہیں رہا وہاں ہر طرف قتل اور بارود اور اغوا کی باتیں ہوتی ہیں۔ کیا ہو گا ہماری خوبصورت وادی کا؟...... اب تو ٹورسٹ نام کا کوئی نہیں تھا۔ وادی میں نہ کوئی ہاؤس بوٹ کرائے پر چڑھ رہا تھا، نہ کوئی شکارا ٹورسٹ کو ڈل کی سیر کرا رہا تھا۔ خوبصورت جھیل چشمہ شاہی کا

ٹھنڈا زندگی بخش پانی بیکار بہہ بہہ کر برباد ہو رہا تھا۔ ایک چلو پانی
پینے والا بھی کوئی نہیں تھا''۔

یہ ناول پڑھ کر ایسا محسوس ہتا ہے کہ ذاکر کو وادی کشمیر سے جو محبت ہے اسی محبت نے یہ ناول لکھنے پر اُنہیں مجبور کر دیا۔ اس ناول میں کشمیر کے حالات کے علاوہ کشمیر کی تاریخ کا بیان بھی کیا ہے اور یہاں کی مہمان نوازی، قومی یکجہتی، یہاں کے تاریخی مقامات اور خوبصورتی کا بھی ذکر کیا ہے۔ کہیں کہیں سماجی بے اعتدالی اور بے راہ روی پُر دردمندی کے ساتھ طنز کیا ہے۔ اُن کی نگاہیں ماحول کی پُر فریب سطح کو چیر کر تہہ میں حقیقت کو ڈھونڈتی ہیں اور کامیابی کے ساتھ مطلوبہ تاثیر اُبھارتی ہیں۔

بھوشن لال بھوشن:

بھوشن لال بھوشن ''بٹہ گنڈ'' کشمیر کے متوطن ناول لکھنے کا ذوق رکھتے ہیں۔ ایک ناول ''صرف پانچ ہزار'' کے عنوان سے تصنیف کیا ہے جس میں امیری اور غریبی کی تفاوت سے پیدا ہونے والی برائیوں کو ایک غریب مزدور رام داس اور اس کے لڑکے جیون اور نوعمر لڑکی گلوبی کی زندگی کے بیانہ کے ذریعے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ خاکہ بڑی ذہانت سے تعمیر کیا ہے، لیکن فنی اعتبار سے وہ بہت اونچا نہ اٹھ سکا۔ امیر اور غریب کی کشمکش کے نئے موضوع کو ابھارتے ہوئے اتفاق حادثہ کیلئے کسی کارنامہ میں جگہ نہیں ہوتی اور ان کو شامل کر کے مصنف نے اس سے صحافتی انداز کا ناول بنا دیا۔

وجے سوری:

وجے سوری جموں کے نوجوان ادیبوں کے حلقے کی ایک نمایاں شخصیت ہے۔ افسانہ اور ناول دونوں اصناف میں اُن کے کارنامے موجود ہیں۔ ان کا خاندان اصل میں میر پور کا متوطن تھا۔ تقسیم ملک کے بعد خاندان جموں میں بس گیا ہے۔ وجے سوری 1942 عیسوی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم جموں میں پائی۔ اس کے بعد سانگ اینڈ ڈراما کے شعبے میں نوکری بھی کی۔ اُن کے افسانے ''تخلیق، چرا، پرواز، پرتاب'' بڑے دلچسپ افسانے ہیں۔ افسانوں کا مجموعہ ''آخری سودا'' کے عنوان سے مرتب کر کے 1963 عیسوی میں شائع کیا۔

سوری کا ناول ''ایک ناؤ کاغذ کی'' کالج کے ایک نوجوان طالب علم پال اور اس کی ہم جماعت طالبہ جوالا کی محبت کا رومان ہے۔ پال مفلس ادیب، جوالا ایک دولت مند کی بیٹی۔ ظاہر ہے شادی نہیں ہوسکتی تھی۔ دونوں بھاگ کر کلکتہ جاتے اور شادی رچاتے ہیں۔ لیکن جوالا کا باپ اُنہیں کلکتہ سے پکڑ لاتا ہے اور پال کو اغوا کے الزام میں سزا ہوئی اور جوالا کی شادی پال کے ایک دھوکہ باز دوست درشن سے طے پاتی ہے۔ لیکن جوالا خودکشی کر کے داستان کو ختم کر دیتی ہے۔

کرشن چندر کا ناول ''میری یادوں کے چنار''

افسانوں کے علاوہ کرشن چندر نے بے شمار ناول بھی لکھے ہیں۔ ان کے ناول میں بھی اُن کی فکر، مشاہدہ اور تخیل کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ تاہم ان کے ناول کا پس منظر بہت وسیع نہیں ہوتا ہے اور نہ اُنہوں نے اب تک کوئی ایسا ناول لکھا جس

سے عظیم کہا جا سکے۔ ان کے زیادہ تر ناول ان کے افسانوں کی ایک زیادہ وسیع اور پھیلی ہوئی شکل ہے۔ اُن کا پہلا ناول ''شکست'' ہے۔ اس کے بعد اُن کے دیگر ناولوں میں ''جب کھیت جاگے، مشینوں کا شہر ، طوفان کی کلیاں، ہمارا گھر، پانچ لوفر، آسمان روشن ہے، اور میری یادوں کے چنار'' مشہور ناول ہیں۔

کرشن چندر کا اسلوب شاعرانہ ہے مگر وہ طنز و مزاح سے بھی بہت کام لیتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں اُن کے افسانوں کی طرح طنز و مزاح کی بہتات ہے۔ مطالعہ وسیع ہے، جسے اپنے بلند تخیل اور فکر کی مدد سے وہ سماج کے ہر طبقے کی نفسیات سے آگاہ نظر آتے ہیں۔ مہاجن، ساہوکار، سود خور، مذہبی پیشوا، سماجی رہنما، حکومت کے وزیر سب انکے طنز و مزاح کے شکار ہوتے ہیں۔

''میری یادوں کے چنار'' اور ''مٹی کے صنم'' دونوں ناول کرشن چندر کے بچپن کی یاداشتوں پر مبنی ہیں۔ کرشن چند کے باپ کشمیر کی ایک دیسی ریاست کے ڈاکٹر تھے۔ ڈاکٹر صاحب ایک نہایت رحم دل اور وسیع القلب انسان تھے۔ مصنف نے ''میری یادوں کے چنار'' میں اپنے بچپن کی اُن یاداشتوں کے ذریعے دیسی راجاؤں کے مظالم اور کشمیر میں موجود طبقاتی درجہ بندی کا نقشہ کھینچا ہے۔ کرشن چندر نے دکھایا ہے کہ سماج میں نیچ اور بے عزت کہلانے والے لوگ اصل میں کتنے ایماندار، محنتی اور وفادار ہوتے ہیں۔ اس جاگیردارانہ ماحول میں ان لوگوں کو زندگی کے ہر شعبے میں آگے بڑھنے سے روکا جاتا ہے۔ لیکن اُنکا المیہ یہ ہے کہ یہ ظالم کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ یہ وادی کشمیر ایک طرح کا محفوظ جنگل تھی جس میں باہر کی

تبدیلیوں اور سیاسی تحریکوں کی ہوائیں کم ہی گزرتی تھیں، لیکن کانگریس اور لیگ کا نظریاتی اختلاف اور ہندو مسلم تعصب کی ہوائیں یہاں بھی پہنچ جاتی ہیں اور فضا کو آلودہ کرنے لگتی ہیں۔

''میری یادوں کے چنار'' میں جہاں جاگیرداری نظام میں مقامی راجاؤں اور ان کے اہلِ کاروں کے جبر و استحصال کے نمونے سامنے آتے ہیں وہیں غریب و معصوم کی انسان دوستی، نیک نفسی اور اطاعت گزاری کی مثالیں بھی سامنے آتی ہیں۔

کرشن چندر کے فن کی عالم گیرت ارر علاقائی و مذہبی تعصّبات سے اپک ذہنیت کے ہمراہ کبھی کبھی ان کے آبائی وطن کشمیر کے سبزہ زاروں کی یادیں، ان کی تعلیم گاہ لاہور کی گلیاں، انارکلی کی بھیڑ اور راوی کا کنارہ، اُن کے دِل کو مضطرب کردیتے ہیں۔ جس کے تحت وہ ''مٹی کے صنم''، ''میری یادوں کے چنار'' اور دیگر بہت سے فن پارے تخلیق کرتے ہیں۔

ڈاکٹر خالد اشرف ''برصغیر اردو ناول'' میں ایک جگہ ''میری یادوں کے چنار'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اس کی فضا کشمیر کے گاؤں کی پر سکون اور سادہ زندگی پر مبنی ہے، یہ وہ دور ہے جب مطالبہ پاکستان کی آواز شمالی ہند میں گونجنے لگتی تھی اور صدیوں سے ایک دوسرے کے دُکھ درد بانٹنے والے ہندو مسلمان اور سکھ اب باہمی نفرت اور شک کا شکار ہونے لگے تھے''[1]

---

[1] برصغیر میں اردو ناول۔ ڈاکٹر خالد اشرف ۔ ص ۲۵۴

موجودہ دور کے ناول نگار:

نئی نسل کے ناول نگاروں نے نہ صرف عصری سماجی مسائل کو اپنا موضوع خاص نہیں بنایا بلکہ اس روح کے درد کو گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے جو آج کے انسان کی تقدیر ہے۔ وہ مقامت سے ماورا ہو گیا ہے۔ عمر مجید کے دو ناول ''یہ بستی یہ لوگ'' ''درد کا دریا''، رشید پروین کے دو ناول ''دل اور دیا''، ''پیاسی پایل''، اور وحشی سعید ساحلؔ کے ناول ''خون اور محبت''، ''منزل اور تلاش''، اور ''قحط'' منظر عام پر آئے۔

ان ناول نگاروں کو اپنا ایک الگ لکھنے کا انداز ہے۔ یہ کہیں رومان کی دھند لپٹی فضا کو پیش کرتے ہیں اور کہیں سماجی نابرابری سے پیدا شدہ مسائل کو اُبھارتے ہیں۔ ان میں عمر مجید اپنے گردو پیش کی زندگی کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ ان کے تجربے احساس کی آنچ سے پگھل کر لفظ و بیان میں ڈھل جاتے ہیں۔ انہیں کشمیری عوام کی زندگی کا قریبی مشاہدہ ہے۔ پچھلے برسوں میں ناول نگاری کے فن میں جو باصلاحیت فنکار سامنے آئے ہیں ان میں عمر مجید کے علاوہ شبنم قیوم، جان محمد آزاد کے چار ناول شائع ہوئے۔ ''وادیاں بلا رہی ہیں''، ''ظلمات کے ہم سفر''، ''کشمیر جاگ اُٹھا'' اور ''برفیلے لمحوں کا جنگل''۔ ''وادیاں بلا رہی ہیں'' اُن کا پہلا ناول ہے۔ اس کے پیش لفظ میں حامدی کاشمیریؔ نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

> ''اس ناول میں زندگی کی دہشت خاکی کے بجائے رومانی آرزومندی کے دلکش رنگ ملتے ہیں۔ یہ بات باعث اطمینان ہے کہ آزاد صاحب نے پہلی ہی کاوش سے تخلیل آرائی، منظر

نگاری، جذباتی کیفیات کی مصوری اور زبان و بیان کی حسن کاری
سے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بین ثبوت فراہم کیا ہے''[1]

عمر مجید، شبنم قیوم، جان محمد آزاد اور فاروق رینزو میں ایک بات قدرے مشترک ہے کہ یہ سبھی کشمیر کے ساتھ، اہل وطن کے ساتھ گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ یہ ناول نگار کشمیریوں کی زندگی کے درد و داغ کو پیش کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں نے جو چرکے کھائے روحوں اور دلوں میں جو گھاؤ لگے ہیں اُنہیں یہ فنکار مقدور کے مطابق اپنے فن میں سمونے کی کوشش کرتے ہیں۔ شبنم قیوم سیاسی حکمرانوں کے چہروں پر پڑے پردوں کو بڑی بے باکی کے ساتھ چاک کر دیتے ہیں۔ ''موت اور زندگی'' اور ''یہ کس کا لہو ہے کون مرا؟'' اس قبیل کی ناول ہیں۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہئے کہ شبنم قیوم نے دیگر مسائل سے آنکھیں چرالی ہیں۔ ''چراغ کا اندھیرا''، ''انسان اور کتے'' اور ''جس دیس میں جہلم بہتی ہے'' زندگی کے درد، تڑپ اور ظلم و استحصال کو پیش کرتے ہیں۔ فاروق رینزو نے بھی اپنا سفر افسانی نگاری سے شروع کیا۔ ''زخموں کی سالگرہ'' اور ''کشمیر جھیل جلتی ہے'' اُن کے قابلِ ذکر ناول ہیں۔ ''زخموں کی سالگرہ'' 1982 عیسوی میں منظر عام پر آئی تھی۔ فاروق رینزو نے اس ناول میں نئی نسل کی ناآسودگیوں، محرومیوں اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ نفسیاتی الجھنوں کی فنی چابک دستی کو پیش کیا۔ ''کشمیر جھیل جلتی ہے'' ان کا تازہ ترین ناول ہے۔ یہ ایک سماجی اور اصلاحی ناول ہے جس میں مصنف نے فریب، ریا، لالچ اور

---

[1] وادیاں بلا رہی ''جان محمد آزاد۔ پیش لفظ حامدی کاشمیری

بے چہرگی کی مکروہ پہلو خاص طور سے ابھرتے ہیں۔ اس ناول میں مصنف کے لب و لہجے میں زبردست تلخی گھلی ہوئی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار جمال ابتداء میں اپنا تعارف اس طرح کراتا ہے:

''جمال کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ زبان بھیڑیئے کی طرح باہر لٹک رہی تھی، سرخ زبان سے ٹپکتی خون کی تپش سے سفید جھاگ میں تبدیل ہو چکی تھی، وہ پھر اژدھے کی طرح پھنکار اُٹھا۔ لوہے کی سفید کلہاڑی ایک بار پھر ہوا میں چمکی'' [1]

اسی طرح ڈاکٹر قمر جہاں ''کشمیر جھیل جلتی ہے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''جمال اس ناول کا سب سے نمایاں کردار ہے۔ وہ آج کے جوشیلے نوجوان کی تصویر ہے جس نے بغاوت اور انتقام کی آگ میں خود اپنی ہستی کو مٹا دیا۔ جمال نے قتل و خون کے ساتھ کچھ نیک کام بھی کیے ہیں۔ اس طرح فاروق صاحب نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ بُری سیرت سب کیلئے بُری نہیں ہوتی۔ انسان وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت بنتا اور بگڑتا ہے''۔

جان محمد آزاد نے اردو ادب میں تین قابلِ ذکر ناولوں کا اضافہ کیا ہے۔ جن میں ''کشمیر جاگ اُٹھا''، ''وادیاں بلا رہی ہیں'' اور ''برفیلے لمحوں کا جنگل'' شامل

---

[1] ''کشمیر جاگ اُٹھا'' ۔ ڈاکٹر محمد زماں آزردہ تعارف

ہیں۔ان کا نیا ناول ''شہر ملا دِل کے ہم سفر'' بھی ایک کامیاب ناول ہے۔ مصنف کو ناول کے فن پر مکمل دسترس حاصل ہے۔ان کا اسلوب اور لب ولہجہ بھی چونکا دینے والا ہے۔وہ کہانی کا گُر جانتے ہیں اور اپنے گردوپیش سے اپنے ناول کا تانا بانا بنتے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ جان محمد آزاد کے اسلوب پر کرشن چندر کا زبردست اثر ہے۔
ڈاکٹر محمد زماں آزردہ نے ان کے بارے میں بجا طور پر لکھا ہے:

''مصنف (جان محمد آزاد) کو اپنے مادرِ وطن کشمیر سے بے پناہ محبت ہے اور یہی محبت ان سے لکھواتی ہے، وہ عام لکھنے والوں کی طرح سے اپنے پیش رووٴں کی نقالی نہیں کرتے، بلکہ اپنی محبت سے مجبور ہو کر اپنے لئے اس کی تکمیل کا راستہ خود تلاش کرتے ہیں۔وہ اپنا ایک اندازِ سفر رکھتے ہیں اور اپنے جادۂ شوق کی تراش خراش کرتے ہوئے وہ خود آگے بڑھتے ہیں''۔

ڈاکٹر حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

''جان محمد آزاد بیدار ذہن کے مالک ہیں۔وہ گہرے شعور کے ساتھ اپنے گردوپیش کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں۔بنیادی طور پر وہ ایک شاعر کے نازک احساس، خواب آفرینی اور نازک مشاہدے سے آراستہ ہیں۔لیکن اُن کا ذہن معاشرتی، تاریخی اور سیاسی حالات کے تجزیئے پر اصرار کرتا ہے''۔

جان محمد آزاد نے اس ناول میں تحریکی اور طلسماتی فضا پیدا کی ہے۔یہ اُن

کے حیرت زا اسلوب کا ہی کرشمہ ہے۔ ''برفیلے لمحوں کا جنگل'' اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ جان محمد آزاد اگر جاسوسی ناول لکھنا شروع کردیں تو معرکے کے جاسوسی ناول لکھ سکتے ہیں۔ جان محمد آزاد اس شاداب اور رسیلے اسلوب میں ادبی ناول پیش کریں تو بہتر ہے۔ ناول نگاری کے ضمن میں ان سے کافی توقعات وابستہ ہیں۔ وہ بلاشبہ ایک منجھے ہوئے ناول نگار ہیں۔ کشمیر میں لکھے گئے ناولوں کا قابل ذکر سرمایہ موجود ہے۔ کشمیر میں ہمارے ناول نگار گہرے شعور کے ساتھ اپنے گردوپیش کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ انسانی نفسیات اور سیاسی سماجی باریکیوں اور لغزشوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ یہاں کی زندگی کے متنوع رنگوں کے فن کار ہیں۔ کشمیری عوام کی زندگی، اُن کے جذبات، اُن کے رنج وغم، اُن کی مسرتوں، اُن کی تمناؤں اور خواہشات کے کتنے ہی معرقے ہماری وادی گلپوش کے ناولوں میں جابجا ملتے ہیں۔

رخسانہ تبسم:

رخسانہ تبسم کا ناول ''خواب حقیقت'' نہ صرف ضاع کے مضبوط کردار کے محور میں گھوم رہا ہے، بلکہ اس ناول نے سماج میں موجود اُن چہروں کو بے نقاب کیا ہے، جو حکومت کی پستی کا فائدہ اٹھا کر اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں۔ جنہوں نے سڑکوں پر ناجائز قبضے جمائے۔ جنہوں نے کشمیر کی خوبصورتی کو برباد کرکے اپنا بھرپور کردار نبھایا، جو غریب کو روندنا جانتے ہیں۔ اس ناول میں وہ چلتی پھرتی بسیں بھی نظر آرہی ہے۔ جہاں صرف چند پیسوں کی لالچ کیلئے انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح لادا جاتا ہے۔ اس ناول میں پولیس کے وہ آفیسر بھی نظر آتے ہیں جنہیں یہ نہیں معلوم کہ سماج

کو کیسے صاف ستھرا بنایا جائے۔ اس ناول میں مریضوں کے ساتھ ڈاکٹروں کے اُس سلوک کی جھلک بھی ملتی ہے جہاں قصائی اور بھیڑ کے رشتے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

ترنم ریاض:

ترنم ریاض کی پہلی اور آخری کوشش کہانی لکھنے کی ہوتی ہے۔ جادو جگانے میں انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ کہانی، پلاٹ، کردار، واقعہ نگاری جزئیات نگاری اور ڈرامائی کشمکش کا وہ پورا خیال رکھتی ہیں۔ اس مقصد کیلئے اُنہوں نے بیانیہ بھی وہی پسند کیا ہے جو حقیقت کے قریب ہو اور جس میں نثر کا حسن ہو۔ ترنم ریاض کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے انسانی تعلقات کے افسانے کو زندہ کیا۔ تاحال ترنم ریاض کے تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''یہ تنگ زمین'' 1998 عیسوی میں اور ابابیلیں لوٹ آئیں گی اور یمبرزل 2000 عیسوی میں۔

کشمیر کی المناک صورت حال پر ترنم ریاض نے اثر آفریں کہانیاں لکھیں ہیں۔ کشمیر کا ان کا تجربہ ذاتی ہے کیونکہ اُن کا تعلق اس سرزمین سے ہے، گو وہ کافی عرصے سے دہلی میں مقیم ہیں۔ یہ بات توجہ طلب ہے کہ ان کے یہاں فرقہ وارانہ فسادات، ہندو مسلم تناؤ پر کوئی بھی افسانہ نظر نہیں آتا لیکن کشمیر کی صورت حال پر اُنہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ آئینہ بن گیا ہے۔ دورِ جدید کے بے تحاشا تشدد، قتل عام، دہشت اور عام آدمی کی غربت، بے بسی اور کسمپرسی کا کشمیر کی صورت حال پر ایک بے مثال کہانی ''مٹی'' ہے۔ اس میں ''قابض فوج'' کا ایک دستہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچ کر جو قہر برساتا ہے، اس کا ہولناک نقشہ افسانہ نگار نے پیش کیا ہے۔ ترنم

ریاض اردو کی ابھرتی ہوئی فکشن نگار ہیں۔ اُنہوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعے قارئین اور نقادوں کو چونکا دیا ہے۔ انہوں نے اپنے اردگرد کے حالات کی نہایت عمدہ عکاسی کی ہے۔ اُن کے افسانے، افسانے نہیں، معاشرے کی منہ بولتی تصویر بن جاتے ہیں۔ ان ہی تصویروں کے البم کے نام ہیں۔ ''یہ تنگ زمین''، ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی''، ''ریمبر زل'' اور دوسرے افسانے۔

ترنم ریاض کا ناول برف آشنا پرندے:

آزادی کے بعد کشمیر کے مصائب میں کمی کے بجائے زیادتی کی ہی تصویریں سامنے آتی ہیں۔ بعض طاقتوں کی جانب سے کشمیری معاشرت اور ثقافت کی پاکیزہ تصویر کو لہو کے چھینٹوں سے بدنما بنانے کی کوشش اور سازشیں ہیں کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہیں۔ ''برف آشنا پرندے'' اس صورت حال کے خلاف ایک تخلیقی احتجاج ہے جس سے دانشورانہ روشن خیالی کے ساتھ منفرد فنی و جمالیات دروبست کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ''برف آشنا پرندے'' ایک طرف جہاں ہندوستان اور پاکستان کے سیاست دانوں کو کشمیر سے متعلق زیادہ مثبت اور نتیجہ خیز حکمت عملی اپنانے کا پیغام دیتا ہے وہیں اہلِ کشمیر کو کشمیر سے متعلق زیادہ مثبت اور نتیجہ خیز حکمت عملی اپنانے کا پیغام دیتا ہے۔ وہیں اہلِ کشمیر کو بھی یہ باور کرواتا ہے کہ وہ اپنی سرزمین کے ثقافتی سرمایہ اور معاشرتی ڈھانچے کے امتیازات کو تاریخ حوالے سے پہچانیں اور اپنی کوتاہیوں کے نتائج سے سبق حاصل کریں۔ کیونکہ مسئلہ صرف سیاسی مستقبل کا ہی نہیں فطری انسانی جذبات و محسوسات کے تحفظ کا بھی ہے۔ ''برف آشنا پرندے'' کے ابتدائی صفحات

میں ہی ایک روشن اقتباس ملتا ہے۔

''میرا عظیم وطن ، میرا کشمیر، نرم خو، حلیم اور حسین کشمیریوں کی زمین، دانشوروں ، فنکاروں اور دستکاروں کا خطہ، ریشم و پشم ، زعفران زاروں اور مرغزاروں کی سرزمین، پہاڑوں اور وادیوں کا مسکن یہ کشمیر، جنت بے نظیر، جس کی پانچ ہزار سال پرانی تاریخ موجود ہے۔ جس کی مثال شاید ہی دنیا میں کہیں ملے۔ قدیم ترین زبان و تہذیب کا مرکز، ریشیوں منیوں کا کشمیر، شیخ العالمؒ اور لل دید کا کشمیر، شاکھیہ منی کی پیشن گوئی کا بودھ گہوارہ کشمیر، کشپ رشی اور پرورسین کا کشمیر، للتا دتیہ اور سویہ کا کشمیر، اشوک، کنشک، کلہن اور بڈشاہ کا کشمیر حبہ خاتون کا کشمیر، ارنی مال کا کشمیر'' ۔(ص26)

ناول میں کشمیری معاشرت ، ثقافت اور کہیں کہیں سیاست کے حوالے سے بھی مختلف النوع خارجی حقائق و مسائل ، واقعات و کردار اور کیفیات و تصورات کا اظہار ہے لیکن ہر حال میں ان کی معنویت کا رُخ باطن یعنی ناول کے مرکزی نقطہ کشمیر کی جانب ہی رہتا ہے۔

ڈوگرہ راج میں کشمیریوں پر ڈھائے گئے مظالم کی جو تفصیلات اس ناول میں پیش کی گئی ہیں وہ بربریت کی انتہائی گھناؤنی تصویریں ہیں۔ اس کا اندازہ ''گلگت بیگار'' کے حوالے سے ناول کے اس ساختیے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

''گلگت ریاست جموں و کشمیر کی آخری سرحد تھی...... جہاں

بدنصیب کشمیریوں کو ثابت وسالم بھیجا جاتا تھا اور اکثر ان کے جسم کا ایک ٹکڑا یعنی صرف سر واپس آتا تھا۔ بہت سے سر، لاریوں میں ٹھسنے ہوئے بے شمار سر...... گلگت میں ڈوگرہ افواج کیلئے اشیا ڈھونڈنے کا راستہ نہایت دشوار تھا...... اور اطراف سینکڑوں فٹ گہری کھائیاں تھیں۔ افلاس کی چکی میں پسے اور جرمانوں اور جسمانی اذیتوں کے سبب، نیم ادھڑی ان کی کھالوں کو ڈھکنے کیلئے موسم کے مطابق کپڑے بھی میسر نہ ہوتے تھے اور نہ ہی غذا کے تحفظ کا کوئی امکان ہوتا۔ ایسے میں پہاڑوں کے نشیبوں میں لڑھکنے سے بچ گئے افراد کی لاشوں کے بجائے ان کے مجبور و مظلوم وارثوں کے حوالے ان کے عزیزوں کے سر کٹے جاتے تھے کہ کوئی کیوں غلام قوم کے لواحقین کی سالم لاشیں ڈھوکر ان کے حوالے کرتا اور وہ کم از کم انہیں سپرد خاک کر کے اپنے مجروح سینوں پر جدائی کی سیل رکھ لیتے''۔

لیکن ہر ظلم سے ہی آخر کار احتجاج اور بغاوت کی چنگاریاں بھی پھوٹتی ہیں، چنانچہ نسل کشی جیسا یہ جان لیوا چلن ڈوگرہ راج کے زوال کا پیش خیمہ تھا جو بعد ازاں سچ ثابت ہوا۔ صدیوں سے غلامی کی صعوبتیں جھیلتی، امن وسکون کی خواہاں کشمیری قوم آخر کار ڈوگرہ راج سے آزادی کا پرچم بلند کرنے پر مجبور ہوگئی۔

کشمیر میں لکھے گئے ناولوں کا قابل ذکر سرمایہ موجود ہے۔ اب تک جو

ریاست میں ناول لکھے گئے ہیں۔ یہ ناول کشمیر کی سچی اور حقیقی زندگی کو پیش کرتے ہیں۔ ہمارے ناول نگار اپنے گردوپیش کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ نئی نسل سے تعلق رکھنے والے فنکاروں نے اچھے اور کامیاب ناول لکھے ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر میں اُردو شاعری

(1947 عیسوی تا حال)

1947 عیسوی کے بعد سے جو دور شروع ہوتا ہے۔ وہ ایک سیاسی جدو جہد اور کشمکش کا نتیجہ دکھائی دیتا ہے اور اسی دور میں سماجی اور معاشی تعمیر نو کو فروغ دینے کی طرف توجہ دی جانے لگی۔ برصغیر کی تقسیم کی وجہ سے رنگا رنگ مسائل پیدا ہونے لگے۔ شعرا نے نئی کروٹ لی اور نئے زاویے سے سوچنے لگے تو کشمیری ادب کے ساتھ ساتھ اُردو ادب و شعر کو بھی ترقی پسند رویئے نے متاثر کیا۔ کشمیری زبان کے اہم اور سرکردہ شاعر مثلاً رحمٰن راہیؔ، اور فاضل کشمیریؔ نے اگر چہ اردو زبان میں شعر کہنا لگ بھگ ترک کیا ہے مگر اُنہوں نے بھی اپنے ابتدائی دور میں اچھا خاصا اردو شعری سرمایہ چھوڑا ہے جس میں عمومیت کے ساتھ رومانی فضا اور نئی تحریکوں کے ساتھ ان کا تعلق نظر آتا ہے اور سب نے اپنے اپنے مخصوص رنگ میں اعلیٰ پائے کے نمونے چھوڑے ہیں۔ رحمٰن راہیؔ نے ابتداء تو روایتی انداز غزل سے کی ہے لیکن جلد ہی نئی تحریک سے منسلک ہوئے اور نئے عہد کی نمائندگی میں غزل کہنے لگے جس میں

رومانیت کے ساتھ نیا اسلوب اور انداز کا بھی اثر ہے۔

سرزمین کشمیر سے اردو زبان کے کئی قابل قدر ادیب اور شاعر نمایاں ہوئے۔ محمد ین فوقؔ، رسا جاودانیؔ، شہ زور کشمیریؔ، غلام رسول نازکیؔ، دینا ناتھ مستؔ، کمال الدین شیداؔ، طالب کشمیریؔ، پریم ناتھ پردیسی، راما نند ساگرؔ، پریم ناتھ درؔ، پروفیسر محمود ہاشمیؔ کے نام فوری طور ذہن میں آتے ہیں۔ یہ وہ شاعر اور ادیب ہیں جن کی نگارشات متحدہ ہندوستان کے بعض اہم رسائل میں شائع ہوا کرتی تھیں اور جن سے ریاست کشمیر کے لکھنے والے ملک گیر سطح پر متعارف تھے۔ ان میں سے کئی لکھنے والے تقسیم ہند کے بعد ملک کے معتبر رسالوں میں نظر آتے رہے، کچھ اور نئے نام آسمان ادب پر تاروں کی طرح جھلملانے لگے تھے۔ دینا ناتھ نادمؔ، قیصر قلندر، رحمٰن راہیؔ، امین کاملؔ، اختر محی الدین، علی محمد لون، سوم ناتھ زتشیؔ، غلام رسول سنتوشؔ، حامدی کاشمیریؔ، موہن یاور، پشکر ناتھ، ٹھاکر پونچھی، اکبر لداخیؔ، عرش صہبائیؔ، نور شاہ، چودھری دینا ناتھ رفیقؔ، قاضی غلام محمدؔ، ملک غلام محمد شوریدہؔ، مرزا شدا، غلام قادر شہہ زور کاشمیری، غلام محمد میر طاؤس۔ ان ادیبوں اور شاعروں نے جموں وکشمیر کے تہذیبی حسن کو سنوارنے اور نکھارنے میں نمایاں کام کیا ہے۔

چودھری دینا ناتھ رفیقؔ:

چوندھری دینا ناتھ رفیقؔ 1904 عیسوی میں پیدا ہوئے اور ان کا وطن پونچھ ہے۔ تعلیم سے فارغ ہوکر 1922 عیسوی میں محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کرلی اور کئی سرکاری اسکولوں میں تعلیم اور ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ رفیقؔ کو اوائل

عمر سے ہی شعر وسخن سے دلچسپی رہی۔ اردو کے علاوہ پنجابی، کشمیری، ہندی اور انگریزی کے ماہر تھے۔ 1947 عیسوی تک ان کے کلام کی ایک مکمل بیاض تیار ہو چکی تھی جو فسادات کی وجہ سے ضائع ہوگئی۔ جو کلام بچا ''سنبل وریحان'' کے نام سے مرتب کیا ہے۔ اس میں غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ شعر کی تکنیک پر انہیں دسترس ہے۔ ''سنبل وریحان'' میں مختلف موضوعات پر نظمیں بھی شامل ہیں۔ مشاہیر ہند اور مشاہیر عالم پر لکھی ہوئی نظموں میں شری کرشن، گوتم بدھ، جواہر لال نہرو، لال بہادر شاستری پر اُنہوں نے اچھی نظمیں لکھی ہیں۔ رفیقؔ نے ایک نظم میں غالب کو بھی خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس نظم کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

چاند بن کر جو ذکات کے فلک پر چمکا — تاج ایسا جو سیر علم و ادب پر چمکا
نقش دنیا کے زمانہ تو مٹا سکتا ہے — کون غالبؔ کو زمانے میں بھلا سکتا ہے

اپنے عہد کے حالات کا ردِ عمل اُن کی شاعری میں نمایاں طور پر ظاہر ہوا ہے۔ ''یومِ آزادی'' رفیقؔ کی ایک اچھی نظم ہے جس میں وہ انگریزوں کے ہندوستان سے جانے اور اس کے جلو میں جو نیا عہد طلوع ہو رہا تھا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

اے دیکھنے والے ذرا نیرنگ جہاں دیکھ — یہ بدلا سماں دیکھ، زمین دیکھ زماں دیکھ
اٹھتی ہوئی اس چادر ظلمت پہ نظر کر — بڑھتی ہوئی رنگینی، فطرت کو عیاں دیکھ

عرش صہبائی:

ہنس راج جموں میں تولد ہوئے ہیں۔ جموں میں ہی تعلیم حاصل کی۔ ایم، اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ملازم ہو گئے۔ 1900 عیسوی میں ریڈیو کشمیر جموں میں کام کیا۔ عرشؔ کو شعر سے لگاؤ زمانہ طالب علمی ہی سے رہا ہے۔ غزل میں اُن کی تربیت ہوئی اور غزل ہی پر اُنہوں نے زیادہ توجہ مبذول کی۔ غزل کے آداب اور لوازم سے عرشؔ کو پوری آگاہی ہے اور اظہار کے اسالیب پر بھی اُنہیں پوری قدرت حاصل ہے۔ اُن کے انداز بیان میں حُسن بھی ہے اور فنی رچاؤ بھی۔ اُن کے کلام کے دو مجموعے ''شکستِ جام'' اور ''شگفت گل'' شائع ہو چکے ہیں۔ تیسرا مجموعہ ''چشم نیم باز'' مرتب کر چکے ہیں۔ عرشؔ شعر میں اظہار اور آہنگ کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں۔

عرش صہبائی زبان و بیان اور محاورے طرز ادا اور شعری محاسن کی نگہداشت کے ساتھ ساتھ معنی کی خوبیوں کا بھی دھیان رکھتے ہیں۔ حیات اور کردار کے بارے میں اُن کے کچھ تجربات اور مشاہدات ہیں، وہ ذات انسانی کا احترام یوں کرتے ہیں۔

اے جذبۂ خودداری اے حسرتِ مختاری — انسان در انسان پر فریاد کناں کب تک

اے اہلِ ستم تم بھی یہ بات ذرا سوچو! — رہتے ہیں ستم خوردہ محروم زبان کب تک

قاضی غلام محمد:

قاضی غلام محمد کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ ریاضیات کے صدر اور پروفیسر رہے۔ علمی ذہانت اور ریاضی سے گہری دلچسپی کے ساتھ ساتھ ادبی مذاقِ سخن بھی رکھتے

تھے۔ ان کا آبائی وطن اسلام آباد ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی۔ اس کے بعد اسلام آباد کے گورنمنٹ کالج میں بی اے کی تعلیم کی تکمیل کی۔ ایم اے کی تعلیم کیلئے وہ علی گڑھ گئے۔ امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ 1950 عیسوی میں کشمیر لوٹے اور کشمیر یونیورسٹی میں شعبہ ریاضیات میں لیکچرار مقرر ہوئے۔

قاضی غلام محمد کا اردو فارسی کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور خاص طور پر مرزا غالبؔ کی شاعری میں نئی معنویت کی تلاش ان کی ذہانت کی نمایاں خصوصیت ہے۔ شعر و سخن کا اُنہیں بہت صاف ستھرا ذوق نصیب ہے۔ لیکن ان کا رجحان مزاح اور طنز کی طرف زیادہ ہے۔ قاضی کا کلام جو 1962 عیسوی تک جمع ہو گیا تھا اسے انہوں نے ''حرف شرین'' کے نام سے مرتب کر لیا تھا۔ اس مجموعہ کو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے اپنے تعارف کے ساتھ ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد کے سلسلہ مطبوعات میں شائع کیا ہے۔ اس مجموعے میں مفلسوں کا ترانہ، انٹریو کے سوالات اور پیر و مرید شامل ہیں۔

غلام قادر شہ زورؔ کاشمیری:

شہ زور کاشمیری، سرینگر کے محلّہ کنہ کدل چوٹہ بازار میں 1915 عیسوی میں تولد ہوئے۔ شعر و سخن کا مذاق بچپن سے ہی تھا۔ اُنہوں نے شعر و سخن کے بارے میں کافی ریاضت کی۔ انہیں نہ صرف کشمیر میں بلکہ ہندوستان اور پاکستان کے سخنوروں میں اُستادی کا درجہ حاصل ہے۔ اُنہوں نے 1935 عیسوی میں ایس پی کالج سے بے اے کا امتحان پاس کر کے محکمہ حسابات میں ملازمت شروع کی اور ترقی کر کے چیف اکاؤنٹس آفیسر بن گئے۔

شعر وادب سے شہ زورؔ کا تعلق بچپن سے رہا ہے اور موسیقی کے ساتھ بھی انہیں خاص لگاؤ رہا ہے۔ ابتداء میں اپنا کلام سیماب اکبر آبادی کو دکھاتے تھے۔ عروض، زبان کے نکات، محاورہ اور شعری اسالیب پر سیماب اکبر آبادی کو جو عبور حاصل تھا، اس سے شہ زورؔ نے پورا استفادہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں فنی نکات پر قدرت حاصل ہوئی ہے۔ شہ زورؔ نے غزل لکھی ہے اور غزل میں وہ استادی کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن اُنکی شاعری کا تصور جامد نہیں بلکہ وہ برابر نشو نما پاتا رہا۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے عہد کے فنی اور سماجی شعور اور عصری آگہی کو اپنی شاعری خاص کر غزل میں سمونے کی کوشش کی ہے۔

میرا گوہر سخن جو تیرے کان تک نہ پہنچا
میرے کم نصیب فن کا وہی شاہکار کیوں ہو

سید سلمان ندوی آپ کو ایک خط لکھتے ہیں:

"آپ کے کلام میں اقبالؔ کی روح بولتی ہے۔ اس لئے آپ کو کشمیر کا اقبال کہا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں اپنا ذوق نظر گم ہو جاتا ہے وہاں اقبالؔ کی آواز کی صدائے بازگشت ابھرتی ہے، جو دِل کو تار تار کرنے کی قوت سے محروم نظر آتی ہے"۔

اُنہوں نے کشمیر کے مناظر پر کئی نظمیں لکھی ہیں، جن میں "وادی کشمیر"، "شالہ مار باغ" اور "جھیل ڈل کے کنارے" بہترین نظمیں ہیں۔ جب کشمیر میں ترقی پسندی کی تحریک چلی تھی اور نوجوان ادیب اور شاعر جوق در جوق اس کی طرف

مائل ہورہے تھے، مگر شہ زور کو نہ ترقی پسندی کا شوق تھا نہ تجدد پسندی کا۔ لیکن ان کا شعور بیدار تھا اور وہ طبقاتی کشمکش اور غریب و امیر کے فرق کو ایک اخلاقی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں۔

حاکم سیل جبرا بھی تند تیز ہے ۔۔۔ ہر ایک دیار آج بھی محکوم خیز ہے
خواجہ پرست آج بھی مزدور ہے یہاں ۔۔۔ پائے خدائے زر پہ گدا سجدہ ریز ہے

اردو زبان کے ساتھ ان کے والہانہ محبت کے سلسلے میں عبدالقادر سروری اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' میں لکھتے ہیں:

''شہ زور اردو کے شاعر ہیں اور ان سے بڑھ کر اس زبان کے حسن اور اسکی اظہاری صلاحیتوں سے کوئی کم ہی واقف ہوسکتا ہے۔''

اپنی ایک نظم میں ان تاثرات کو وہ اردو کی زبان سے اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

میں نے جذبات کو کونین کی وسعت دی ہے ۔۔۔ فکر کو کنگرۂ عرش کو رفعت دی ہے
نطق کو کوثر و نسیم کی عزت دی ہے ۔۔۔ اور تخیل کو بھی شادابی جنت دی ہے

ملک غلام محمد شوریدہ:

ملک غلام محمد شوریدہ 1924 عیسوی کو شوپیان کشمیر میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان زراعت پیشہ ہے۔ شوریدہ نے اپنے شوق اور ذوق سے تعلیم حاصل کی اور اسلامیہ ہائی اسکول سرینگر سے میٹرک کا امتحان 1940 عیسوی میں پاس کرلیا۔ پھر ایس پی کالج سے ایف اے اور امر سنگھ کالج سے بی اے کا امتحان پاس کرلیا، اس کے بعد فوڈ اینڈ سپلائیز میں بحیثیت سپروائیزر کے عہدے پر فائز رہے لیکن نوکری چھوڑ کر

بی ایڈ کرلیا۔ اور مدرس کے عہدے پر اپنے ہی علاقے میں کام کیا۔ کچھ مدت کے بعد علی گڑھ سے ایم اے کا امتحان پاس کر کے لیکچرار ہو گئے۔

ریاست کے مختلف کالجوں میں درسی فرائض انجام دیئے۔ شوریدہ کو شاعری کے ساتھ گہرا لگاؤ رہا اور کافی لکھ چکے ہیں۔ وہ سخن اور مزاحیہ دونوں انداز شاعری پر دسترس رکھتے تھے۔ حامدی کاشمیری شوریدہ صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''شوریدہ کاشمیری جہاں غزل کے تعلق سے اپنی قدامت پسندی کا احساس دلاتے ہیں وہاں آزاد اور حالی کی قائم کردہ نظمیہ روایات سے وابستگی سے جدت پسندی کا ثبوت دیتے ہیں''۔

شوریدہ کی شاعری میں کلاسیکی ترکیبات واستعارات ان کے شعری رویئے کی غمازی کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں روایتی خیال آرائیوں کے ساتھ تازگی، تخیل اور پیکر تراشی کی نزاکت محسوس کی جاسکتی ہے۔ شوریدہ احساس، جذبے اور مشاہدے میں دیانت داری، سادگی اور روایت کے پہلو بہ پہلو روانی اور مٹھاس بھی پیدا کرتے ہیں۔

یہ سرخیِ رخسار یہ ہنسنے پر صباحت کیا رنگِ شفق نورِ سحر دیکھ رہا ہوں

☆

حسن اس درجہ شعلہ بار ہوا لاکھ پردوں سے آشکار ہوا

شوریدہ کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں تخیل کی بلندی اور مشاہدات کی تازگی اور جذبات کی شدت، انسانی ہمدردی اور اخوت کے جذبے کی کشش

بدرجہ اتم موجود ہے۔

بن گیا تھا دل زمانے کا ہدف اب زمانہ خود نشانہ ہوگیا

☆

ترے رخ سے روشن ہوا سب جہاں تیرے گیسوؤں سے ٹپکتا رہا

اپنے وطن میں فطرت کی نیرنگیوں پر مشتمل لفظوں کا ایک اچھا سلسلہ شوریدہ نے پیش کیا ہے اور بھی کئی رنگ کی نظمیں ان کے مخصوص تخلیقی حسن سے آراستہ ہوتی ہیں۔ ''باغِ نشاط''، ''نیرنگ زمستان''، ''ڈل کا منظر''، اور ڈل اور چاند'' جیسی نظمیں ایک حسین اور لازوال تخلیقی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک بند ''ڈل کا منظر'' سے

ڈل سہانا ہے کیا چاندنی رات میں
ہے یہ غرقاب کیا جلوہٴ ذات میں
ایک طوفان برپا ہے جذبات میں
جانے ڈوبا ہے دل کن خیالات میں
غوطہ زن ہو کے موتی لگے ہاتھ کچھ
دامنِ دل میں لایا ہوں میں ساتھ کچھ

ان کے دو شعری مجموعے ''جوش جنون'' 1981 عیسوی اور ''جذب دورن'' 1986 عیسوی میں شائع ہو چکے ہیں۔

غلام محمد میر طاؤس:

غلام محمد میر طاؤس جو غ، م طاؤس کے نام سے ادبی دنیا میں متعارف ہوئے۔ کشمیر کے ان ادیبوں میں سے ہیں جنہوں نے نئے عہد کے تقاضوں اور

ادبی معیاروں کو بڑی خوبی سے جذب کیا اور کشمیر کے ادبی اُفق پر شہابِ ثاقب کی طرح نمودار ہوئے اور شعر و ادب کی فضا کو روشن کیا۔ طاؤس کی ولادت 22 مئی 1919 عیسوی کو قصبہ پانپور میں ہوئی جو اپنی کاشتِ زعفران کی بدولت مشہور ہے۔

بی اے پاس کرنے کے بعد طاؤس نے علی گڈھ سے اردو میں ایم اے اور ایل ایل بی کے امتحانات پاس کئے اور 1944 عیسوی میں حلقہ ملازمت میں داخل ہو گئے۔ پانچ سال نائب تحصیلدار رہے اور پانچ سال تحصیلدار، چار سال اسسٹنٹ کمشنر، کچھ عرصہ محکمہ امداد باہمی میں جوائنٹ رجسٹرار بھی رہے۔ اس کے بعد ڈپٹی کمشنر اور محکمہ فوڈ کنٹرول کے ناظم بھی رہے۔

طاؤس کی شاعری کی ابتداء غزل سے ہوتی تھی۔ لیکن نئے عہد کے شعور اور نئی تحریکوں کے اثر نے ان کی غزل کو بھی فکر اور اسلوب ہر لحاظ سے عصری تقاضوں کے ہم آہنگ بنا دیا۔ اس لئے ان کی ابتدائی غزلوں میں بھی ان کے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں کا پرتو ملتا ہے۔

اپنے وطن کی سرزمین کی روایتی اور تاریخی اہمیت اور اس کے زعفران زاروں کے دلکش مناظر پر طاؤس کی ایک عمدہ نظم ''چندہ ہار'' کے عنوان سے لکھی گئی جس کا مرکزی کردار حبہ خاتوؔن ہے۔ یہ نظم 27 مئی 1957 عیسوی ملکہ حبہ خاتون کی یادگار کے طور چند ہار میں جو دن ''حبہ خاتون ڈے'' کے نام سے منایا گیا تھا، اس موقع پر لکھی گئی تھی۔ اس کے چار بند ہیں۔ پہلا بند ہے۔

یہ گاؤں جس میں آج ہمیں یہ جشن بہاراں لایا ہے
یہ گاؤں جس کی راہوں پر ایک نقش نکھرتا آیا ہے
یہ گاؤں جس کی مٹی نے اکسیر کا رتبہ پایا ہے
یہ گاؤں جس کو کھو کر ہم نے قسمت سے پھر پایا ہے

غلام رسول نازکی:

ہماری ریاست کے سب سے بزرگ اور سر برآوردہ شاعر ہیں جو کشمیری زبان کے ایک اہم اور صف اول کے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے لہجے اور اسلوب سے ایک منفرد مقام پایا ہے۔ آپ کا پہلا شعری مجموعہ ''دید تر'' 1949 عیسوی میں شائع ہوا۔ اس میں غزلیات، نظمیں اور قطعات ہیں۔ کشمیری زبان میں ان کے مجموعے ''نمرونامہ''، ''آواز دوست'' پر ان کو ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ بھی ملا ہے۔ وہ روایت کے بھی علمبردار رہے اور جدید دریافتوں اور علم و آگاہی کے بھی عروج سے بھرپور وابستگی رکھتے ہیں۔ ان کا دوسرا مجموعہ ''متاع فقیر'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ان کا اکثر کلام روحانی تجربات کا آئینہ ہے۔ نازکی کی شاعری میں ایک دکھی دل کی پکار ہے۔ ایک غم انگیز پکار ہے۔ آپ کے یہاں غم زندگی کی اہم ترین حقیقت سے عبارت ہے۔

محبت زندگی اور زندگی غم ہوتی جاتی ہے
خوشی تحلیل ہو کر غم میں مدغم ہوتی جاتی ہے

تنہاؔ انصاری:

1920 عیسوی تا 1982 عیسوی) دبستان شاعری میں مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی ہوتی ہے۔ غزل اور نظم دونوں میں اعلیٰ پائے کے نمونے چھوڑے ہیں۔ حسن علی تنہاؔ انصاری کشمیر میں اردو کلاسیکی انداز کے مرثیوں میں بلند رتبہ حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا آبائی گاؤں دلنہ بارہمولہ میں واقع ہے۔ تنہا کم عمری میں ہی شعر وسخن سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اُنہوں نے شاعری کی ابتداء غزل سے کی۔ ابتداء میں روایتی انداز اختیار کیا ور بعد میں تقاضائے وقت کے پیش نظر نئی راہوں کو دریافت کیا اور وسعت دے کر اپنے عہد کی آواز اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی۔

ان کی نظمیں طویل ہوتے بھی اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ تنہاؔ نے اندرونی ردِ عمل اور مخصوص مشاہدات اور انداز بیان سے ان میں انفرادیت پیدا کی ہے۔ ''چاندنی رات میں جھیل ڈل کی سیر'' اور ''احساس بہار'' جیسی نظمیں اس کی تعریف کرتی ہیں۔

سیفیؔ سوپوری:

سیفیؔ سوپوری نے اپنی شاعری غزل سے ہی شروع کی اور ایک پختہ کار صاحب فن کی حیثیت میں ابھرے۔ وہ غزل میں اپنے ماحول میں پائے جانے والے موضوعات کا عکس پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ انداز بیان سادہ مگر پُر کار ہوتا ہے۔

کل رات بھی کیا جائے کہ ہم لوگ کہاں تھے　　آئنے کا کہنا ہے کہ پردے میں نہاں تھے

گم گشتہ تمناؤں سے کیا آنکھ ملاتے　　کاندھوں پہ اٹھائے ہوئے ہم بارگراں تھے

قیصر قلندر:

قیصر کے ادبی اور شعری کردار کی تعمیر میں تین نمایاں عناصر کا حصہ ہے۔ شعر گوئی کا ذوق انہیں گویا وراثتاً ملا تھا۔ ریڈیو کی ملازمت کے سلسلے میں موسیقی اور ڈرامہ سے انہیں گہرا لگاؤ رہا۔ اس طرح غیر شعوری طور پر شاعری، موسیقی اور ڈرامہ کے تینوں عناصر ان کی تخلیقات کے محرک بن گئے۔

قیصرؔ کی غزل میں نئے زمانے کے فکروفن کے خط وخال نمایاں ہیں اور ان کی غزلوں میں فکروفن اور اسلوب کی جدت بھرپور رنگ میں مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔

جب درد کی شمعیں جلتی ہیں احساس کے نازک سینے میں
اک حسن سا شامل ہوتا ہے پھر تنہا تنہا جینے میں

☆

بے باکی اظہار سے مجبور ہوں قیصرؔ
حق بات کہوں یا نہ کہوں سوچ رہا ہوں

عبدالقادر سروریؔ لکھتے ہیں:

''قیصر کی شاعری پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پچاسویں دہے کے اوآخر تک پنجاب کے حلقہ شعراء خاص طور پر حفیظ جالندھری کے ہلکے پھلکے انداز کی نظموں کا گہرا اثر رہا۔ چنانچہ اس دوران جو نظمیں اُنہوں نے لکھی ہیں ان میں رواں بحروں اور لفظی ترنم پر زیادہ زور ملتا ہے۔ ''شام شالمار'' اسی زمانے کی لکھی ہوئی نظم ہے''۔

قیصؔر ایک فنکار اور تجربہ پسند فنکار ہے اور قیصؔر کی تجربہ پسند طبیعت نے ایک نیا گوشہ ڈھونڈا ہے۔ اُنہوں نے کئی تصوریئے لکھے ہیں، جن میں سے سات تصوریئے ''ساز جمال'' کے نام سے 1966 عیسوی میں مجموعے کی صورت میں چھپے ہیں اور ایک اور مجموعہ ''ساز آرزو'' کے نام سے مرتب ہوا ہے۔

فاروق نازکی:

فاروق نازکی کے اب تک اردو شاعری کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک ''آخری خواب سے پہلے'' اور دوسرا ''لفظ لفظ نوحہ''۔ نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی آپ کی شخصیت کی طرحداری اور بانکپن دونوں کی بھرپور عکاسی ہے اور یہ کہنا مشکل ہے کہ آپ کی غزل بہتر ہے یا نظم۔

فاروق نازکی کی فکر کا متنوع اور مشاہدے کی وسعت اور انداز بیان کی جدت جیسے عناصر اپنے ماحول کے حسن و جمال اور رنگینیوں کے پہلو بہ پہلو ایک جدید اور گہرے حسیاتی اور تجرباتی عالم کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

ایک شعر ملاحظہ ہو:

شہر کے ہنگاموں میں کھو جاتا ہے اکثر میرا چہرہ
تنہائی کے تاج محل میں میرا چہرہ درپن درپن

فاروق زبان پر قدرت رکھتا ہے، ایک شاعرانہ لہجہ رکھتا ہے اور ان تجربوں سے بھی مالا مال ہے جو اچھی شاعری کی جان بن جاتے ہیں اور پہچان بھی۔

ڈاکٹر حامدی کاشمیری 1932 عیسوی:

ایک ایسی شخصیت جو کشمیر میں اردو زبان و ادب کے معماروں میں اپنا اعلیٰ

مقام رکھتے ہیں۔ آپ افسانہ، ناول، ڈرامہ اور تنقید و تحقیق اور شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں اور ہر صنف پر منفرد اور دنیائے اردو کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے والی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ روانی اور رومانی شاعری سے کنارہ کش ہو کر انہوں نے موضوع اور اسلوب کو بے جکڑ بندیوں سے آزاد کرا کے نئے شعری تقاضوں کے مطابق کر دیا۔ حامدی کاشمیریؔ کی شاعری نہ صرف اسلوب اور آہنگ کے لحاظ سے ایک نئی سمت اختیار کر گئی بلکہ ان کے موضوعات عصری تقاضوں کے پیش نظر زیادہ پیچیدہ اور تہہ در تہہ ہو گئے۔ حامدی کاشمیریؔ کے ساتھ ساتھ اور ان کے ذرا دیر بعد اور بھی کئی ذہین شعراء نے اپنے طریقہ ہائے اظہار میں تبدیلیاں شروع کر دیں جن میں قیصر قلندرؔ، عباد مناوریؔ، فاروق نازکیؔ، حکیم منظورؔ، محمد یاسین اور مظفر ایرجؔ قابلِ فہرست ہیں۔ ایک نئی پود سامنے آنے لگی جس نے اس نئے شعری رجحان کو ریاست میں نمایاں اور مستحکم کر دیا۔ ان شعراء میں شجاع سلطانؔ، اشرف ساحلؔ، عابدہ احمد، فاروق مضطرؔ، پرتپال سنگھ بیتابؔ، غلام محمد اجرؔ، شہباز روجورویؔ، رفیق رازؔ، اقبال فہیمؔ، قابلِ ذکر ہیں۔

ریاست کی نئی اردو شاعری کے نمائندہ شعرا کی فہرست میں حامدی کاشمیریؔ سب سے آگے ہیں۔ وہ نہ صرف ریاست میں ممتاز شعری اسلوب رکھتے ہیں بلکہ وہ ملک بھر کی اردو شاعری میں مخصوص شعری اظہار کی نسبت سے کافی نمایاں ہیں۔ وہ اپنے شعروں میں طلسمی صورت حال تخلیق کرنے کے قابل ہیں۔ اس شعری انفرادیت میں ان کو اچھی خاصی کامیابی حاصل ہوگئی۔ حامدی کاشمیریؔ پیکر تراشی اور

استعاراتی اظہار کے روادار ہیں۔ کئی الفاظ مثلاً برف، وادیٔ پہاڑ، سنگ، شجر، سایہ، شعلہ، دشت ان کی شاعری میں استعاراتی نظام قائم کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عصری انسانی صورت حال کا اظہار مختلف پہلوؤں سے ہوتا ہے۔

''عروس تمنا، نایافت اور لاحرف''۔ ملک کے سب سے زیادہ چھپنے والے اور اعلیٰ معیار کے تقریباً سبھی رسائل میں حامدی صاحب کے تحقیقی تنقیدی مضامین اور شعری تخلیقات وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں۔ آپ نے اپنے شعری مجموعوں ''عروس تمنا'' سے ''نایافت'' اور ''لاحرف'' تک ایک لمبا ذہنی سفر طے کر کے کشمیر میں اردو تخلیقی عمل میں خصوصاً شاعری میں ایک اعلیٰ مقام پایا ہے۔ ان کی شاعری کلاسیکی رکھ رکھاؤ کے ساتھ ساتھ جدیدیت اور عصری آگاہی اور وسعت مشاہدہ، فکری تنوع اور جدت اسلوب سے مزین ہے۔ ان کی زبان اور تراکیب اور استعارات کا جدید استعمال ان کی شاعری کو ایک نیا رنگ عطا کرتے ہیں۔ حامدی اپنے منفرد لب ولہجہ آہنگ اور ڈکشن کے مالک ہیں اور اپنے دور کی تشنہ سامانیوں اور کربناکیوں سے الگ نہیں۔

یہ اندھیرا ضرور پگھلے گا   خون میں میرے تابشیں ہیں بہت

☆

گر گیا خون بے گناہوں کا   بڑھ گئی اشتہا زمینوں کی

☆

پانیوں پر کالی آوازیں رقم ہوتی گئیں   روشنی کے جسم ڈوبے تہہ نشیں ہوتے گئے

☆

تھے وہ درماندہ شب جاگ کے پھر سوتے تھے   شہرِ ظلمات ہے، کب اس میں سویرا ہوگا

لاکھ کہتے رہے اس دیس کا کچھ حال کہو تکتے تھے چہروں کو آمادہ گفتار نہ تھے

ظاہر ہے کہ حامدی کاشمیری کی شاعری عصری زندگی کی ستم سامانیوں کے شدید احساس کی روداد ہے۔ ان کی شاعری میں آسیب زدگی، نارسانی اور غیر یقینی کا ایک خرابہ آباد ہے۔ حامدی کاشمیری اپنے احساسات کی تخلیقی بازیافت اشعار میں مناسب لفظ و پیکر کرتے ہیں۔ ان کے شعروں میں بندش الفاظ کا سلسلہ انتہائی اہم اور دلآویز ہے۔ وہ نظمیں بھی لکھتے ہیں۔ ''جشنِ بہاراں''، ''گل مرگ'' ''شالیمار کی ایک شام''، اور ''شام خزاں'' وغیرہ مقامی ماحول کے حسن و جمال سے حاصل ہونے والی خصوصیات اور دلکشی سے آراستہ ہیں۔

حکیم منظور:

ریاست کے نئے شعراء کی پہلی ٹولی میں حامدی کاشمیری کے بعد سب سے نمایاں اور منفرد اظہار رکھتے ہیں۔ ان کے تجربات اپنے مخصوص اور حسین و جمیل دنیا کی پیداوار ہیں اور وہ واقعی ''فردوس برائے زمین'' کے ایک سر برآوردہ فرزند اور کامیاب تخلیق کار اور تصویر کار کا رُتبہ پانے والے اور احساس اور نقاش شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں اظہار کو موثر سی کیفیت ملتی ہے۔ ان کی شاعری میں ایسے الفاظ کا وافر استعمال ہے جو سرزمین کشمیر کے مظاہر فطرت اور کلچر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس قسم کی مقامی شناخت کئی شعراء کے زبان و بیان میں ملتی ہے جن میں حامدی کاشمیری شجاع سلطان، رفیق راز، وغیرہ شامل ہیں۔ پتھر اور آئینہ، برف، پیڑ اور ہوا، سورج، نقش اور رنگ وغیرہ الفاظ حکیم منظور کی شاعری کو استعاراتی وسعت سے ہمکنار

کرتے ہیں۔ ان کے کلام کے چار مجموعے شائع ہوئے ہیں۔

۱) ناتمام، ۲) لہولمس چنار، ۳) برف رتوں کی آگ، ۴) خوشبو کا نام نیا

حکیم منظور کی غزلوں میں نئی حیثیت، فکر کا تنوع، اسلوب کی جدت اور مشاہدے کے ساتھ ساتھ روایت شکنی کا رویہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ تخلیقی عمل کی ماہیت سے آگاہ ہیں۔ راج نرائن رازؔ کا یہ مشاہدہ قابل توجہ ہے۔

''حکیم منظورؔ کے یہاں جداگانہ فکری سطح پر الفاظ کے تخلیقی استعمال کی ایک علامت تجریدی تمثیل ہے جو بیک وقت اس کے انداز مشاہدہ اور اسلوب کا حصہ ہے''۔

محمو ہاشمی لکھتے ہیں:

''اس عہد کی غزل کو جس تحیّر، اضطراب اور خاموشی سے الفاظ تک سفر کرنے الی مفہوم کی تہہ دار تلوار کی ضرورت ہے۔ وہ سب کچھ حکیم منظورؔ کے اشعار کا سرمایہ ہے''۔

چند اشعار دیکھئے:

سوکھے ہوئے پیڑوں پہ ہواؤں نے لکھا ہے ۔۔۔ اس شہر کی مٹی میں نہ خوشبو نہ وفا ہے
چنار چہرے ہیں ان کی کوئی زبان نہیں ہے ۔۔۔ سلگ رہے ہیں مگر کہیں بھی دھواں نہیں ہے

☆

جہلم کے پانیوں کا مزا کون پی گیا؟ ۔۔۔ ایک دن بتائے گی یہ ہوا، آس ہے مجھے
ہیں کتنی پرخلوص اڑانیں پرند کی ۔۔۔ اک تازہ سمت پائے گا وشواش ہے مجھے

اِن کی آواز بیک وقت جانی پہچانی بھی ہے اور اجنبی بھی۔ ان کا ہنر اس میں ہے کہ وہ بظاہر ہر سادہ گو معلوم ہوتے ہیں لیکن بہ باطن تہہ داری اور معنی آفرینی کا حق بھی ادا کر جاتے ہیں۔

حکیم منظورؔ تنقیدی اور تاریخی مضامین بھی لکھتے تھے، جو ملک کے برگزیدہ اور صف اول کے جرائد میں چھپتے رہے ہیں۔ ڈپٹی کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد ناظم تعلیمات کے عہدے پر بھی تقریباً تین سال رہے۔

اپنے گردو پیش سے جو کچھ اخذ کیا ہے اس سے خوب صورت پیرائے میں پیش کر دیا ہے۔ اور اس طرح کہ جو بات بھی کہی ہے وہ عام روش سے ہٹ کر کہی ہے اور جو نقطہ بھی استعمال کیا ہے۔ اس سے معنویت عطا کر دی ہے۔ بحیثیت غزل گو حکیم منظورؔ لفظوں اور پیکروں کو بڑے لطیف ایمائی انداز سے برتتے اور خیال انگیز تصویریں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح حکیم منظورؔ ایک صاحب اسلوب شاعر ہیں۔ ان کے فکر و احساس کا سرچشمہ ان کی دھرتی کی اعلیٰ تمدنی، تہذیبی اور علمی روایات ہیں۔ اُنہوں نے کشمیر اور کشمیریت کے نقوش کو کمال سادگی سے علامتوں کے طور پر استعمال کیا اور انہیں مقامی سے آفاقی بنا دیا ہے۔

رفیق رازؔ کی غزل گوئی:

رفیق رازؔ چھٹے دہے یعنی 1960 عیسوی سے پہلے ہی سے لکھ رہے ہیں اور اپنے ماحول اور ذات کی کربنا کیوں سے آگاہ ہیں اور محسوس کر کے اُن کو شعر کا جامہ پہنانے کی مہارت رکھتے ہیں۔

سیلاب ہفت رنگ مری خامشی میں ہے
سہمے ہوئے سکوت کی چھکار مجھ میں ہے

ان کے تجربات کا عمل رواں دواں ہے اور وہ حسیاتی بھی ہے اور بصری بھی۔ ان کے فکر و احساس کی تازگی نمایاں ہے اور ان کے تجربات میں تہہ داری ہے۔ ایک بات جو واضح طور پر نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ رفیق رازؔ کی اُردو غزلوں کے مجموعے ''انہار'' کی شاعری جن شعری تجربوں کی روشنی بکھیرتی ہے اس کا پہلا نمایاں پہلو یہ ہے کہ رفیق رازؔ مضمون آفرینی کا نہیں احساس آفرینی کا شاعر ہے۔ ان کی غزلوں میں حسی تجربوں کا ایک سیل رواں نادر و نایاب تراکیب کی چادر اوڑھے خاموشی کے ساتھ سرحد ادراک کی جانب گامزن نظر آتا ہے۔

سرحد ادراک تک ہے خامشی چھائی ہوئی
تجربوں کا عجب سیل رواں ہے اور میں

رفیق رازؔ کا تخلیقی اور اظہاری رویۂ بھی ہم عصر شعراء سے قدرے مختلف ہے۔ کہیں سیال اور کہیں دھواں دھواں کیفیات و احساسات حد امکان تک پھیلے اور بلند ہوتے نظر آتے ہیں۔ قاری ان کیفیات و احساسات کے ساتھ بھی تجسس کبھی تشکیک، کہیں مرحلہ، شوق اور کہیں مقام حیرت سے گزرتا ہوا اس سرحد لامکان تک جا پہنچتا ہے جو اصلاً حیریم ذات ہے۔ طلسم خانہ ذات و صفات ہے۔

حلقہ ہست و بود میں کیا ہے
دیدہ تر کی وحشتوں میں اتر

پھیلی ہوئی ہے چار طرف گرد مہر و ماہ

روشن ہے میری آتش حیرت سے جلوہ گر

غرض رفیق رازؔ نادر و نایاب لہجوں کا شعر ہے۔ دھنک رنگ احساسات کا شاعر ہے جو خود اپنی ایک منفرد شعری جمالیات رکھتا ہے۔

شفقؔ سوپوری:

شفق سوپوری کا اصلی نام سید عبدالقیوم خطائی ہے۔ ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ 1991 عیسوی میں چھپ گیا ہے۔ کشمیر کی نئی نسلوں میں شفق سوپوری نہ صرف نسبتاً گہرے تخلیقی شعور کا احساس بھی دلاتے ہیں بلکہ وہ لفظ و پیکر کی فراوانی اور تازہ کاری کا احساس بھی دلاتے ہیں۔ ان کی شعری فضا میں حد بندی، یک رنگی اور گھٹن کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ آزادی، توسیع اور رنگارنگی کا احساس ہوتا ہے۔ شفق سوپوریؔ کے پاس اپنے داخلی تجربات کو اپنی پوری قوت اور تاثیر کے ساتھ قارئین کے سامنے ایک نئی اور معتبر آواز کے ساتھ پیش کرنے کیلئے الفاظ و محاورات کا ایک خزانہ ہے۔ وہ ایک منفرد انداز تحریر و اظہار کے مالک ہیں۔

خوشبو سی خواب میں تھی پہرے پنکھڑی تھی

میرے خیال میں بھی شہزادی سو رہی تھی

وہ بند کھڑکیوں میں خاموشیوں کی بستی

میں رات بھر صدائیں دیتا ہوا مسافر

فرید پربتی:

عصری ادبی منظرنامے پر جو روشن اور تابناک ستارے اپنی جگہ بنانے میں کامیاب و کامران ہوئے ان میں مرحوم فرید پربتی ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ کبھی وہ شاعر بن کر ابھرتے ہیں تو کبھی محقق و نقاد کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ کبھی عروض اصلاح کے تناور بن کر، تو کبھی خالص رباعی گو شاعر بن کر سامنے آتے ہیں غرض جس میدان میں بھی قدم رکھتے ہیں تو اس کو پامردی سے پامال کر کے دم لیتے ہیں۔ انکی شاعری میں قدیم و جدید کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ جس سے وہ ایک منفرد لہجہ تراشنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اُنہوں نے عمیق مطالعے اور گہرے مشاہدے سے ایک ایسی شعری دنیا تخلیق کی ہے جس کی نفسیاتی اور جمالیاتی ترسیل عام قاری کیلئے بھی تسلی اور تشفی بخش ہے۔ وہ زبان و بیان پر قدرت رکھنے کے باوجود سہل اور آسان پیرائے میں اپنے داخلی و خارجی احساسات و تجربات کو شعری پیکر دینے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

فرید پربتی نئی غزل کے شاعر ہیں۔ وہ نہ صرف موجودہ بحرانی صورتحال کا احساس رکھتے ہیں بلکہ وہ الفاظ کے ایمانی امکانات کی کھوج لگانے کی ضرورت کا بھی شعور رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے حقیقت کو اپنی نظر سے دیکھا اور پھر اپنے مشاہدات و احساسات کو اپنے اسلوب میں پیش کیا۔ وہ غزلوں کے مختلف رنگ آہنگ کا بھرپور شعور رکھتے ہیں۔

فرید پربتی کے اظہار میں ایک بے تکلفی کا جو احساس ملتا ہے اس سے اندازہ

ہوتا ہے کہ رباعی ان کے مزاج کو راس آتی ہے اور وہ اس سنگ صفت صنف کو پگھلانے اور اپنی پسند کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کہیں کہیں ان کے یہاں عصری اور تازہ حسیت کا عنصر آتا ہے مگر کئی اور جگہ پر وہ پرانی آوازوں کی بازگشت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ان کی یہ رباعی ملاحظہ ہو:

برباد ہوا صحن چمن رقص میں ہوں
ویرانہ بنا اپنا وطن رقص میں ہوں
باقی ہیں ارتباط روح و تن اب کے
رہبر ہے بہ شکل راہزن رقص میں ہوں

فرید پربتی کی شعری جمالیات کا نکتہ حوالہ اور محمور بالعموم وادی کشمیر کی زندگی ہے۔ اس کے دریا، چمن زار، سرسبز ماحول اور احساسی کیفیات کا حامل گردوپیش کا منظر نامہ ہے جو شاعر کے وجود کے رگ و ریشے میں گرم خون کی مانند گردش کرتا ہے۔ فرید ہمارے اُن شاعروں میں ہیں جو شعری روایت سے نہ صرف واقفیت رکھتے ہیں بلکہ وہ ہماری کلاسیکی شاعری اور اس کی بوطیقا سے حسب توفیق استفادہ بھی کرتے ہیں۔ جمالیاتی شعری روایت سے آگہی کے ساتھ اُنہوں نے اپنی فطرت کے عین مطابق ملک کی تمام تہذیبی، روحانی اور انسانی روایات و اقدار کا بھی گہرا عرفان حاصل کیا جس کے سبب ان کے ہاں تہذیب نفس اور تزکیہ نفس کے مرحلے آسان ہوتے ہیں۔

ابر تر 1987 عیسوی، آب نیساں 1992 عیسوی، اثبات 1995 عیسوی، فرید نامہ 2003 عیسوی اور گفتگو چاند سے 2005 عیسوی کے بعد ''ہزار مکان'' ان

کے شعری مجموعے ہیں۔

ڈاکٹر فرید پربتی کہنہ مشق شاعر، صاحب طرز نثار اور اردو کی تعلیم و تدریس سے متعلق باوقار نوجوان تھے۔ پرکشش اور دیدہ زیب شخصیت کے مالک تھے۔ فرید نامہ ان کا ایک اہم شعری کارنامہ ہے جو تمام تر رباعیات پر مشتمل ہے۔ وہ فطری طور پر جمال پرست ہیں اس لئے حسن و جمال کے مرقعے ان کی تحریروں میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایک ہمہ جہت قلم کار ہیں اور مختلف زاویوں سے قلم کا استعمال کرتے ہیں۔ خود پسندی، خود پرستی اور خود اعتمادی انہیں وہ قوت عطا کرتی ہے کہ وہ مشکلوں کا خاطر میں نہیں لاتے۔ حقائق حیات کا تجربہ، ذات کی روشنی میں حسن و جمال کا بے مثال مرقع بنا کر پیش کرنے لگتے ہیں اور کامیابی و کامرانی انہیں احساس تفاخر سے ہمکنار کر دیتی ہے۔

واقف میں ہر اک خواب کی تعبیر سے ہوں
میں حسن ہوں اور حسن کی جاگیر سے ہوں
کہتے ہیں مجھے یوسفِ ثانی اے دوست
کنعاں سے نہیں وادیٔ کشمیر سے ہوں

سیدہ نسرین نقاش کی غزل گوئی:

سیدہ نسرین نقاش اردو دنیا سے زیادہ متعارف نہیں تھیں، مگر ''دہشت تنہائی'' کی اشاعت کے بعد ان کی بیرونی دنیا سے کنارہ کشی ڈھل گئی اور دشت تنہائی سے گلشن رنگ و بو میں وارد ہوئیں اور ایک عالم کو متاثر کیا۔ غزل اور

نسرین دو مختلف نام اور اجسام ہیں مگر نسرین کی غزلوں کا جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ پھول خوشبوؤں کی تعریف کر رہا ہے اور خوشبو پھول کے حسن کی داد دے رہی ہے۔ خود سیدہ نسرین کا کہنا ہے ''کہ کائنات'' کا حسن میرا موضوع ہے اور اس میں حسن کو انسان کے کردار کا حصہ بنانے کی سعی میں اپنی سی کرنے میں منہمک ہوں۔ ان کا کلام زبان و بیان اور لب ولہجہ پیش نظر رکھتے ہوئے حسین اور شوخ الفاظ سے تعمیر ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے کلام میں اپنے ذاتی اور واردات سے حاصل شدہ احساسات وخیالات اور جذبات کو حسین و دِل کش رنگ میں پیش کرتی ہیں۔

نسرین بنیادی طور پر غزل کی شاعرہ ہیں۔ غزل کے چند اشعار دیکھئے:

کھل گئی ساری حقیقت ہم پہ تیرے شہر میں
تیرے چہرے پر لگا ایک اور چہرہ دیکھ کر

سیدہ نسرین کی غزل کی جو عروضی کیفیات ہیں وہی ان کے زرین مستقبل کی ضامن ہیں۔

خوابوں کو آسمان سے زمین پر اُتار کر
کاٹی ہے زندگی کی سزا تیرے شہر میں

ساری دنیا میں نظر آنے لگے تیرے نقوش
پردہ جب چشم بصیرت سے اٹھا کر دیکھا

سیدہ نسرین نقاش کی شعری کاوشیں انہیں ایک دن اردو کی قد آور خواتین شعراء کے درمیان لا کھڑا کریں گی اور اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے۔

شبنم عشائی کی شاعرانہ حیثیت:

شبنم عشائی کی شاعرانہ حیثیت 1993 عیسوی میں سامنے آ گئی۔ جب آپ کی کتاب ''اکیلی'' قارئین کی توجہ کا مرکز بنی۔ کتاب کے نام سے ہی اکیلی کی شاعرہ کا حساس اور کئی ذہنی و قلبی حادثات سے دوچار ذہن کھل کر سامنے آتا ہے۔ ان کی شاعری میں غم و اندوہ کا ایک دلچسپ فطری رقص ہے۔ یہاں آرزوؤں کے بازار سجے سجائے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے سفر میں کسی کو شریک کرنے کا شدید غم نہیں کرتیں بلکہ اکیلی جلتی ہوئی پیش آنے والے حادثات کو نقش بر سنگ کرتی چلی جاتی ہیں۔

اشرف عادل کا پہلا عشق:

اشرف عادل کا تعلق چونکہ جدید تر نسل سے ہے اسی لئے ان کا میلان طبع راست گفتاری کی طرف پایا جاتا ہے۔ یوں تو وہ ڈرامے اور مضامین بھی لکھتے ہیں مگر ان کا پہلا عشق شاعری ہے۔ اشرف عادل کی غزل لہجے اور طرز احساس دونوں اعتبار سے نئے لب و لہجہ اور احساس کی ترجمانی کرتی ہے۔ انہوں نے عشق و محبت کی بنیادی احساسات کے ہمراہ روح عصر کی تصویر کشی، جذبے کی شدت، شائستگی، اظہار کی صداقت، لہجے کے سوز و گداز کے ساتھ کی ہے۔ داخلی کیفیات کے ساتھ کائنات اور انسان کے رشتے پر جب وہ بات کرتے ہیں وہ سادہ بیانی اور راست گفتاری کو کہیں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عشق نہایت ہی متحرک اور قومی جذبہ بن کر ابھرتا ہے اور یہی جذبہ ان کی زندگی کی کڑکتی دھوپ اور تلخیوں کو گوارا بنانے میں مدد دیتا ہے۔

موسم گل نہ مجھکو بھاتا تھا
تیری چاہت نے خوش مزاج کیا

خوب اندھیروں نے ہم پہ راج کیا
پر نہ سورج سے احتجاج کیا

مظفر ایرج 1944 عیسوی:

وادی کشمیر کے ایک اہم شاعر کی حیثیت منوانے میں بہت حد تک کامیاب ہوگئے ہیں۔ اُنہوں نے شاعری غزل سے ہی شروع کی اور بعد میں نظمیں اور آزاد غزلیں بھی لکھی ہیں۔ ان کے کلام کے مجموعے شائع ہوگئے ہیں۔ ''ابجد'' 1983 عیسوی اور ''انکسار'' 1988 عیسوی۔

ایرج ایک مخلص اور پر اعتماد فطری صلاحیتوں سے مالا مال شاعر اپنے مخصوص انسانی اقدار کے نباض اور حقیقی محبت سے آراستہ وجود کو عالمی امن وسکون و آشتی کے حصول کیلئے کام کرتے ہیں اور اپنی شخصیت کی تکمیل کیلئے کام کر رہے ہیں۔ ان کی شاعری کی بنیادی خوبی یہی ہے کہ قاری اس سے فوراً مانوس ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ایرج کا لفظی وصوتی آہنگ ان عناصر سے تریب پاتا ہے جنہیں ہم کسی جماعت کی اجتماعی زندگی کی علامتوں کی ہی جہت سے پہچانتے ہیں۔ ان کی نظمیں ان کی غزلوں کی نسبت قدرے زیادہ کامیاب ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''نظم اور غزل دونوں میں مظفر ایرج نے انفرادیت سے کام لیا ہے اور اپنے لہجے کی شناخت کو طمانیت بخشی ہے''۔

شعلہ شعلہ صنوبروں میں اتار   پھر مجھے سوکھے جنگلوں میں اتار

اس موسم کی پہلی بارش گھر ٹوٹا   اشک کہ آنکھوں سے ٹپکا اندر لوٹا

شبیب رضوی:

شبیب رضوی کا تعلق اصل میں تو اتر پردیش سے ہے مگر اُنکی شادی یہاں ہی ہوگئی ہے اور وہ اب یہاں کے ہی ہیں۔ وہ ہمیشہ سے اردو شعری سرمائے میں ہر رنگ میں اضافہ کرتے رہے۔ ان کی مادری زبان چونکہ اردو ہی ہے اس لئے وہ زیادہ وسعت اور اعتماد کے ساتھ اپنی تخلیقی کاوشیں بروئے کار لاتے ہیں۔ وہ نظمیں بھی لکھتے ہیں اور غزلیں بھی لکھتے ہیں۔

ان کا اپنا جداگانہ رنگ ہے۔ وہ اپنے نئے تصورات اور حالات کی روشن میں ذاتی تجربات کی تخلیقی باز آفرینی سے بھی کام لیتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور اپنی شخصی سطح پر محسوس تجربات کو بھی زبان دیکر اپنا ایک مخصوص انداز اظہار و بیان رکھتے ہیں۔

بہت آسیب ہے یہ آگہی بھی
بدل ڈالا مزاج و ہر کس نے

سمتوں کو خود شناسی کا اس سے پتہ ملا
جو سنگ میل نصب میری رہ گذر میں تھا

غلام نبی ناظرؔ 1935 عیسوی:

ناظرؔ کے اشعار میں عام طور پر پامال مضامین سے گریز اور نئی بنجر زمینوں میں پھول کھلانے کا حوصلہ نظر آتا ہے اور ایسے بصری پیکر ابھرتے ہیں جن پر اپنے زمانے کی چھاپ ہے۔

کھنڈروں کی کھول کر دیکھی کتاب
پڑھ لیا پھاڑا ورق تاریخ کا

ناظرؔ اپنے زمانے کے آشوب میں پوری طرح ڈوبا ہوا ہے۔

شجاع سلطان:

شجاع سلطان کی غزلوں کے مطالعے سے سب سے پہلے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے اشعار میں زبان کا غیر پیچیدہ استعمال ہوتا ہے۔ ان کے استعارہ و پیکر بھی غیر ضروری طور پر مبہم نہیں ہوتے ہیں۔ معنوی اعتبار سے بھی ان کی شاعری اور قدروں کے کھوکھلے پن کا احساس ہے جو ان کی شاعری میں طرح طرح کے لفظ و پیکر میں اظہار پاتا ہے۔ شجاع مصور بھی ہیں اور شاعر بھی۔ ان کی شاعری کی ایک اور خصوصیت فکر و جذبہ اور نقطہ و آہنگ کی وحدت اور ہم آہنگی ہے۔ ان کے اشعار میں غیر ضروری الفاظ یا خیالات کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ وہ اپنے احساسات اور تجربات کا براہ راست اظہار نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کو تخلیقی عمل کی میزان سے گزر کر ہی سامنے لاتے ہیں۔ ان کا منفرد انداز شعر کی جھلک مندرجہ ذیل شعروں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اسی کے ذکر سے روشن ہیں بام در اپنے
اگر سنے گا تو سب روشنی بجھا دے گا

زمانہ بیت گیا راستوں نے سوچا تھا
وہ آئے گا تو کچھ اک سنگ ہی ہٹا دے گا

ہم ایسے شعلہ بکف سوچتے رہے اکثر
کریں جو گھر پہ وہ چنگاریاں کہاں کی تھیں

موجودہ دور میں اردو شعرا کی ایک نئی کھیپ:

ریاست کے نوجوان شعرا تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔ نئی حیثیت اور عصری آگہی کا اظہار ان کے اشعار میں زبان و بیان کے نئے پن اور لہجے کی تازگی کے ساتھ فنی تنظیم اور دیگر نزاکتوں کے شعور کے ساتھ ہوتا ہے۔ رفیق راز، رخسانہ جبیں، نذیر آزاد، سیدہ نسرین نقاش، شبنم عشائی اور شفق سوپوری موجودہ دور کے ایسے شعرا ہیں جنہوں نے اپنے کلام کے مخصوص انداز اور مواد کی جدت اور زبان پر اپنی گرفت کی وجہ سے اپنے لئے خاص جگہ بنالی ہے اور کشمیر اُن کی اردو شاعری پر بہت حد تک ناز کرسکتا ہے۔

اشرف ساحل:

ان کی شاعری میں نقطہ پیکر کا استعمال اس قدر منفرد ہے کہ ان کی شاعری دور سے پہچانی جاسکتی ہے۔ اُنہوں نے غزلیں اور نظمیں برابر فن اور تخلیقی قدرت کے

ساتھ کہی ہیں۔

غلام محمد آجر:

آجر غزلوں سے زیادہ نظموں میں ہی کامیاب نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اساطیر کا استعمال اپنی نظموں میں بڑی موزونیت سے کیا ہے۔ ان کی نظمیں ان کی غزلوں کے مقابلے میں فکری بلندی کا پتہ دیتی ہیں۔

پرتپال سنگھ بیتاب:

اپنے منفرد اسلوب شعر کی بشارت اپنی نظموں اور غزلوں میں الگ الگ طور پر دیتے ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام ''پیش خیمہ'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ الفاظ کی نئ معنوی جہتیں اپنے تجربات اور احساسات کے تناظر میں تلاش کرتے ہیں۔

فاروق مضطر:

ان کی شاعری جدید دور کی پیدا کردہ الجھنوں اور خوف و تردد کی داستان ہے۔ ان کی شاعری ریاست کی نمائندہ شاعری میں شمار کی جاتی ہے۔ وہ اپنے تجربات اور احساسات کا اظہار مناسب اور موزوں پرائے میں کرتے ہیں۔

اقبال فہیم:

غزل اور نظم دونوں میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور منفرد اسلوب کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں فلسفیانہ انداز فکر جھلکتا ہے۔ ان کی اکثر غزلوں اور نظموں میں خوابوں اور حقیقتوں کا ٹکراؤ ملتا ہے۔ ان کا مجموعہ کلام ''سنگ برآب'' ایک سوچتے ہوئے محسوس کرتے ہوئے ذہن کے اظہار کا بہترین نمونہ ہے۔

شاہباز راجوروی:

شہباز کی غزلوں میں ان کے نیم واقع اور نیم مبہم تجربات کا اظہار ملتا ہے۔ ان کی زبان ان کے تجربات اور احساسات کا پورا پورا ساتھ دیتی ہے۔ وہ عصری زندگی کی تمام الجھنوں سے واقف ہیں۔

فاروق آفاق:

آفاق کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ ان کا شعری اسلوب نئی منزلوں کا پتہ دیتا ہے۔ وہ زندگی کی حقیقتوں سے آنکھیں چراتے نہیں ہیں بلکہ ان کو عریاں دیکھنا چاہتے ہیں۔

وہ اپنے گردوپیش سے اپنے تجربات حاصل کرتے ہیں۔ موجودہ دور کا سیاسی انتشار بھی ان کے شعر کا ایک موضوع ہے۔ ان کی شاعری کا ایک اہم پہلو طنز کا ہے۔ اس پہلو کی وجہ سے ان کی غزلوں میں معنوی تہہ داری وجود میں آتی ہے۔

بہر حال تازہ ترین شعراء میں احمد شناسؔ، مسعود ساموںؔ، جاوید آذرؔ، سید رضاؔ، رخسانہ جبیںؔ، خالد بشیرؔ اور اشرف عادلؔ کی شاعری امکانات سے بھری ہے۔ خالد بشیرؔ کی شاعری جیسا کہ اُن کے مجموعہ کلام 'صدائے نیم شب'' سے ظاہر ہے، ایک متوازن لہجے کی شاعری ہے۔ ریاست میں جہاں تک اردو کا تعلق ہے، نثر کے مقابلے میں شاعری کی طرف رجحان زیادہ ہے۔ یہ رجحان صرف ریاست میں ہی نہیں بلکہ ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی ہے۔

ریاست کی اردو شاعری میں قومی یکجہتی اور حب الوطنی کے عناصر

(1947 عیسوی کے بعد)

ہمارے ملک کے لوگ قومی یکجہتی کی تشکیل اور اس کے فروغ کے سلسلے میں اکثر و بیشتر گنگا جمنی تہذیب کی بات کیا کرتے ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دنیا کا یہ عظیم ملک اپنے آپ میں گنگا جمنی تہذیب کا انمول خزانہ ہے اور اسی سبب کروڑوں نفوس کی آماجگاہ یہ خطہ زمین جنت نشان بنا ہوا ہے۔ انصاف اور حقیقت کی رو سے یہاں کی تمام زبانوں میں اردو کو ہی یہ فخر و امتیاز حاصل ہے کہ اس نے ہندوستان کی اس متبرک اور خوبصورت گنگا جمنی تہذیب کو اپنے دامن میں ایسا سمیٹ لیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم بن کر رہ گئے ہیں۔

اردو شعر و ادب کی تاریخ گواہ ہے کہ ہر دور میں اور تقریباً ہر خطے میں ایسی رنگارنگ شعری نثری تخلیقات پیش کی گئی ہیں جن کے ذریعہ وطن دوستی، وسیع المشربی اور اخوت ومحبت کے جذبات کو عام کرنے میں خاص مدد ملی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اردو شعراء اور ادباء نے قومی اتحاد اور یکجہتی کے موضوع پر ایک اچھا خاصا سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے احساس اور جذبے کا اظہار امیر خسرو ہی سے شروع ہو جاتا ہے جن کے شاعرانہ کلام اور لب ولہجہ میں ہندوستانی تہذیب کی روح دھڑکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اصل میں اردو زبان و ادب کا خمیر ہی ہندوستانی تہذیب کے رنگا رنگ عناصر سے ابھرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں شروع ہی سے محبت، اخوت اور رواداری کی تعلیم ملتی ہے جس سے صوفیا کی انسان دوستی اور صلح کل کے مسلک نے ایک موثر اور دیرپا رجحان کی شکل دے دی۔

انیسویں صدی کے اواخر میں اردو شاعری نے آزاد و حالی کی سرکردگی میں ایسا رُخ اختیار کیا جو انتہائی باوقار اور صحت مند تھا۔ اس کے تحت خالص وطن پرستی اور ہندوستانی مناظر پر نظمیں تخلیق کرنے کا رجحان عام ہوا۔ خود حالؔی نے ''مناجات بیوہ'' ''چپکی داد''، ''تعصب و انصاف''، ''برکھارت''، اور ''حب وطن'' جیسی تخلیقات سے اردو شاعری میں بیش بہا اضافے کئے جس سے بعد میں علامہ اقبالؔ نے بلندیوں پر پہنچا دیا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں لکھنو کے شعراء میں نادر کوردی، اسماعیل میرٹھی، صفی لکھونی اور پنڈت برج نرائن چکبستؔ نے وطنی وسیاسی نظموں میں دوستی، اخوت، پیار، انسانیت، رواداری اور بھائی چارگی کا جو درس دیا وہ ہمارا قیمتی اثاثہ ہیں۔ پنڈت برج نرائن چکبستؔ کا تمام تر کلام وطن پرستی کے نغموں سے معمور ہے۔ اُنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ہندوستانی عوام کو آزادی، سچائی اور دوستی کی اہمیت بتائی اور انہیں غلام ہونے کا احساس دلایا۔

بہر حال اردو کی قومی اور وطنی شعری کا مرکز و محور قومی یکجہتی اور حب الوطنی کے جذبے سے عبارت ہے۔ اس میں ہماری قومی اور تہذیبی زندگی کے مراحل اور رنگارنگ نقوش کی جلوہ گری ہے۔ یہ شاعری اس لحاظ سے بھی اہم اور قیمتی ہے کہ اس میں ہمارے شعراء نے اپنے احساسات اور تجربوں کے منفرد اور نادر نقوش یادگار چھوڑے ہیں، جن کی ادبی، فنی اور تاریخی قدر و قیمت کبھی کم نہ ہوگی۔

ریاست جموں و کشمیر کے اردو شعراء کی شاعری میں قومی یکجہتی:

تقسیم ملک کے بعد رونما ہونے والے خونین فسادات نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک ہولناک گھاؤ پیدا کیا۔ چنانچہ تقسیم کے بعد بداعتمادی کی ایسی فضا قایم ہوئی جس نے قوم پرستی، یکجہتی اور ہم آہنگی کے اقدار کو اندر سے کھوکھلا کر دیا۔ ملک کو ایسے ہولناک ماحول سے نکالنے اور عوام کو اخوت، محبت، حب الوطنی اور قومی یکجہتی کا درس دینے کیلئے شاعروں اور ادیبوں کی ایک فوج سامنے آ گئی۔ ایسے حالات میں جموں و کشمیر کے شاعر اور ادیب اپنی قومی اور انسانی ذمہ داریوں سے کیسے دامن بچاتے۔

ملک کے دوسرے خطوں کی طرح ریاست جموں و کشمیر میں بھی شاعروں نے قومی یکجہتی، سیکولرازم، اخوت، حب الوطنی اور انسانی اقدار کی پاسداری کیلئے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا۔ جموں و کشمیر کے جن شعراء نے اپنی نظموں میں قومی یکجہتی کا پرچار کیا، ان میں خاص کر نشاط کشتواڑی، عابد مناوری، تنہا انصاری، غلام رسول نازکی، فاضل کشمیری، اندر جیت شرما، شہ زور کاشمیری، مسعود حسن مسعود، ہر بھگوان شاد،

مہندر رینہؔ، گردھاری لعل برقؔ، گرداری لعل آننؔد کے علاوہ دیگر کئی شعراء قابل ذکر ہیں۔ ابتدائی دور میں پنڈت نندلال بے غرضؔ، پنڈت نندلاکول طالبؔ، دینا ناتھ چکن مستؔ، کشن سیمپوریؔ اور نرسنگھ سہائے شوقؔ وغیرہ نے قومی اور مذہبی موضوعات پر اچھی نظمیں کہی تھیں۔ جموں وکشمیر کے جن اردو شعراء نے قومی یکجہتی کو اپنی نظموں کا خاص موضوع بنایا ان میں نشاط کشتواڑیؔ نمایاں ذکر کے قابل ہیں۔

نشاطؔ کشتواڑی کی شاعری میں قومی یکجہتی اور حب الوطنی کے عناصر:

غلام رسول نشاطؔ کشتواڑی 1909 عیسوی میں کشتواڑ میں پیدا ہوئے۔ معاشی حالات خراب ہونے کے سبب مرحوم کو اپنی تعلیم آٹھویں جماعت میں ہی چھوڑنا پڑی مگر مطالعہ کے شوق نے انہیں ذہنی طور پر بہت پختہ بنا دیا تھا۔ سرزمین کشتواڑ میں چونکہ زمانہ قدیم ہی سے شعری اور ادبی ماحول زوروں پر رہا ہے لہٰذا اس اثر نے نشاطؔ کشتواڑی کو بھی شعر کہنے کی طرف مائل کیا۔ مرحوم سیماب اکبرآبادی کے شاگردوں میں سے ایک تھے۔

نشاطؔ کا شعری مجموعہ 1988 عیسوی میں ''تصویر خیال'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ کتاب کے حصہ سوم میں ''بادہ وطن'' کے عنوان سے حب الوطنی اور قومی یکجہتی کے جذبے سے معمور متعدد نظمیں شامل ہیں۔ ان میں ''اپنے وطن کی سرزمین''، ''قومی یکجہتی''، ''ہم ہندوستانی ہیں''، ''گل فروش کی صدا''، ''پیغام آزادی''، ''فرقہ پرستی'' ایسی نظمیں ہیں جو نشاطؔ کشتواڑی کے جذبہ ملت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ ''قومی یکجہتی'' کے عنوان سے نظم میں نشاطؔ نے ملک کے عوام کو یکجہتی کا درس

خوبصورت پیرائے میں دیا ہے:

یک جہتی کی شمع جلاؤ/ یک جہتی کا ساز بجاؤ/ اہل وطن کی جان یہی ہے۔

نشاطؔ نے جہاں ''گُل فروش کی صدا'' میں فطرت کے مظاہر کو ہم آہنگی کا آئینہ قرار دیا ہے وہیں ''پیغام آزادی'' میں فطرت اور فرقہ پرستی کے طوفان کا وجود مٹا کر یوم آزادی منانے کا پیغام دیا ہے۔ وہ نظم ''فرقہ پرستی'' میں فرقہ پرستی کو ملک اور عوام کیلئے عفریت قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف نفرت کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

بازار قتل خون کا ہے یہ فرقہ پرستی

کتنی ذلیل وخوار ہے یہ فرقہ پرستی

نشاطؔ اہلِ وطن کو اتحاد اور رواداری کا پیغام دیتے ہوئے کہتے ہیں:

محفل میں اتحاد کی شمعیں جلاؤ تم

گلشن میں اتفاق کے گل بھی کھلاؤ تم

دیر و حرم کی اور کلیسا کی کیا خطا!

دل میں کدورتیں ہوں تو مذہب سے کیا گلا

آزادی کے بعد سیاسی ٹھیکداروں نے اردو زبان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا، اس بارے میں مصنف نے بعض ایسی نظمیں ''فغانِ اردو'' کے عنوان سے قلم بند کی ہیں، جو اہلِ وطن کے دلوں میں اردو زبان کے تحفظ کیلئے موثر جدوجہد جاری رکھنے کا عزم پیدا کردیتی ہیں۔ مرحوم نشاط کشتواڑی اردو کے پاسبانوں سے خطاب

کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

کہیں یہ شمع اردو بجھ نہ جائے ہوش میں آؤ
کہیں پروانوں پر آفت نہ آئے ہوش میں آؤ

اٹھو اردو کے دیوانو، ذرا بیدار ہو جاؤ
بھنور سے اپنی کشتی کو بچا کر پار ہو جاؤ

یہ وہ اردو زبان ہے جنگ آزادی لڑی جس نے
وطن کی پاسبان ہے جنگ آزادی لڑی جس نے

مٹیں گے خود مگر اردو کو ہم مٹنے نہیں دیں گے
کسی کو اس زبان پر وار ہم کرنے نہیں دیں گے

نشاط صاحب اردو زبان کے ایک سچے عاشق تھے لیکن جس ملک میں یہ زبان پلی اور بڑی اس سرزمین کی تہذیب، کلچر اور ثقافت سے مرحوم کو کس قدر محبت تھی، اس کا اندازہ ان کے شعری مجموعہ ''بادۂ وطن'' جو 1984 عیسوی میں اشاعت پذیر ہوا سے لگایا جا سکتا ہے۔ ''بادۂ وطن'' مرحوم کشتواڑی کا حب وطن سے بھرپور منظومات کا مجموعہ ہے۔ اس میں کل 18 طویل نظمیں شامل ہیں۔ یہ تمام نظمیں وطن کے ساتھ ایمانداری برتنے اور انسان دوستی کا درس دیتی ہیں۔ نظم ''ہم ہندوستانی ہیں''، میں اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اتفاق برکتوں اور رحمتوں کا ایک بہترین عمل ہے اور ہمیں اسی عمل کا سہارا لے کر ایک دوسرے کا ساتھ دینا چاہئے۔

اس گلشن میں رہنا ہے کہ ہم ہندوستانی ہیں
یہیں اپنا ٹھکانہ ہے کہ ہم ہندوستانی ہیں

کبوتر ہیں ہم اس گلشن کے بلبل بھی ہیں شاہین بھی
یہ اپنا آشیانہ ہے کہ ہم ہندوستانی ہیں

قومی یکجہتی اور حب الوطنی کے حوالے سے نشاط کشتواڑی کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات بنا کسی قباحت کے کہی جاسکتی ہے کہ مرحوم جموں وکشمیر کے ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے واحد ایسے شاعر ہیں جنہوں نے ان عناصر کو اپنی شاعری میں زیادہ ترجیح دی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو ان کی شاعری اردو زبان سے محبت روا رکھنے کے جذبے قومی یکجہتی اور حب الوطنی کے عناصر پر مبنی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

رسا جاودانی کی شاعری میں انسان دوستی کے عناصر:

رسا جاودانی کا پہلا شعری مجموعہ ''لالہ صحرا'' جب شائع ہوا تو ادبی حلقوں میں ایک تازہ آواز کے طلوع ہونے کا شدید احساس پیدا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے رسا کو لوگ ایک شاعر کی حیثیت سے دور دور تک جاننے پہچاننے لگے۔ رسا نے اپنا دوسرا شعری مجموعہ ''شبستان'' طباعت کیلئے جب تیار کیا تھا تو وہ 1947 عیسوی کے خونین فسادات کی نذر ہو گیا۔ 1962 عیسوی میں نظم ''ثریا'' نام کا شعری مجموعہ منظر عام پر آ گیا اس مجموعے کا مقصد اردو زبان وادب کے نامور محقق اور استاد ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے تحریر کیا ہے۔ ''لالہ صحرا'' کے مصنف نے جس دنیا میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی اس میں کوئی پیچ وخم نہیں، بناوٹ نہیں، پُر کار نہیں اور یہی

ماحول اس کی شاعری پر چھایا ہوا ہے۔ سادگی، بے لوثی اور گداز، رسؔا کی شاعری ہے۔اس کے سوا کچھ نہیں۔ رسؔا جاودانی کی غزل کا لب ولہجہ صبرو استقلال اور ضبط احتیاط کے سوتوں سے پھوٹتا ہے۔

رسؔا جاودانی کی غزل کا بغور مطالعہ اس بات کو روشن کرتا ہے کہ وہ صالح اقدار کے شیدائی، خلوص و ایثار کا مجسمہ اور ایک سچے مسلمان تھے۔ ان کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جو حقیقی مذہبی اقدار کے ساتھ انسان دوستی اور انسان پروری کا بلاواسطہ سبق پڑھاتے ہیں: ؎

میری شاعری میری ساحری ہے خیال الفت سے بھری
نہیں یہ رجز کی فسوں گری مگر آشتی کا پیام ہے

مجھے ایسے مذہب سے اے رسؔا نہ واسطہ ہے نہ رابطہ
جہاں خون مردم حلال ہے جہاں سرخ پانی حرام ہے

مختصر یہ ہے کہ رسؔا کی شاعری عظیم ترین انسانی اقدار سے مامور ہے۔ جذبوں کی تلازمہ کاری قاری کو رنگ و نسل اور مذہب و ملت کی دیواروں سے نکال کر ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیتی ہے جہاں محبتوں اور شفقتوں کی حکمرانی ہے اور جہاں ہر طرف یگانگت اور وحدت کے پھول مہک رہے ہیں۔ ان کی غزل مجموعی اعتبار سے انسان کو تنگ نظری کی کم ظرفی سے اوپر اٹھا کر قلزموں کی وسعتوں کا شناور بنا دیتی ہے۔

عاشقی ہے در حقیقت دل کی بیداری کا نام
بے خودی نادان رکھ دیتے ہیں ہوشیاری کا نام

رسؔا جاودانی کا تعلق بھدرواہ کشمیر کے دور اُفتادہ علاقے سے ہے جو اپنی

شاندار روایات کیلئے پوری ریاست جموں وکشمیر میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے۔اس ادب نواز علاقے سے ایسی شعری آوازیں ابھری ہیں کہ ابھی تک فضاؤں میں ان کی گونج سنائی دے رہی ہے۔

عابد مناوری:

عابد مناوری کے تصورات اخوت اور شعور ملّت کی سرحدیں صرف اپنے ملک تک محدود نہیں ہیں بلکہ وہ عالمگیر امن صلح اور بھائی چارے کے خواہاں ہیں۔ان کی نظمیں ''اے مادر ہندوستان''، ''ہم لوگ''، ''میرا وطن''، وغیرہ اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں۔مادر ہندوستان میں وہ اپنے ملی جذبے کا اظہار کر کے اہلِ ہند کے ان اقدار کا تذکرہ کرتے ہیں جو انسانیت کی بقا کیلئے عالم میں مشہور ہیں۔

نظم'' میرا وطن'' میں عابد مناوری نے کشمیر کے حوالے سے جہاں پنڈت نہرو، چکبستؔ، رام دھن کا ذکر کیا وہیں غنی کاشمیریؔ اور مہجورؔ کا تذکرہ کر کے اخوت کے ساتھ ساتھ لسانی اور علاقائی ہم آہنگی کا خوبصورت مظاہرہ کیا ہے۔عابد مناوری کا مطالبہ ہے کہ آدمی آپس میں بھائی چارے اور پیار کے ساتھ رہیں، کوئی دیوار انہیں جدا نہ کرے۔

شہ زور کاشمریؔ:

شہ زور کاشمریؔ کا شمار مسلم الثبوت اساتذہ میں ہوتا ہے۔ان کی تربیت میں کشمیر کے متعدد شاعروں نے سخن وری کے رموز کا عرفان حاصل کر کے اردو شاعری کی تاریخ میں اپنے لئے خاص جگہ بنائی ہے۔ان کی غزلوں کو اردو غزل کی متمول

روایت کی توسیع کہا جا سکتا ہے۔ اُنہوں نے بعض نظموں میں فسادات کے خلاف کھل کر اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کیا ہے۔ نظم ''ترانۂ سالار'' کی نظم ان کے مجموعہ کلام ''کیف عزم'' میں شامل ہے۔ پوری نظم امن، دوستی اور حب الوطنی کی ترجمان ہے۔ اس پوری نظم میں انسانی اقدار کی پامالی کے خلاف نفرت اور احتجاج کا جذبہ موجیں مارتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ؎

بڑھو محاذ کی طرف
بڑھاؤ، عظمت سلف
کہ تم بڑوں کی لاج ہو
بڑھے چلو، بڑھے چلو
......دلاورو، بہادرو......!

شورؔیدہ کاشمیری:

شورؔیدہ کاشمیری نے اپنی نظموں ''شعور آزادی'' اور ''غزل آزادی'' میں اس آزادی پر طنز کیا ہے جو بیش بہا قربانیوں کے بعد بھی عوامی خواہشات اور توقعات کے یکسر منافی ہے۔ اُنہوں نے ایک اور نظم ''لیڈروں سے'' میں قوم کے ایسے نام نہاد قائدین پر طنز کے تیر چھوڑے ہیں جو منافرت کی تلوار سے قوم کو دولخت کرنا چاہتے ہیں۔

شورؔیدہ کی نظم ''پیام آزادی'' کے یہ شعر ملاحظہ فرمائیں: ؎

مہاتما ہو کہ نہرو کہ قائد اعظم ہر اک کے ہاتھ ہوا اہتمام آزادی
جو راہی آگے بڑھے ہیں بنام آزادی ملا ہے ان کو بالآخر مقام آزادی

فاضل کشمیریؔ ، تنہا انصاریؔ، مکیش کاشمیریؔ بھی اساتذہ شعروسخن میں شمار ہوتے ہیں۔ مکیش کے دونوں شعری مجموعوں، ''بال عنقا'' اور ''شہپر طاؤس''، میں اعلیٰ شاعری کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اُنہوں نے رواداری، حب الوطنی، اخوت اور قومی یکجہتی کو تبلیغ وترویج کو اپنا فلسفہ حیات بنایا تھا۔

قومی یکجہتی کے مفہوم میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا یہ ایسا آلہ ہے جس سے ساری قوم ایک لڑی میں پرویا جاسکتا ہے۔ اس سے ہم کثرت میں وحدت کا نام بھی دے سکتے ہیں یعنی کسی ملک میں رہنے والے مختلف اقتصادی، سیاسی، تمدنی، لسانی، مقامی اور مذہبی اختلافات کو ختم کر کے ایک سطح پر لانا قومی یکجہتی کہلاتا ہے۔ جذباتی ہم آہنگی قومی یکجہتی کی بنیادی شرط ہے۔ اردو شعروادب کی تاریخ گواہ ہے کہ ہر دور میں تقریباً ہر خطے میں ایسی رنگا رنگ شعری ونثری تخلیقات پیش کی گئی ہیں جن کے ذریعہ وطن دوستی، وسیع المشربی اور اخوت ومحبت کے جذبات کو عام کرنے میں خاص مدد ملی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اردو شعراء اور اُدباء نے قومی اتحاد اور یکجہتی کے موضوع پر ایک اچھا خاصا سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ یہاں ریاست جموں وکشمیر میں جن اردو شعراء نے قومی یکجہتی کو اپنی نظموں کا خاص موضوع بنایا۔ ان میں نشاطؔ کشتواڑی، عرش صہبائیؔ، رسا جاودانیؔ، شہ زور کاشمیریؔ، شوریدہؔ کاشمیریؔ، مکیش کاشمیریؔ، مہندر رینہ، ہر بھگوان شاد، مسعود حسن مسعود، اندر جیت شرما، غ۔م۔طاؤسؔ، فاضل کشمیریؔ، اور تنہا انصاری قابلِ ذکر شعراء ہیں۔

ریاست میں اہلِ کشمیر کا عظیم سیکولر تمدن

اور اردو کا سیکولر کردار (ماضی تا حال)

ہندوستان کی جغرافیائی اور تاریخی وحدت مذہبی روحانیت، باہمی یگانگت، اخلاقی اور سماجی اقدار کی ہم آہنگی، معاشی مسائل کی یکسانیت، رسم و رواج کی یک رنگی، انسانیت کی تعظیم کا جذبہ، مشترکہ لسانی شعور جیسی خوبیاں ہندوستانی تہذیب کے وہ عناصر ہیں جو ہندوستانی عوام کو کثرت میں وحدت کا جلوہ دِکھا کر ایک تہذیبی اتحاد عطا کرتے ہیں۔ ہندو بھگتوں اور مسلم صوفیوں نے اس اتحاد کو مضبوط کیا ہے۔ اُنہیں لوگوں نے مذاہب اور اقوام کے مابین عقائد و رسوم کی خلیج کو پاٹ کر ہندو مسلمانوں میں زبردست تال میل پیدا کیا۔ کثرت میں وحدت کے رشتے کو اربابِ قوت کے جبر و تشدد سے نہیں بلکہ عارفوں کے وجدان سے، فلسفیوں کی فکر سے، زاہدوں کی ریاضت سے اور فنکاروں کی تخیّل سے قوت ملی ہے۔

عرؔفی نے دِل کھول کر کشمیر کی تعریف کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کشمیر آ کر ایک سوختہ جان شخص بھی تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ اسکی ہوا میں کچھ ایسی لطافت ہے کہ نسیم سحری معلوم ہوتی ہے کہ جنت کشمیر کے دروازہ پر آ گئی ہے۔ یہاں کے سبزے، چشمے،

لالہ گل کی شرح کرنا آسان نہیں۔ یہاں لالہ کی پیداوار ہے کہ پتھر اور تیشے کے منہ سے بھی لالے ہی نکلتے ہیں۔ وادی کشمیر کی یہ سرزمین شاعر کا تخیل اور مغنّی کا ساز ہے۔ یہ حسن پرستوں کی عبادت گاہ ہے۔ ہرے بھرے جنگل اور خوبصورت وادیاں قدرت کے ہاتھوں سجائے ہوئے اس شاہکار جنت میں اپنی عظمت کی داستان زبانِ حال سے بیان کرر ہے ہیں۔

حُسن ونذاکت کی اِس بے پایاں دولت کے علاوہ اسی جنت میں بسنے والے لوگوں کو اور بھی کچھ قدرت کی جانب سے عنایت ہوا ہے۔ جس پر ہمیں فخر محسوس ہورہا ہے اور جسے ہم سب کچھ پر اولیت دینے میں حق بجانب ہیں۔ یہ عظیم اور گران قدر عنایت ہمارا وہ شاندار سیکولر تمدن ہے جو ہمیں اپنے اسلاف سے ورثے میں ملا ہے۔

اولین تاریخ کشمیر نیل مت پران، کلہنؔ کی راج ترنگنی، محمد اعظم دیدمری کی تاریخ واقعاتِ کشمیر، حَسن کو یہامیؔ کی تاریخ حسن اور ایسی چھوٹی بڑی تاریخیں ہماری عظمت پارینہ اور سیکولر تمدنی، تہذیبی اور سماجی روایات کی آئینہ دار ہیں۔ شیومت اور اسلامی فلسفہ کے امتزاج سے ہمارے مشترکہ اور عظیم تہذیب وتمدن کی بنیادیں مضبوط ہوگئی ہیں۔ للہؔ عارفہ اور حضرتِ شیخ نورالدین نورانی: ولی نے سرزمین کشمیر پر یکسانیت، بھائی چارے، انسانی محبت اور عظمت عرفان اور مساوات کے گیت عام لوگوں کی سیدھی سادی روزمرہ کی زبان میں گا کر کشمیری ادب اور کلچر کی سیکولر بنیادیں مضبوطی سے ڈالدیں۔ آج ہمارے ادب اور کلچر پر انہی دو عظیم شخصیات کی پوری چھاپ ہے جس کی بدولت ہمارے ادب اور کلچر کے سیکولر کردار کو تمام برصغیر میں اپنا

الگ اور انفرادی مقام حاصل ہے۔

حضرت سید علی ہمدانیؒ اور بُلبل شاہ صاحبؒ نے دینِ اسلام کے چراغ روشن کر کے ارضِ کشمیر کو منور کر دیا تو ان تمام نظریات اور فلسفوں کے میل ملاپ سے یہاں صوفی ازم کا ایک نیا فلسفہ ظہور پزیر ہوا جس کے بنیادی اصول اسلام اور دوسرے مذاہب کے نظریات سے ہم آہنگ تھے۔ اسی صوفی اِزم نے ہمارے ادب اور کلچر پر دائمی چھاپ ڈالدی۔ صوفی اِزم کے اسی دائرہ اثر میں تمام مذاہب کے عالم و فاضل آ گئے اور یہاں تمام مذاہب کے میل ملاپ کی بنیاد پڑ گئی۔ ہندو یوگیوں اور مسلم صوفیوں کے طریقہ عمل میں یکسانیت تھی۔ اس امتزاج اور ہم آہنگی کی وجہ سے صوفی ازم کا یہ روپ کشمیری مزاج کو راس آیا۔ کشمیری صوفی ازم کے اس فلسفے کے بنیادی اصولوں کے مطابق مذہبی ظاہر داری اور رسم و رواج کے برخلاف روحانیت پر زور دیا جاتا تھا۔ مسلم صوفیوں اور ہندو یوگیوں کا یکسان نظریہ یہ ہے کہ انسان اصل حقیقت یعنی خدا کے ساتھ ایک ہو کر انسانیت کی تکمیل کر سکتا ہے۔ نیک اعمال ضبطِ نفس، دل و دماغ کی صفائی سے خدا کا قرب حاصل کیا جا سکتا ہے۔

کشمیر کے عظیم صوفیوں اور رشیوں میں علمدار کشمیر حضرتِ شیخ نورالدین ولیؒ اور للّہ عارفہ کے نام سرفہرست ہیں۔ صوفیوں اور رشیوں کی ان عظیم شخصیات میں بابا سنت رشی، بابا روپ رِشی، جوگی رشی، بابا صدرالدین وغیرہ اپنے کارناموں کی وجہ سے زیادہ مشہور ہیں۔ للّہ عارفہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہندو تھی لیکن کشمیر کے لوگ بلا لحاظ مذہب و ملت اس عظیم شاعرہ کا احترام کرتے ہیں۔ ہندو اُسے

للّہ ایشوری اور مسلمان للّہ عارفہ کہتے ہیں۔ عام کشمیری زبان میں اسے للّہ دید یعنی للہ ماں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ للّہ دید کشمیریوں کے مشترکہ سیکولر تمدن کی ایک عظیم اور درخشندہ علامت ہیں۔ علمدار کشمیر حضرتِ شیخ نورآنی ولی اس کاروان کے میر کاروان ہیں۔ اُن کے نظریات اُن کے کلام بلاغت نظام کی روشنی میں صاف طور پر انسانی برادری اور برابری کا آئینہ دار ہیں۔ اور ان ہی نظریات کی چھاپ پورے کشمیری ادب اور کلچر پر عیاں ہے۔ للّہ عارفہ اور حضرتِ شیخ نورالدین نورانیؒ ولی نے سرزمین کشمیر پر یکسانیت، بھائی چارے، انسانی محبت اور عظمت عرفاںؔ اور مساوات کے گیت عام لوگوں کی سیدھی سادی روزمرہ کی زبان میں گا کر کشمیری ادب اور کلچر کی سیکولر بنیادیں مضبوطی سے ڈالدیں۔ آج ہمارے ادب اور کلچر پر ان ہی دو عظیم شخصیات کی پوری چھاپ ہے جس کی بدولت ہمارے ادب اور کلچر کے سیکولر کردار کو تمام برصغیر میں اپنا الگ اور انفرادی مقام حاصل ہے۔

آج بھی ہماری سیکولر روایتیں وہی ہیں جو ہمیں ماضی سے ورثے میں ملی ہیں۔ آج ہندوں اور مسلمانوں کی عبادت گاہیں، زیارتیں اور آستانے نہ صرف ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں بلکہ دونوں جگہ ہندو اور مسلمان حاضری دیتے ہیں، نیاز و نذر چڑھاتے اور حاجات پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ کشمیر کے مسلمان امرناتھ پیوتر گھپا کے عقیدت مند ہی نہیں بلکہ اس کے متولی اور نگہبان بھی ہیں۔

ہمارا لباس، رہن سہن، رسم و رواج اور خوراک ایک ہے۔ زندگی کے تمام تر شعبوں میں ہماری کوئی چیز ہندوؤں اور مسلمانوں کیلئے جُداگانہ نہیں ہے۔ ہماری

قدیم روایات سے لیکر جدید قدروں تک اس طویل سفر میں ہمارے مشترکہ تہذیبی اور تمدنی ورثے میں کوئی رخنہ پیدا نہ ہوسکا ہے۔

اردو زبان کا سیکولر کردار:

ہماری ریاست جموں وکشمیر کی سرکاری زبان اردو ہے۔ اُردو کو کچھ لوگ تعصب کی وجہ سے صرف مسلمانوں کی زبان قرار دیتے ہیں۔ یہ اُن کی سراسر غلط فہمی ہے۔ وہ لوگ درحقیقت اس امر سے آگاہ نہیں ہیں کہ اردو نہ صرف ایک زبان ہے بلکہ یہ ایک تہذیب ہے، ایک ایسی تہذیب جسے گنگا جمنی تہذیب'' کہنا زیادہ بہتر ہوگا اور جس کا خمیر عربوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کی ہزاروں سالہ پرانی تہذیب کی آمیزش سے تیار ہوا اور ایک ایسی زبان کے طور پر اُبھر کر سامنے آئی جس کی آبیاری میں بلا لحاظ مذہب وملّت اور رنگ ونسل سبھی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چنانچہ آج یہ زبان کشمیر سے کنیا کماری تک آپسی رابطے کی زبان کے علاوہ بھائی چارے، میل جول، حب الوطنی، قومی رواداری اور سیکولر روایات کی مظہر بنی ہوئی ہے۔ جہاں تک موجودہ عہد میں اردو کا تعلق ہے یہ جہاں ایک کلاسیکل زبان ہے وہیں یہ ایک شاندار، باوقار اور رواداری کی حامل تہذیب بھی ہے جس نے برصغیر ہندو پاک کی حدود کو پھلانگ کر دُنیا کے بیشتر ممالک پر اپنی عظمت اور شہرت کے پرچم بلند کئے ہیں۔

اردو زبان اصل میں بھارت کا وقار ہے اور اس کے آغوش میں بھارت کے کم وبیش ہر مذہب اور عقیدے نے اپنی تشہیر اور پھیلاؤ کے داؤ پیچ سیکھے ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے صرف اسلام کی زبان قرار دیا جائے۔ دراصل بھارت میں

ایک سلسلہ ہمیشہ سے رائج رہا ہے کہ جب کبھی بھی بھارت کی سیاسی وحدت انتشار کا شکار ہوئی تو اُس منتشر زدہ سیاسی وحدت نے اپنی حیاتِ نو، اپنی بقا، اپنی حفاظت اور اپنے دفاع کیلئے معاشرے میں موجود تہذیبی وحدتوں کو شکار بنانے سے گریز نہیں کیا اور اُردو کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ہندو مسلم یگانگت، اتحاد اور یک قومی جذبے کے فروغ میں ابتدا سے مسلمان سلاطین کا برتاؤ اہم کردار کرتا رہا۔ مسلمان بادشاہ ہندو تہواروں میں بھی اُسی طرح دلچسپی لیتے تھے جس طرح مسلم تہواروں میں اُنکی شرکت ہوتی تھی۔ یہ سلسلہ بہادر شاہ ظفر تک برقرار رہا۔ داراشکوہ نے ہندی سے فارسی میں متعدد کتابوں کا ترجمہ کروادیا۔ اُس نے ہندو بھگتی اور اسلامی تصوف کے امتزاج پر ایک کتاب ''مجمع البحرین'' لکھی۔ سیاسی وحدت اور یکجہتی نے مذہبی یکجہتی کے تصور کو مہمیز کیا۔ مسلمان شعرا نے ہندوؤں کے اوتاروں پر شاندار نظمیں لکھیں۔ ہندو شعرا نے نعتیہ کلام پیش کئے اور پُر اثر مرثیے قلم بند کئے۔ ہولی، دیوالی، جنم اشٹمی، راکھی، رام چندر جی، شوراتری وغیرہ پر مسلمانوں کی پُر اثر نظمیں موجود ہیں۔

اردو کی گرفت کشمیر کے تمدن پر اتنی مضبوط ہے کہ اس کی پر چھائیاں ہمیں محمودؔ گامی، رسول میرؔ اور رہاب حاجنیؔ جیسے شاعروں کے یہاں تو ملتی ہی ہیں لیکن مہجورؔ، راہیؔ، نادم، اور کاملؔ جیسے کشمیری شاعر بھی اردو کے مے خانے سے ہی خم لنڈھا کر اپنی زبان میں مستی بکھیرنے کیلئے آگئے۔ ان سبھی اردو شعرا کی اردو نظمیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی آوازوں پر اُردو کے شعرا غالبؔ، اقبالؔ، جوشؔ، احسان دانشؔ، اختر شیرانیؔ، ناصر کاظمیؔ وغیرہ کی جو چھاپ رہی تھی وہ پیمانہ تبدیل کرنے کے بعد بھی

قائم رہی اور انکی کشمیری نظموں اور غزلوں میں اردو کے تصورات و تاثرات ایک نیا قالب بدل کر نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ رتن ناتھ سرشارؔ اور برج نرائن چکبستؔ کو اردو کی قومی اور انقلابی شاعری کے پیشروؤں میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ ترقی پسند تحریک سے پہلے اقبالؔ اور چکبستؔ نے ہی اردو میں قومی اور انقلابی شاعری کے فانوس روشن کیئے اور سارے ہندوستانی ادب کا دھارائی سمت کو موڑ دیا۔ ریاست جموں و کشمیر کی ادبی تحریک بھی قومی تحریک کے شانہ بہ شانہ چلتی رہی۔ یہاں کے شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں نے ریاستی باشندوں کو ایک جٹ ہوکر غلامی کی زنجیریں توڑنے کیلئے کمر بستہ کیا۔ اُدھر گاندھی جی نے انگریزوں کے خلاف آزادی کا بگل بجایا تو ادھر شیخ عبداللہ نے شخصی راج کو ختم کرنے کیلئے جدو جہد شروع کی۔ اس کیلئے ضروری تھا کہ عوام مذاہب، فرقے یا ذات کے حصار سے باہر نکل آنے اور مل کر آزادی کیلئے جدو جہد کریں۔ اسی تناظر میں کشمیر کے بابائے افسانہ پریم ناتھ پردیسیؔ نے حب الوطنی، آزادی اور قومی یکجہتی کو پہلی بار اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اردو مشترکہ ہند اسلامی کلچر کی نمائندہ زبان ہے۔ اردو زبان انسان نوازی، قومی یکجہتی اور باہمی محبت و اخوت کی زبان ہے۔ سوا سو کروڑ آبادی والے ملک بھارت میں ایک اردو زبان ہی وحدت، ہندو و مسلم اتحاد، مشترکہ تہذیب و تمدن اور صحت مند ثقافت کی ترجمان کہلانے کا استحقاق رکھتی ہے۔

اردو کے سیکولر کردار کو زندہ رکھنے کیلئے ایسے اقدام کئے جائیں کہ یہ صرف مسلمانوں کی ہی زبان نہ بن جائے کیونکہ عموماً اسے مسلمانوں کی زبان خیال کیا جانے

لگا ہے۔ یہاں تک کہ ہر برسرِ اقتدار سیاسی پارٹی بھی اسے مسلمانوں کی زبان سمجھ کر ووٹ کی خاطر اس کیلئے کروڑ ہا روپیہ مختص کرتی ہے اور یہ دونوں باتیں اس کے سیکولر کردار کیلئے خطرناک ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندی کی طرح اُردو کو بھی روزگار سے جوڑا جائے اور سرکاری دفتروں میں ملازمت کیلئے اُردو بنیادی تعلیم ہونا لازمی قرار دیا جائے تا کہ ہر مذہب وملت کے افراد اس میں تعلیم پانے کی جانب راغب ہوں اور یہ زبان جو ہم سب کی پیاری اور ہر دلِ عزیز زبان ہے، ایک مخصوص مذہب کے افراد کی زبان بن کر نہ رہ جائے۔

پنڈت کیلاش ناتھ کول میکشؔ کاشمیری کی نظم ''اردو کی فریاد وفغان'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

حاکمانِ وقت سے میکشؔ کا ہے اِتنا سوال
کیا نہیں یہ ہندو و مسلم کی مشترکہ زبان

☆

اس کا درجہ سب پہ روشن، لازمی اس کا فروغ
اس ریاست کی اے میکشؔ! ہے یہ سرکاری زبان

☆

اس کی ترویج واشاعت میں ہے پھر یہ ڈھیل کیوں؟
کیوں نہیں سُنتا کوئی اُردو کی فریاد و فغان؟

ریاست جموں و کشمیر میں
اُردو ذریعہ تعلیم اور روزگار

اردو تقسیم ہند کے بعد ایک مشکل دور سے گذری لیکن اب اس کا قافلہ دیگر زبانوں کی طرح تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے اور مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتیں اس میں کافی دلچسپی لے رہی ہیں۔ یہ مانا کہ ہندی کے ساتھ سرکاری زبان ہونے کے ناطے ترجیحی سلوک کیا گیا۔ جو اس کا حق بھی تھا، اور اس کے فروغ کیلئے زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچائی گئیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اردو کی ترقی میں بھی حکومت کی طرف سے کوئی روڑے نہیں اٹکائے گئے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو کے فروغ کے لئے بھی بتدریج کچھ نہ کچھ کیا ہی جاتا رہا اور گذشتہ کچھ دہائیوں میں تو اس سلسلے میں کافی پیش رفت ہوئی ہے۔ مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کا قیام، جامعہ ہمدرد و ''جامعہ ملیہ اسلامیہ'' جہاں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے یا اردو تعلیم کا میڈیم ہے۔ اُنہیں اقلیتی اداروں کا درجہ عطا کیا جانا، اقلیتوں کے تعلیمی اداروں کیلئے قومی کمیشن کا قیام، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی و دیگر تعلیمی اداروں کو جہاں جہاں بھی اردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔ انہیں کافی فنڈ فراہم کیا جانا، اردو ترقی بیورو اور اس کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا قیام اور اس کے ذریعے مختلف موضوعات پر معیاری کتب کی اشاعت، معتبر

مصنفین کو حسبِ صورت کتابوں کی اشاعت اور اردو کمپیوٹر کورس چلانے کیلئے مالی امداد، ، سیمنار، ثقافتی تقاریب، مشاعروں وغیرہ کیلئے مالی اعانت، مختلف ریاستوں میں اردو اکادمیوں کا قیام فاصلاتی سوسائٹیوں کے ذریعے اردو کی ابتدائی تعلیم کا انتظام اردو اساتذہ کے تربیتی مراکز اور تربیتی کورسز کا انتظام، اردو مصنفین و مترجمین کی ناکافی تعداد اور دیگر مشکلات کے باوجود نصابی کتابوں کی اردو زبان میں این سی ای آر ٹی کے ذریعے فراہمی، مرکزی و ریاستی سطح پر مختلف سابقتی امتحانات جیسے آئی، اے، ایس (I.A.S) ریلوے وغیرہ میں اردو میں جوابات لکھنے کی اجازت اور مزید یہ کہ اردو کوئی ریاستوں میں پہلی یا دوسری سرکاری زبان قرار دیا جانا اس بات کا دستاویزی ثبوت ہے کہ حکومت نے اس سلسلے میں اردو کے فروغ کیلئے برابر دلچسپی لی ہے اور یہ کام تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ فی الحال اردو روزی روٹی کمانے کا بڑا ذریعہ نہیں لیکن انگریزی اور ہندی کے ساتھ ساتھ اگر اردو کی بھی اچھی جانکاری حاصل کر لی جائے تو اس سے ذرائع ابلاغ و میڈیا اور مختلف امتحانوں میں کامیابی حاصل کرنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ ''ای۔ اے۔ ایس'' وغیرہ کے امتحانات میں اردو بحیثیت ایک مضمون کے انتخاب کیا جاسکتا ہے اور اردو میڈیم میں امتحان بھی دیا جاسکتا ہے۔ اب تو وزارت ریلوے نے ریلوے کے مختلف عہدوں کیلئے اردو میڈیم کے امتحانات دینے کی بھی اجازت دی ہے۔

ریاست میں اردو ذریعہ تعلیم اور روزگار:

1885 عیسوی میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اردو کو کشمیر کی سرکاری زبان کے منصب پر فائز کر دیا اور یہاں آزادی کا سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی کچھ ایسی

تبدیلیاں وقوع پزیر ہوئی جنہوں نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ تعلیمی منظر نامہ بھی بدلا۔ اردو مسلمانوں سے اور مسلمان اردو سے منسوب کئے جانے لگے اس کے باوجود کشمیر میں اردو زبان کا دائیرہ اثر کچھ زیادہ کم نہیں ہوا۔ کشمیر سے باہر انگریزی زبان کے طوفان نے دوسرے مقامی اور علاقائی زبانوں پر فوقیت حاصل کی لیکن ریاست جموں و کشمیر میں بہت حد تک اردو تعلیم کی صورت اطمینان بخش رہی۔

ریاست میں آج بھی اردو کو ریاست کے سرکاری زبان ہونے کا شرف حاصل ہے۔ نیز ریاست کے مختلف خطوں کے درمیان رابطے کی زبان ہونے کا اعزاز بھی اس سے حاصل ہے، یہاں کے محکمہ مال، عدلیہ، پولیس، صحافت، کاروباری کھاتوں اور روزمرہ کے دوسرے کاموں میں اردو ہی مستعمل ہے۔

صوبہ جموں میں ابتدائی جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک اردو کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھا جاتا ہے۔ یونیورسٹی کی سطح تک اردو کو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے۔ محکمہ تعلیم کے اعداد و شمار کے مطابق ثانوی اور اعلیٰ سطح کی تعلیم کے درجات میں اردو پڑھنے والے طلباء کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو رہا ہے۔ ریاست میں مولانا آزاد یونیورسٹی (حیدرآباد) کے فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت بھی خواہشمند طلباء تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ دانش گاہ کشمیر کے شعبہ اردو اور شعبہ فاصلاتی نظام تعلیم کے ساتھ ساتھ ادارہ اقبالیات بھی اقبالؔ کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق و تنقید کا کام کر رہا ہے۔ جموں و کشمیر کلچرل اکیڈیمی بھی دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو اور اردو والوں کی حوصلہ افزائی میں پیش پیش رہی ہے۔ اردو زبان کی تعلیم کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کیلئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

نئی دہلی نے ہندوستان کی دیگر ریاستوں کے ساتھ ساتھ جموں و کشمیر میں بھی قابل تحسین اقدام کئے ہیں اس نے ہر ضلع اور تحصیل کی سطح پر کمپیوٹر مراکز کھولے ہیں۔

مرکزی جامعہ کشمیر، بھارتی پارلیمانی ایکٹ 2009 عیسوی کے تحت قائم ایک مرکزی ادارہ ہے جس کا عارضی دفتر سونہ وار، سرینگر میں قائم ہے۔ یونیورسٹی کا قیام مارچ 2009 عیسوی میں عمل میں آ گیا تھا لیکن داخلے متفرق مضامین 2010 عیسوی سے شروع ہوئے۔ تب سے لے کر اب تک ہر سال یونیورسٹی کی فہرست میں کچھ نئے اسکول اور شعبوں کا بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ شعبہ اردو کا قیام بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کا قیام 2012 عیسوی میں عمل میں لایا گیا۔ یونیورسٹی میں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ طلباء کیلئے دیگر ادبی سرگرمیوں کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ اُن کی بہترین ذہن سازی ہو سکے۔

ریاست میں دسویں جماعت تک اردو یا ہندی ایک لازمی مضمون کے طور پر لینا ضروری ہے۔ اس بات کے پیش نظر کشمیر خطے میں 99 فیصد طلباء اردو لیتے ہیں۔ لداخ میں 90 فیصدی اور جموں میں 70 فیصدی اردو کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہائیر اسکنڈریوں میں یہ صورت حال ہے کہ اردو کو صرف آرٹس طلبا ہی ایک مضمون کے طور پر پڑھ سکتے ہیں۔

مجموعی طور پر میٹرک پاس کرنے کے بعد 40 فیصد طلبہ آرٹس اور سوشل سائنس پڑھتے ہیں اور باقی ماندہ 40 فیصد طلباء سائنس و کامرس لیتے ہیں۔ آرٹس میں سے خطہ کشمیر میں 70 فیصد، جموں میں 40 فیصد اور لداخ میں 50 فیصد اردو پڑھتے ہیں۔

محکمہ مال، عدلیہ، پولیس، انفارمیشن، ریڈیو، ٹی وی، کلچرل اکیڈیمی، اسمبلی، امور صارفین وعوامی تقسیم کاری، فیلڈ پبلسٹی جیسے شعبوں میں اردو کیلئے پوسٹ مختص رکھے جاتے ہیں۔ جموں وکشمیر پبلک سروس کمیشن کے ذریعے ریاست میں تین چار سال کے بعد K.A.S امتحانات لئے جاتے ہیں۔ جہاں کمیشن نے Mians کیلئے ہسٹری اور اردو کی ایک بہترین Combination رکھی ہے۔ پچاس کے قریب اُمیدوار اردو مضمون میں یہ امتحان پاس کر کے یہاں اعلیٰ سرکاری عہدوں پر تعینات کئے جاتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں 2010 عیسوی کے I.A.S منتخب لسٹ میں ڈاکٹر شاہ فیصل ایک کشمیری امیدوار نے ٹاپ کیا۔ مذکورہ افسر نے مینز میں پبلک ایڈمنسٹریشن اور اردو ہی چن لیا تھا۔

مختصر یہ کہ اردو طلبہ کو ریاست میں سرکاری نوکریوں میں جانے کیلئے بہت ہی اچھے مواقعے ہیں۔ ہر سال جموں وکشمیر پبلک سروس کمیشن سینکڑوں تعداد میں 2+ لیول کے لیکچرار اور ہائیر ایجوکیشن میں اسسٹنٹ پروفیسر منتخب کرتے ہیں۔

گذشتہ سوا سو سال سے اردو کشمیر میں برابر ترقی کر رہی ہے۔ اور ریاست کی تہذیبی زبان کے طور پر اپنی حیثیت منوا چکی ہے۔ تعلیمی اداروں میں اس تعلیمی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ پرائمری سے یونیورسٹی کی سطح پر اس کی تعلیم وتدریس کے معقول انتظامات ہیں اس طرح اردو میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کیلئے روزگار کے نئے نئے مواقع بھی پیدا ہو رہے ہیں اور اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

اکیسویں صدی میں بھی ریاست جموں وکشمیر میں اردو کا پرچم بلند ہے۔

ریاستی کلچرل اکیڈیمی کے ذریعے اُدبا، شعرا اور طلباء کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور انعام و اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ ساتھ ہی درسی کتابوں کی اشاعت اور کوچنگ کا انتظام ہے۔ اردو دان طبقے میں کسی طرح کا احساس کمتری نہیں ہے۔ وہ مقابلے کے امتحانوں میں حصہ لیتے ہیں اور سرکاری نوکریوں میں کامیاب ہوتے ہیں۔ نثری و شعری محفلیں مسلسل منعقد ہوتی ہیں۔ لوگ زبان کے تئیں سنجیدہ اور فکرمند رہتے ہیں۔

اردو کو پیشہ ورانہ تعلیم سے جوڑنا وقت کا تقاضہ:

اردو کی حیثیت بین الاقوامی ہے اور ہندوستان میں بھی اس زبان نے اپنے استحکام کا احساس ہر فرد و بشر کو کرایا ہے۔ لیکن موجودہ دور عالمیت میں اس زبان کی بقا کا انحصار پیشہ وارانہ تعلیم کے انسلاک پر ہے اس لئے اردو آبادی کو اسی تناظر میں اردو تعلیم کو فروغ دینا ہوگا۔ اس وقت ریاست جموں و کشمیر میں بھی اردو کے ذریعے معاش کا راستہ اتنا ہموار نہیں ہے جتنا ہونا چاہیئے۔ اس لئے اردو کو تکنیکی اور پیشہ وارانہ تعلیم سے جوڑنا وقت کی اشد ضرورت ہے۔ یہ باعث مسرت ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند اردو زبان کو کمپیوٹر اور روزگار سے جوڑنے کے مقصد سے ملک بھر میں CABA-MDTP کے نام سے کمپیوٹر مراکز چلا رہی ہے۔ کشمیر سے کنیا کماری تک پھیلے ان مراکز کی تعداد 467 ہے۔ جہاں بڑی تعداد میں طلباء CABA-MDTP کورس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ چونکہ ریاست میں اردو سرکاری زبان ہے۔ اسلئے قانونی، زرعی سائنس اور طبی سائنس کورسوں میں بھی اردو کے ایک پرچے کو لازمی بنایا جائے اور سرکاری نوکریوں میں اردو امیدواروں کو ترجیح دی جائے اور اردو کمپیوٹر اور دیگر ٹکنالوجی کو عام کیا جائے تاکہ روزگار کے اچھے مواقع

پیدا ہوں گے۔

اردو اصولی طور پر ریاست میں ذریعہ تعلیم تو ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ وزارتِ تعلیم اساتذہ کو بھرتی کرتے وقت پہلے اس بات کو یقینی بنالے کہ وہ اردو رسم الخط سے واقف ہیں اور دوسرا یہ کہ واقعی اسکولوں میں اردو کو اس کے منظور شدہ رسم الخط میں ہی پڑھایا جاتا ہے۔ محکمہ اطلاعات اور محکمہ تعلیم کیلئے اردو میں کام کاج کرنا اشد ضروری ہونا چاہیئے۔ مختصر یہ کہ حکومت کے ساتھ ساتھ اردو والوں پر بھی بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اگر وہ اردو کی بقا چاہتے ہیں تو ہر شخص کو خلوص دل سے اردو کو زندہ رکھنے کیلئے مقدور و بھرپور کوشش کرنی چاہیئے۔ اردو ہماری آپ کی سب کی زبان ہے۔ اس کی خدمت کرنا اور اس سے ترقی دینا ہمارا اولین فریضہ ہے۔ جدید سائنسی علوم کا برق رفتار ترقی اور افادیت انسانیت کی وراثت بن گئی ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس علمی وراثت کا فائدہ اردو بولنے والوں کو نہ ملے۔ غرض اردو کو تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم سے جوڑنا وقت کی اشد ضرورت ہے۔

جدید ٹیکنالوجی کی طرف سے بڑھتے اُردو کے قدم:

2017 عیسوی کے دوران سوشل میڈیا بالخصوص وہاٹس ایپ (WhatsApp) کے ذریعہ اُردو زبان کے فروغ نے گویا ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اُردو کیلئے یہ عمل خوش آئند ہے۔ اکیسویں صدی جوں جوں آگے بڑھتی گئی، اردو کے نئے منظر نامے سامنے آتے گئے۔ گذشتہ چار پانچ برسوں میں اُردو نے کمپیوٹر، ویب سائینس اور انٹرنیٹ سے مزید آگے بڑھتے ہوئے فیس بک پر مستحکم انداز میں اپنے قدم جمائے۔ اردو فونٹ یونی کوڈ نے اردو کو جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے میں

انقلاب آفرین اقدام کیا۔ فیس بک پر اُردو نے ہنگامہ بپا کردیا۔ 2017 عیسوی میں وہاٹس ایپ کے دھماکوں کیلئے یاد کیا جائے گا۔ اس وقت سب سے ضروری نئی نسل کو اردو سے واقف کرانا ہے۔ تاکہ نسل در نسل اُردو کی آبیاری جاری رہے۔ اور روزگار کے اچھے مواقع پیدا ہوں گے۔

ریاست جموں و کشمیر میں اُردو کی تدریس اور نصابی کتابوں کے مسائل

موجودہ دور میں ابتدائی و ثانوی درجات کے طلبا کو ملک میں اردو کی تعلیم حاصل کرنے میں جو مسائل درپیش ہیں اُن کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ایک طرف اچھے تجربہ کار، ہمدرد، بے غرض اور پُرخلوص اساتذہ کا فقدان ہے تو دوسری طرف سب سے بڑی پریشانی نصابی کتابوں کی عدم فراہمی اور عدم دستیابی ہے۔ اُستاد کا کام قوم کی تعمیر حیات اور قوم کی زندگی کو بنانا اور سنوارنا ہے۔ بچوں کی شکل میں قوم کا پیش قیمتی سرمائی استاد کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اس لئے استاد کو بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ ضروری اور اہم ہی نہیں بلکہ ایک مقدس کام کو اپنے ہاتھ میں لے رہا ہے۔ اس کے پیشے کا مقصد صرف روپیہ کمانا نہیں ہونا چاہئے اور اسے ایک بڑے مقصد اور مشن کے تحت اپنی خدمات انجام دینی چاہیں۔ دنیاوی دھن دولت اور عیش و آرام اس کے مقدس کام کا معاوضہ نہیں ہو سکتے۔ اُستادوں، اردو اداروں، سماجی اور ادبی تنظیموں اور خود طالب علم کی کوششوں سے اردو کی راہ میں حایل ساری دشواریوں کو رفع کیا جاسکتا ہے۔ اردو کی تعلیم کے مسائل میں اساتذہ کا انتخاب ایک اہم مسلہ ہے۔

اگرچہ دنیا کے مشکل، اہم اور قابلِ احترام پیشوں کا جایزہ لیا جائے تو اس میں سب سے اہم پیشہ اُستاد کا ہے لیکن موجودہ دور میں اس پیشے کی جو حالت ہو چکی ہے وہ کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

اردو زبان کو درپیش مسائل کا جب ذکر ہوتا ہے تو ہم دنیا بھر کی باتیں کرتے ہیں لیکن اردو اساتذہ کی طرف بہت کم ہمارا دھیان جاتا ہے، جب کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کے کندھوں پر کاروان اردو کو آگے لے جانے اور اس زبان کے مستقبل کو سوارنے کی سب سے زیادہ ذمہ داری ہے۔ ریاست جموں وکشمیر میں بھی اردو اساتذہ کے تدریسی معیار، اُن کی روزی روٹی سے متعلق مسائل، اسکول کالجوں میں اُن کے ساتھ برتی جانے والی بے توجہی اور اُن کا استحصال ایسے مسائل ہیں جن کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ اردو اساتذہ کو طرح طرح کے مسائل کا سامنا ہے، کہیں وہ مقامی انتظامیہ کی بے توجہی کے شکار ہیں تو کہیں بیروکریسی کی سطح پر اُنہیں سوتیلے پن کا احساس ہوتا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ وہ اردو کی تدریسی خدمات پورے خلوص کے ساتھ اسی وقت انجام دے سکتے ہیں جب انہیں مقامی حمایت اور پذیرائی حاصل ہو۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ خود والدین اپنے بچوں کو اُردو یا تو پڑھانا نہیں چاہتے یا اُن کے نصاب میں اُردو کی حیثیت آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے۔ دوسری طرف انگلش میڈیم اسکولوں کی چکا چوند نے بھی اُردو کو پسماندہ زبان باور کرانے کی کوشش کی ہے اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ انگلش میڈیم اسکولوں کی میڈیائی ہوا خیزی کے دام میں والدین بھی آ گئے ہیں، چنانچہ انہیں اس بات کی قطعاً

پرواہ نہیں کہ ان کا بچہ اردو پڑھ پا رہا ہے یا نہیں، وہ تو بس انگریزی کی چاہ میں اردو فراموشی کے مجرمانہ عمل میں مسلسل معروف نظر آتے ہیں۔ جہاں تک اردو کے تعلق سے حکومت کی کارکردگی کا سوال ہے تو بلاشبہ بہت کچھ کیا جانا باقی ہے تاہم بہت کچھ کیا بھی جا چکا ہے۔ اور فروغ اردو کی مہم جاری ہے۔ اردو نصاب کی تشکیل اور درسی کتابوں کی فراہمی کے ساتھ ساتھ اردو اساتذہ اور کسی حد تک ریاست میں سرکاری دفاتر میں اردو منز جمین کی تقرری کی طرف توجہ دی جا رہی ہے۔

اسکولی سطح پر اُردو تدریس کی بہتری اور مواد کی فراہمی کیلئے مختلف سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیویٹ اداروں کی گران قدر خدمات سے انکار ممکن نہیں۔ ہندوستان میں ایسے متعدد ادارے ہیں جو اُردو تدریس کے لئے مواد کی فراہمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ہیں۔ ہمارے کئی ایسے ادارے ہیں جو اس کام کو بڑی ذمہ داری سے انجام دے رہے ہیں۔ ان اداروں میں ''ساہتیہ اکادمی''، ''نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا''، ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بچوں کی ذہن سازی کا کام اسکول سے ہی شروع ہوتا ہے۔ جب اُن کے لئے مستند مواد کی فراہمی عمل میں آئے گی اور اس نصاب کی تیاری کیلئے بہتر مواد یا مستند کتابوں سے جب استفادہ کیا جائے گا تبھی ایک ماڈل نصاب روبرو عمل آئے گا اور ہماری کامیابی اسی وقت ممکن ہو سکے گی جب ہم ہر عمر کے بچوں کیلئے اچھے مواد فراہم کرا سکیں۔ اطمینان بخش بات یہ ہے کہ ساہتیہ اکادمی، نیشنل بک ٹرسٹ اور قومی کونسل برائے اردو زبان کا اس سمت میں کلیدی رول رہا ہے۔ یہ تینوں ہی سرکار کے

خود مختار ادارے ہیں۔ ان اداروں میں مختلف اسکیموں اور پروگراموں کے ساتھ اشاعتی پروگرام بھی خاص اہمیت کا حامل ہیں۔ اشاعتی پروگرام کے تحت ان اداروں میں ایک طرف جہاں ادب، سماج اور کلچر پر بہت سی کتابیں دستیاب ہیں وہیں دوسری طرف چائلڈ لٹریچر سے وابستہ کتابیں بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان اداروں میں اسکول کی سطح پر ادبی و عملی اور تعلیمی شعبے سے تعلق رکھنے والے ممتاز اُدبا، شعرا، ناقدین، محققین اور دوسرے تخلیق کار نصاب میں شامل ہیں۔

عام شکایت یہ ہے کہ یہاں ریاست میں کتابیں وقت پر شائع نہیں کی جاتیں، بہ وقت تمام شائع ہو بھی جاتی ہیں تو ان کو اسکولوں، کالجوں اور مارکیٹ میں بک سیلرز کے پاس وقت پر نہیں پہنچایا جاتا۔ نیا تعلیمی سال شروع ہونے سے لے کر سالانہ امتحان سر پر آجانے تک طلباء اردو کی کتابوں کیلئے سرگردان اور پریشان رہتے ہیں۔ عام بک سیلرز کا رویہ اور طرز عمل بھی اُردو کی کتابوں کے ساتھ نہایت گھٹیا، عامیانہ اور تعصابہ ہوتا ہے۔ وہ اکثر جان بوجھ کر سرکاری اداروں اور پریس سے کتابیں نہیں منگاتے یا آرڈر دیتے بھی ہیں تو اس امر میں کوئی سرگرمی نہیں دکھاتے کہ کتابیں وقت پر طلبا کو دستیاب ہوسکیں۔ پھر اگر ان کے پاس کتابیں آ بھی جاتی ہیں تو ان کی بہتر طور پر اس طرح تشہیر نہیں کرتے جیسی دوسری زبانوں میں کرتے ہیں۔ عام طور سے اردو کی سرکاری نصابی کتابیں گھٹیا، ردی اور بیکار قسم کے اخباری کاغذ پر شائع کی جاتی ہیں۔ ایسی کتابوں کو طلبا صحیح ڈھنگ سے پڑھنے سے بھی قاصر رہتے ہیں کیونکہ ان میں کتابت و طباعت کا بھی کوئی معیار نہیں ہوتا جب کہ انگریزی اور

ہندی کی کتابیں انتہائی نفیس، دیدہ زیب، بہترین، بس سفید دبیز اور اجلے کاغذ پر شائع کی جاتی ہیں اور ان میں موجود تصاویر بھی بہت خوبصورت اور ملٹی کلر ہوتی ہیں۔ جب کہ اردو کی کتابوں میں کمپیوٹر کمپوزنگ کی نفاست اور ان کے معیار میں بھی زمین آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔ زمانے، وقت، سماجی ضرورت اور عصری حالات و تقاضوں کے تحت اردو نصاب میں ملک کی دوسری ریاستوں کے ساتھ ساتھ ریاست جموں وکشمیر میں بھی برسوں سے کوئی ترمیم، تحریف، تنسیخ اور خدف واضافہ نہیں کیا جاتا ۔ یہ رویہ ہر کلاس کی کتابوں کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے۔ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ تخلیق ادب میں دس سال کے عرصے میں ہی کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور آجاتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں نصابی کتابوں میں ادب کے عصری تقاضوں اور وقتی ضرورتوں سے دور ہی نہیں بلکہ محروم بھی رکھا گیا ہے۔ نصابی کتابوں کی ترتیب میں بچوں کی ذہنی استعداد، ان کی عمر، صلاحیت اور ذوق وشوق کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ وقت اور حالت اور سائینس وٹیکنالوجی کی ضرورت واہمیت کو مدِ نظر رکھ کر بچوں کیلئے نصابی کتابیں شائع کی جانی چاہیئے۔ نئے نئے موضوعات پر مضامین اور دل چسپ و بامقصد کہانیاں بچوں کے نصابی کتابوں میں شامل کی جائیں۔ ورنہ طلبا ادب کے جدید رجحانات اور امکانات سے بھی نابلد اور ناواقف رہتے ہیں۔

آج ضرورت ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں بچوں کے نصابی کتابوں میں اخلاقیات، صحت وتندرستی، کھیل کود، جدید سائینسی ترقی اور ایجادات، دنیا کے دیگر ترقی یافتہ ممالک کے سماجی اور جغرافیائی حالات، الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کی

اہمیت وافادیت، جنرل نالج، جذبۂ خیر سگالی اور ہمدردی، آپسی میل جول، ملک کے تاریخی حالات وواقعات، تاریخی نوعیت کی عمارات اور ملک سے محبت ووفاداری، ریاست جموں وکشمیر کا حسن وجمال جیسے مضامین شائع کرنے کی طرف زیادہ توجہ دی جائے۔ وہ تعلیمی ادارے جو بچوں کیلئے درسی کتابیں ترتیب دے کر شائع کرتے ہیں انہیں اپنے نصاب میں مذکورہ امور کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ طلبا کے لئے ہندی اور انگریزی میں ہر طرح کی بہترین گائڈ بکس اور جنرل نالج کی کتابیں ملتی ہیں لیکن اردو میں اس طرف یا تو سرے سے ہی توجہ نہیں دی گئی یا کچھ کتابیں بازاروں میں ملتی بھی ہیں تو وہ صرف کاروباری نقطۂ نظر سے۔ ناقص مواد کے ساتھ انتہائی گھٹیا اور ردی کاغذ پر چھپی ہوتی ہیں جن کو پڑھ کر بلکہ رٹ رٹا کر طلبا امتحان میں پاس تو ہو سکتے ہیں لیکن ان میں علمی صلاحیت ولیاقت اور تعلیم کا ذوق، جوش وجذبہ بھی پیدا ہو، یہ ضروری نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر میں بہت سے پرائیوٹ ادارے عام معلومات یا جنرل نالج اور کوئز کے مقابلے کراتے ہیں جن میں ہر عمر کے طلبا بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں لیکن گورنمنٹ اسکولوں میں اردو کے تعلق سے اس طرح کے مقابلوں کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔ برسوں پہلے بیشتر اسکول اور کالجوں میں بیت بازی، تمثیلی مشاعروں اور ڈراموں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے ہم اپنے کالج ''اسلامیہ کالج آف سائینس اینڈ کامرس'' سرینگر میں باقاعدہ طور پر 1973 عیسوی سے 2002 عیسوی تک بزم ادب کی محفلیں آراستہ کرتے تھے۔ اس کالج نے جاوید آزر، فرید پربتی، اشرف عادل، شہریار اور سیکنڈوں ایسے ادیب،

شاعر اور ڈرامہ نگار پیدا کئے جنہوں نے ادب کے تعلق سے مضبوطی سے زمین پر قدم جمائے بلکہ آسمان کے تارے بھی چھونے کی کوشش کی ہے۔ اسلئے اسکولوں اور کالجوں میں تمثیلی مشاعروں، ڈراموں، بیت بازی کا اہتمام کرنے سے بچوں میں اردو کی تئیں دلچسپی بڑھتی تھیں اور وہ اپنے اس شوق کو پورا کرنے کیلئے بچوں کے رسالے بھی کھنگالتے تھے۔ چونکہ رسالوں میں بچوں کی دلچسپیوں کے سارے سامان موجود ہوتے ہیں اس لئے ماضی میں اردو رسالے بچوں اور خاص کر طلبا کیلئے لازم ملزوم بن گئے تھے۔ اُستاد کا کام قوم کی تعمیر حیات اور قوم کی زندگی کو بنانا اور سنوارنا ہے۔ دنیاوی دھن دولت اور عیش و آرام استاد کے مقدس کام کا معاوضہ نہیں ہوسکتے۔ بہر حال استادوں ، اردو اداروں، ادبی تنظیموں اور خود طالب علموں کی کوششوں سے اردو کی راہ میں حائل ساری دشواریوں کو رفع کیا جاسکتا ہے۔ شرط صرف یہ عزم کرنے کی ہے کہ ہمیں اردو خواندگی کا دائرہ وسیع کرنا ہے۔

تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں اس بات پر فخر کا احساس ہوگا کہ زبان کے فروغ میں ہر ہندوستانی نے اہم کردار کیا ہے۔ آج اردو سرٹیفکیٹ کورس کے زیادہ تر طلباء اور طالبات غیر مسلم ہیں جو یقیناً قابل فخر بات ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو کی جڑیں ہر اہل دل کے یہاں مضبوط اور مستحکم ہیں۔ آج جہاں اردو کو مسلمانوں کی زبان بتایا جارہا ہے وہیں آج کی موجودگی باعث فخر ہے، جہاں زیادہ تر طلبا، غیر مسلم خواتین و حضرات ہیں۔ اردو سرٹیفکیٹ کورس میں بڑی تعداد ریٹائیر افسران، صحافی، وُکلا، داخلہ لیتے ہیں اور اس کے بعد دہلی کی بہت سی یونیورسٹیوں میں اردو میں ڈپلوما

کورس کرنے کے بعد سے طلبا ایم، اے اردو، پی۔ ایچ۔ ڈی بھی کر رہے ہیں۔ اسی طرح ریاست جموں وکشمیر میں ہر سطح پر جیسے 2+10 لیول پر، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلباء وطالبات کیلئے صحافی، وُکلا کیلئے اردو سٹرفکیٹ کورس کا آغاز ہو۔ ایک طرف طلبا وطالبات کیلئے روزگار بھی ملے اور اردو زبان کو فروغ بھی مل سکے۔ اس کے لئے اچھے اور تجربہ کار اساتذہ کی اشد ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو اساتذہ کے حالات ریاست جموں وکشمیر میں مجموعی طور پر کم وبیش ویسے ہی ہیں جیسے ملک کے دیگر استادوں کے ہیں۔ لیکن اردو میں صرف وہ مدرسین کسی قدر بہتر حالات میں ہیں جو اعلیٰ تعلیم سے جڑے ہوئے ہیں یا پھر ثانوی درجات کے ان ٹیچروں کا حال نسبتاً ٹھیک ہے جو مستقل سرکاری ملازمت میں ہیں۔ باقی بیش تر اردو اساتذہ کا حال یہ ہے کہ قدم قدم پر ان کا استحصال ہوتا ہے۔ پرائیویٹ ادارے انہیں کم از کم مقررہ اجرت سے بھی کم تنخواہ دے کر کام لیتے ہیں اور اس معمولی تنخواہ کیلئے بھی انہیں مہینوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ مدرسوں میں اردو اساتذہ کا حال اور بھی بُرا ہے۔ جب کہ انہی مدرسوں کی بدولت اردو خواندگی میں توسیع بھی ہوئی ہے۔ اردو کی نصابی کتابوں کی بروقت عدمِ دستیابی، اساتذہ کے کام کرنے کے حالات، ان کے تدرسی معیار کو اَپ ڈیٹ کرنے کے نظم کی کمی، اردو کی تدریس سے متعلق مخصوص تربیت کے فقدان اور نظم ونسق کے مسائل بھی ہیں جن کو اردو کے اساتذہ کی کارکردگی سے گہرا تعلق ہے۔ اور جن کی ہم اردو والوں کی فکر کرنی ہوگی۔ پرائیویٹ تعلیمی اداروں اور دینی مدرسوں میں اردو اساتذہ کے مجموعی مسائل کا حال نکالنے کیلئے اردو سے محبت رکھنے والوں کو

ہی آگے آنا ہوگا۔ تبھی ہم حقیقی معنوں میں یہ کہہ سکیں گے کہ ''یوم اساتذہ'' اور اُردو اساتذہ کا بھی دن ہے۔

جہاں تک کالج کی سطح پر یہاں ریاست جموں وکشمیر میں تدریس کا سوال ہے وہ پر اثر ہے کیونکہ یہاں معلمین کے سامنے بیٹھے ہوئے طلبہ ذہنی وجسمانی طور پر بالغ ہوتے ہیں۔ان کا شعور بیدار ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ طلبہ بند کتاب کی مانند ہوتے ہیں۔ ان کا شعور بیدار ہوتا ہے۔ انہیں بس کھولنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک اچھا استاد وہ ہوتا ہے جو طلبہ کی صحیح سمت میں رہنمائی کرتا ہو، زندگی کو جینے کا راستہ دکھاتا ہو۔ اسے اپنے مضمون میں مکمل دسترس حاصل ہو، انداز بیان متاثر کن ہو، دلوں کو چھو لینے والا ہو، وہ جدید ٹیکنالوجی کا استعمال جانتا ہو، آج طریق تدریس میں تبدیلی کی اہم ضرورت ہے۔ اگر معلمین وہی پرانا اور گھسا پٹا طریقہ تدریس میں استعمال کریں تو طلبہ پر اس کا خاطر خواہ کوئی اثر نہیں پڑیگا۔ جدید ٹیکنالوجی کے استعمال سے ہماری تدریس بھی پُر اثر ہوگی۔ انٹرنیٹ پر بھی اب اردو ادب سے متعلق کافی مواد موجود ہے، ہم اپنے مطلوبہ مواد، قصہ، واقعہ، نظم وغزل، کسی کتاب یا اس کے اقتباس کسی شاعر یا ادیب کی سوانح عمری اردو زبان پر ہو رہی تحقیق، تحقیقی مکالمے ودیگر معلوماتی مضامین با آسانی ڈاون لوڈ کر سکتے ہیں اور اسے کمپیوٹر، پین ڈرائیو یا پھر سی ڈی وغیرہ میں محفوظ کر کے رکھ سکتے ہیں۔ تدریسی عمل میں جدت لانا آج وقت کی اہم ضرورت بن گئی ہے۔ اگر کسی وجہ سے ہمارے پاس جدید ٹیکنالوجی کے آلات نہ ہوں تب بھی ہم فلیش کارڈز، چارٹس، مختلف قسم کی تصاویر کا بھی استعمال کر سکتے

ہیں۔ ہمیں ضرورت کے مطابق اکتسابی تجربات کرتے رہنا چاہیئے۔ تاکہ تمام طلبہ کو مستقبل کیلئے تیار کیا جاسکے۔ ان کی طبع زاد صلاحیتوں کی نشو ونما ہوسکے۔ ان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہونا چاہیئے۔ تاکہ باآسانی ازخود لکھ سکیں، اپنے خیالات ،جذبات واحساسات قلمبند کرسکیں۔ بعض طلبہ معلمین سے ڈرے سہمے ہوئے رہتے ہیں، اس لئے وہ اکثر پریڈ میں بھی نہیں آتے اور کالج سے راہِ فرار اختیار کرلیتے ہیں، کالج ہمیشہ کیلئے چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں قطعی وجوہات کو تلاش کر کے بروقت مناسب تدابیر ورہنمائی سے ہم طلبہ کا دِل جیت سکتے ہیں۔

گذشتہ سوا سو سال سے اردو ریاست جموں وکشمیر میں برابر ترقی کر رہی ہے اور ریاست کی تہذیبی زبان کے طور پر اپنی حیثیت منوا چکی ہے۔ تعلیمی اداروں میں اسے تعلیمی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ پرائمری سے یونیورسٹی کی سطح پر اس کی تعلیم و تدریس کے معقول انتظامات ہیں۔ اس زبان میں سنٹرل یونیورسٹی آف کشمیر اور کشمیر یونیورسٹی اور جموں یونیورسٹی میں بھی تخلیق اور تحقیق کا کام اعلیٰ پیمانے پر ہو رہا ہے۔ ہر سال اردو میں متعدد کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ اس وقت اردو میں درجنوں روزنامے اور ہفتہ وار اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اردو میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کیلئے روزگار کے نئے نئے مواقع بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ریاست جموں وکشمیر نے اردو کے ایک اہم مستند مرکز کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ آج ضرورت ہے کہ ریاست میں نصابی کتابوں میں اخلاقیات، صحت وتندرستی ، کھیل کود، جدید سائنسی ترقی اور

ایجادات، دنیا کے دیگر ترقی یافتہ ممالک کے سماجی اور جغرافیاتی حالات، الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کی اہمیت و افادیت، جنرل نالج، جذبۂ خیر سگالی، خیر سگالی اور ہمدردی، آپسی میل جول، ملک کے تاریخی حالات و واقعات، محبت و وفاداری ابھارنے والے مضامین شائع کرنے کی طرف زیادہ توجہ دی جائے۔ دوسری بات یہ ہے استاد کا کام قوم کی تعمیر حیات اور قوم کی زندگی کو بنانا اور سنوارنا ہے۔ بچوں کی شکل میں قوم کا بیش قیمتی سرمایہ استاد کے سپرد کیا جاتا ہے اس لئے استاد کو بھی یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ ضروری اور اہم ہی نہیں بلکہ ایک مقدس کام کو اپنے ہاتھ میں لے رہا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ استاد اور شاگرد کے درمیان، احترام وعقیدت کا جذبہ کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے۔ بیشتر طلبا آج اپنے اساتذہ کا اس طرح احترام نہیں کرتے جس طرح گذشتہ نسلیں کرتی تھیں۔ ضرورت ہے کہ طلبا و اساتذہ کے باہمی روابط شائستگی لانے میں کوشش کی جائے۔ اگر صحیح طریقے سے تعلیم دی جائے تو سماج کی کئی برائیوں کو مٹایا جاسکتا ہے۔

اختتامیہ

میرے لئے ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب'' (سقوط ہند سے قبل اور اس کے بعد) کا یہ مطالعہ زمانہ حال سے ماضی قدیم کی طرف اور پھر واپس زمانہ حال کی طرف ایک خوشگوار مگر بے حد دِلچسپ سفر تھا۔ فی الوقت ہم اکیسویں صدی میں سانس لے رہے ہیں۔ پوری دنیا سائنسی دریافتوں اور مہلک ہتھیاروں کی ایجادات سے آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی ہے۔ تاہم ادب کے حوالے سے اس دور میں بھی زندگی کی ایسی بامعنی سرگرمی نظر آتی ہے جو حقیقت کی تعبیر میں معروف ہے اور نئی معنویت کو سامنے لاکر روح عمر کو تخلیقی صورت دے رہی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ آج جب کہ ہندوستان میں جتنے بھی اردو بولتے ہیں، اُن کی نظریں جموں وکشمیر کی طرف لگی ہوئی ہیں اور کشمیر میں اُنہیں ایک اُبھرتے ہوئے مرکز کی روشنی پھوٹتی ہوئی نظر آرہی ہے تو ہمیں اپنے فرائض کا احساس اور تیز تر دینا چاہئے۔ ریاستی سرکار کو زبان سے متعلق ایک واضح اور ٹھوس پالیسی اپنانی چاہئے اور سرکاری زبان ہونے کی حیثیت سے ریاست کے تمام سرکاری اور پرائیویٹ اسکولوں میں اردو کی تعلیم لازمی قرار دینی چاہئے۔ سرینگر کی طرح لیہ اور کرگل میں اکیڈیمی سے منسلک لداخی اردو اور انگریزی مطبوعات کی فروخت کیلئے کتاب گھر کھولا جائے۔ اردو کو ریاست میں عمومی اور لداخ میں خصوصی طور فروغ دینے کیلئے ریاست کے تینوں خطوں میں قائم کلچرل اکیڈیمی اور محکمہ اطلاعات کے دفتروں سے منسلک ایک شاخ یا ادارہ کھولا جائے جو اردو کی ترقی اور ترویج کیلئے کام کرے۔

کتابیات

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	پبلشرز
۱۔	تواریخ کشمیر	پنڈت ہرگوپال ختہ	شیخ غلام احمد بل سیلرز سرینگر۔
۲۔	تاریخ تمدن کشمیر	ڈاکٹر عزیز احمد	حاجی غلام احمد اینڈ سنز بڈشاہ چوک سرینگر
۳۔	تصویر کشمیر	ڈاکٹر ایس، ایم ناز	مقبول اکیڈیمی لاہور پاکستان
۴۔	جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو نما	ڈاکٹر برج پریمی	رچنا پبلی کیشنز: سرینگر
۵۔	ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب	پرفیسر حامدی کشمیری	گلشن پبلی کیشنز: سرینگر
۶۔	راج ترنگنی	پنڈت کلہن	لائف اینڈ لایٹ پبلیشرز (مترجم ٹھاکر اچھر چند شاہ پور
۷۔	کشمیر میں اردو (تیسرا حصہ)	عبدالقادر سروری	جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لنگویجز سرینگر
۸۔	کشمیر میں اردو (پس منظر)	عبدالقادر سروری	جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لنگویجز سرینگر
۹۔	کشمیر میں سماجی اور ثقافتی تبدیلیاں	صوفی غلام محمد	صنوبر پبلی کیشنز: سرینگر
۱۰۔	کشمیر کے مضامین	ڈاکٹر برج پریمی	ویب پبلکیشنز آزاد بستی نٹی پورہ سرینگر کشمیر
۱۱۔	کشمیر میں اردو (دوسرا حصہ)	پروفیسر عبدالقادر سروری	جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لنگویجز سرینگر
۱۲۔	کشمیر میں اردو	کینموی حبیب	مرکزی اردو بورڈ لاہور
۱۳۔	کشمیر کی کہانیاں	کرشن چندر	الہ آباد پبلشنگ ہاوس الہ آباد
۱۴۔	کلاسیکیت اور رومانیت	علی جاوید	رائٹرس گائیڈ...... پورنی ہستم پور
۱۵۔	کہانی کا ارتقا	ظہورالدین	انٹرنیشنل اردو پبلی شرز
۱۶۔	فرقہ واریت اور ہندی افسانے	محمد طاہر فاروق	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ
۱۷۔	اردو نثر کا فنی ارتقاء	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	ایجوکیشنل سیپ پبلشنگ ہاؤس علی گڑھ
۱۸۔	اردو افسانے کا ارتقاء	ڈاکٹر مسعود رضا خاکی	مکتبہ خیال لاہور

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	پبلشرز
۱۹۔	اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل	ڈاکٹر منچند افراہین	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ
۲۰۔	اردو فکشن	پروفیسر آل احمد سرور	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۲۱۔	اردو میں مختصر افسانہ نگاری	ڈاکٹر پروین اظہر	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ
۲۲۔	اردو افسانہ۔ بنیادی تشکیلی عناصر	پروفیسر اختر انصاری	فرنڈس بک ہاؤس علی گڑھ
۲۳۔	اردو ناول اور تقسیم ہند	عقیل احمد	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس علی گڑھ
۲۴۔	اردو ادب کی رومانی تحریک	پروفیسر محمد حسن	شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۲۵۔	اردو افسانہ (روایت اور مسائل)	پروفیسر گوپی چند	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ
۲۶۔	ادب اور سماج	پروفیسر احتشام حسین	آزاد کتاب گھر دہلی
۲۷۔	اردو ناول آزادی کے بعد	اسلم آزاد	سماپت پرکاشن نئی دہلی
۲۸۔	اردو فکشن کی تنقید	ارتقاء کریم	تخلیق کار پبلیشرز
۲۹۔	اسالیب پر ایک نظر	ضیاء الدین	ادارہ فکر جدید نئی دہلی
۳۰۔	اردو فکشن میں طوائف	ضیاء الدین	ادارہ فکر جدید نئی دہلی
۳۱۔	برفیلے لمحوں کا جنگل	جان محمد آزاد	اردو مرکز پبلی کیشنز کشمیر
۳۲۔	بے گھاٹ کی ناؤ	نور شاہ	شاہین بک اسٹال سرینگر
۳۳۔	برصغیر میں اردو ناول	ڈاکٹر خالد اشرف	ایجوکیشن پبلشنگ کوچہ پنڈت دہلی ہاؤس
۳۴۔	نئے چراغ (افسانوی مجموعہ)	پریم ناتھ پردیسی	مکتبہ لالہ رُخ سرینگر
۳۵۔	پورے چاند کی رات	کرشن چندر	مکتبہ سلطانی سجائی ممبئی
۳۶۔	تفہیم وتنقید	حامدی کاشمیری	نئی آواز جامعہ نگر نئی دہلی
۳۷۔	دنیا ہماری	پریم ناتھ پردیسی	مکتبہ لالہ رُخ سرینگر
۳۸۔	داستان سے افسانے تک	وقار عظیم	مکتبہ الفاظ علی گڑھ
۳۹۔	جدید ناول کا فن	سر محمد عقیل	نیا سفر پبلی کیشنز الہ آباد
۴۰۔	سیلاب اور قطرے	تیج بہادر بھان	روئٹرس سیلرز سرینگر

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	پبلشرز
۴۱۔	عزیز احمد کے افسانے	سلطان اطہر جاوید	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی
۴۲۔	وادیاں بلا رہی ہیں	جان محمد آزاد	آزاد پبلی کیشنز فتح کدل سرینگر
۴۳۔	وادی کے پھول	پروفیسر حامدی کاشمیری	شاہین بک اسٹال سرینگر
۴۴۔	کشمیر جھیل جھلتی ہے	فاروق رینزو	اردو بک ریویو جولائی/اگست
۴۵۔	کشمیر جاگ اُٹھا	فاروق رینزو	اردو بک ریویو جولائی/اگست
۴۶۔	نیلی آنکھیں	پریم ناتھ در	بارود خانہ لکھنو
۴۷۔	نئے غلام	کرشن چندر	مکتبہ اردو ادب لاہوری گیٹ لاہور
۴۸۔	عکس کشمیر	صابر آفاقی	مظفر آباد (آزاد کشمیر)
۴۹۔	شعر، شعور اور شعریات	فرید پربتی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی
۵۰۔	عصری شعور (تنقیدی مضامین وتبصرہ جلد دوم)	دیپک بدکی	میزان پبلشرز سرینگر
۵۱۔	قہر نیلے آسمان	سیدہ نکہت فاروق	میزان پبلشرز سرینگر
۵۲۔	کالے پیڑوں کا جنگل (افسانوں کا مجموعہ)	ڈاکٹر ریاض توحیدی	میزان پبلشرز سرینگر
۵۳۔	عمر مجید کے بہترین افسانے	مرتبہ ومقدمہ سلیم سالک	میزان پبلشرز سرینگر
۵۴۔	شہر بے پُرسان	مشتاق احمد وانی کینی	کورٹ روڈ سرینگر
۵۵۔	خواب حقیقت	ڈاکٹر رخسانہ تبسم	ہولامزں پبلشنگ ہاؤس (انڈیا)
۵۶۔	آفتاب اور سرینگر ٹائمز اردو (صحافت کے سنگ میل)	خورشید عالم خان	قاسمی کتب خانہ پبلشر تلاب کھٹیکاں جامع مسجد جموں
۵۷۔	اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ	خالد محمود	متکبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ
۵۸۔	اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	اسلام آباد
۵۹۔	اردو ادب میں سفرنامہ	ڈاکٹر انور سدید ین	لاہور
۶۰۔	اردو سفرنامہ انیسویں صدی میں	ڈاکٹر قدسیہ قریشی	لکھنو (انڈیا)
۶۱۔	دبستان جموں وکشمیر میں اردو	ڈاکٹر محی الدین زور کاشمیری	گلشن بکس ریزیڈنسی روڈ سرینگر
۶۲۔	اردو کا سیکولر کردار	پروفیسر شہاب عنایت ملک	سنٹر فار پرفیشنل اسٹڈیز اردو جموں یونیورسٹی

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	پبلشر
۶۳۔	اختر اورینوی	تحقیق و تنقید	شاہ بک ڈپوٹ باراول
۶۴۔	اردو ڈرامے کے نئے رجحانات	ڈاکٹر اسلم قریشی	ایکوریٹ پرنٹرز
۶۵۔	اردو ادب کی تحریکیں	انور سدید	انجمن ترقی اردو کراچی
۶۶۔	انشائیہ اردو ادب میں	انور سدید	مکتبہ فکر و خیال لاہور
۶۷۔	اردو میں ڈرامہ نگاری	بادشاہ حسین	لاہور
۶۸۔	اردو افسانے کا منظرنامہ	ڈاکٹر حامد بیگ	مکتبہ عالیہ لاہور
۶۹۔	جدید اردو ادب	خاطر غزنوی	سنگ میل پبلی کیشنز
۷۰۔	اردو ڈرامہ کا ارتقاء	عشرت رحمانی	شیخ غلام محمد لاہور
۷۱۔	رہبر اخبار نویسی	سید اقبال قادری	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
۷۲۔	کرشن چندر اور اُن کے افسانے	ڈاکٹر اطہر پرویز	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ
۷۳۔	کاغذ کا واسدیو	پریم ناتھ در	بارود خانہ، لکھنو (انڈیا)
۷۴۔	نیل کنول مسکائے	مخمور حسین بدخشی	ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد
۷۵۔	جلوہ صد رنگ	ڈاکٹر برج پریمی	''تپسیا'' آزاد بستی نٹی پورہ سرینگر کشمیر
۷۶۔	وحشی سید ایک منفرد فکشن نگار		انتساب پبلی کیشنز
۷۷۔	چاند کا ہم شکل		عائشہ ڈجٹل سٹوڈیوز، گوجوارہ سرینگر

رسائل و جرائد:

نمبر شمار	شمارہ	پبلیشرز	سنہ اشاعت
ا۔	سہ ماہی اردو دنیا	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی	جولائی تا ستمبر ۱۹۹۸ء
۲۔	اردو دنیا	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی	فروری ۲۰۰۰ء
۳۔	ماہانہ آج کل کشمیر نمبر	جلد: ۳۴، شمارہ ۴۔ نئی دہلی	نومبر ۱۹۷۵ء
۴۔	انتخاب اردو ادب (سالانہ)	جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لنگویجز سرینگر	نومبر ۱۹۷۲ء

نمبر شمار	شمارہ	پبلشرز	سنہ اشاعت
۵۔	تعمیر	شعبہ مطبوعات افلاعات، حکومت جموں و کشمیر	۲۱/مارچ سنہ ۱۹۷۰ء
۶۔	ہمارا ادب (سالانہ)	جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لنگویجز سرینگر	سنہ ۱۹۴۰ء
۷۔	ہمارا ادب (سالانہ نمبر)	جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لنگویجز سرینگر	سنہ ۱۹۷۹ء
۸۔	ہمارا ادب (سالانہ)	جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لنگویجز سرینگر	سنہ ۱۹۷۵ء
۹۔	ہمارا ادب (سالانہ)	جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لنگویجز سرینگر	سنہ ۱۹۸۵ء
۱۰۔	سہ ماہی	فکر و تحقیق نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	سنہ ۲۰۰۱ء
۱۱۔	نگینہ (وحشی سید)	ہوٹل شہنشاہ بلیوارڈ سرینگر کشمیر	
۱۲۔	تعمیر (سہ ماہی)	شعبہ مطبوعات اطلاعات، حکومت جموں و کشمیر ۲۱ مارچ	۱۹۷۰
۱۳۔	ہمارا ادب (سالانہ)	جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لنگویجز سرینگر	سنہ ۱۹۶۹ء

List of English Books consulted

S no.	Name of the Book	Author/ Publisher
1.	Eearly History & Culture of Kashmir	Dr. Sunil Chandra Ray, (Oriental publishers New Delhi)
2.	Kashmir	G. M. D. Sofi, (Light and Life Publishers New Delhi)
3.	Kashmir	Sr Fransis Young Husband (R&R Clark Great Britain)
4.	Kashmir Under the Sultans	Mohibul Hassan, (Ali Mohd. & Sons Srinagar Kashmir.)
5.	Islamic Culture in Kashmir	G. M. D. Sofi, (Light and Life Publishers Srinagar)
6.	Two Nations & Kashmir	Lord Bird Wood (Robert Hall London)
7.	Valley of Kashmir	Valetr Lawrence, (Kesar Publishers, Residency Road Srinagar)
8.	India Wins Freedom	Moulana Abul Kalam Azad (Orient Longman)

9.	Kashmir & Punjab	Baron Charles Hugelm,(Light and Life Publishers Srinagar)
10.	Indian Literature	Sahitya Academy New Delhi
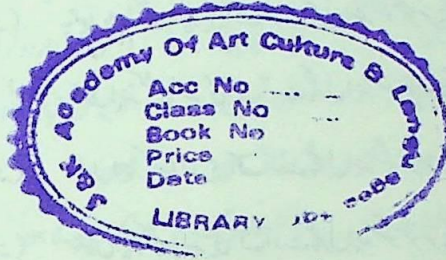
JAMM-O-KASHMIR
MAIN
URDU ADAB
(During Pre & Post Independence Period)

BY

DR. A. R. BEIGH